رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
naeyufaq.com
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ

10 دستک — مشتاق احمد قریشی

11 گفتگو — عمران احمد

16 اقرأ — طاہر قریشی

18 ٹھنڈا گوشت — احمد اقبال

68 سنہرے لوگ — محمد سلیم اختر

74 قاتل لکھاری — سلمان بشیر

84 وجود حیات — عرفان رامے

102 ہنومان — عثمان عبداللہ

108 بساط گر — وحید سلطان

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 81 نیپئر بیرکس، ہاکی کلب آف پاکستان، اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

134 نجات دھندہ — مونا شہزاد
138 ناقابل فراموش — ایم زیڈ شیخ
162 شرارت — شہزاد خان
170 فساد کی جڑ — ریاض بٹ
182 رازِ سربستہ — ثناءاللہ خان احسن
186 ذوق آگہی — عثمان عبداللہ
190 خوش بوئے سخن — نوشین اقبال نوشی
194 ناسور زدہ — ابن طالب
کترنیں — ادارہ

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی، 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
03008264242 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل: Info@naeyufaq.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کچھ شرم ہوتی ہے کچھ حیا ہوتی ہے

شیخ رشید کو حکمران وقت نے بہت سوچ سمجھ کر وزیر ریلوے لگایا ہے کیونکہ ریل کی مانند اُن کی زبان بھی پٹڑی سے اترتی رہتی ہے پایہ بھی ممکن ہے کہ بوتل میں بند شہد موسم کی شدت کے باعث کچھ زیادہ استعمال ہو گیا ہو کیونکہ سچ ایسی شخصیت کے منہ سے ہوش و حواس میں تو نکلتا نہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی ان ہی اہل سیاست میں شامل ہیں جو گیٹ نمبر چار سے نکالے گئے ہیں دراصل انسان میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ اس کی نظر اپنے بجائے اپنے سامنے والوں پر فوراً چلی جاتی ہے خود چاہے جیسی بھی گندگی میں پڑا ہوا سے سامنے کے مناظر ہی نظر آتے ہیں اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے گردن بھی جھکانا پڑتی ہے اور موٹی گردن از خود تو جھکتی نہیں جھکانا پڑتی ہے۔ عجیب بات ہے جنہوں نے شیخ پر احسان کیا اور انہیں سیاست میں لائے پھر جب جب شیخ نے مفروضہ گیٹ پر جبہ سائی کی انہیں فتح دلوادی گئی ۲۰۱۸ کا الیکشن گواہ ہے کہ انہیں کیسے فتح نصیب ہوئی اگر ان کے مدمقابل کو ان کے سامنے سے ناہٹایا جاتا تو وہ اپنے چڑیا گھر میں ہی ٹہل رہے ہوتے شاید اس کو ہی احسان فراموشی کہا جاتا ہو میاں نواز شریف کے کندھے پر سوار ہو کر وہ میدان میں اتارے گئے تھے سب سے پہلے انہیں ہی دھتا بتائی تھی اور کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی کل تک عمران خان کو ہر طرح اناڑی کھلاڑی کہتے نہیں تھکتے تھے پھر اسی اپنے تھوے کو چاٹنے پر کوئی ناحیا نا شرم اب اسی گھوڑے پر سوار ہیں جس میں کل تک عیب ہی عیب تھے گیٹ نمبر چار سے اگر تمام اہل سیاست نکلیں ہیں تو آپ بھی اسی بھیڑ میں شامل ہیں آپ کو شرم آنی چاہیے تھی اپنے محسنوں کی طرف انگلی اٹھاتے شاید آپ شرم اور شرمگزاری کے جذبوں سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ اگر آپ کا فرمانا درست مان بھی لیا جائے تو پھر میاں نواز شریف کا کہا خلائی مخلوق کی کارستانی کیا غلط تھی افواج پاکستان کو اس دیدہ دلیری سے ملکی سیاست میں ملوث کرنے کی الزام تراشی کرنا کس سیاسی کتاب میں لکھا ہے۔ کچھ چیزیں پردہ میں رہیں تو بہتر ہے۔ کسی فلمی نغمہ نگار نے درست ہی لکھا تھا "پردے میں رہنے دو، پردہ نہ اٹھاؤ پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا" کپتان کے واقف کاران کا کہنا ہے کہ ان کا بچپن لال کوٹھے پر گزرا ہے اس لیے ان کی زبان ان کی تعلیم و تربیت انہی کی طرح ہوئی ہے اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے وہ عادت سے مجبور ہیں۔ اگر کہیں گیٹ نمبر چار سے انہیں ان کے دیے بیان کے وضاحت کے لیے طلب کر لیا گیا تو وہ وہیں لیٹ جائیں گے پھر ان کی زبان کی لن ترانیاں بھی سننے والی ہوگی۔ کہنے والے یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ شیخ صاحب کا حال اس گھوڑے کا ہے جو دوڑ میں تو شامل ہوتا ہے لیکن ہمیشہ پیچھے رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہی سب سے آگے دوڑ رہا ہے۔ افواج پاکستان ایک قومی ادارہ ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کی سرحدوں کی ہر طرح حفاظت کرے چاہے وہ ملکی سرحد ہو یا نظریاتی سرحد ہو اہل سیاست بھی ملکی سرحدوں کی مانند ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں سیاسی یا ذاتی اختلاف کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دشمن جاں ٹھہرا دیے جائیں۔ کم از کم آپ کو یہ تو سمجھنا سوچنا چاہیے کہ موجودہ سیاسی سیٹ اپ میں خود آپ کی حیثیت اور اہمیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ آپ کا موجودہ سیاست کا حصہ بنانے اور مقتدر جماعت میں وزارت حاصل کرنا کیا آپ کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے عمران خان جسے آپ الیکشن سے پہلے تک ناکام، نااہل، سیاست سے ناواقف کہتے رہتے تھے پھر جب دھرنا شروع ہوا تو آپ نے ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر خود کو گیٹ نمبر چار کے حوالے سے عمران خان کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا اب بھی ان کے ہر یوٹرن پر ان کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں۔ شاید آپ کے اعمال کی وجہ سے اللہ نے بھی آپ کے لیے ایسی سزا تجویز کر دی ہے جس کا آپ کو احساس تک نہیں آپ کے بعد آپ کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ کچھ ہی دن جاتے ہیں آپ کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ملے گا آپ خود کو گیٹ نمبر چار سے منسلک کرنے کے باوجود وہاں سے بے نیل و مرام لوٹا دیے جائیں گے آپ ان کی نمائندگی کے قابل بھی نہیں رہے آپ کو آپ کی چرب زبانی لے ڈوبے گی اس بار آپ نا گھر کے رہیں گے نا ہی گھاٹ کے۔ شرم حیا تو وہیں چار نمبر پر چھوڑ آئے ہیں۔ کیا آپ نے افواج پاکستان کی طرف انگلی اٹھا کر کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے یہ کوئی پوشیدہ راز تو نہیں تھا جسے آپ نے افشاں کیا ہے اس سے تو سب ہی واقف ہیں اس کے باوجود قوم افواج پاکستان کی عزت و احترام جی جان سے کرتی ہے آپ کا افواج پاک کی طرف انگلی اٹھانے کا مقصد ملکی سیاست میں افراتفری اور حزب اختلاف کے اختلافات کو ہوا دے کر گیٹ نمبر چار سے منسوب کرنے کا مطلب آخیر کیا ہے ملک میں سارا سیاسی اختلاف کا گیٹ نمبر چار سے نکلنے والے ہی ذمہ دار ہیں آخیر آپ کس کی نمائندگی کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں کیا آپ کو بھی نیب کے چیف کی طرح ہوا کا رخ تبدیل ہوتا نظر آ رہا ہے جو آپ نے کروٹ بدلنا شروع کر دی ہے۔ محسنوں سے شکوہ یا شکایت نہیں ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے عوام اب اتنی بھولی یا نادان نہیں رہی کہ اس کی آنکھوں میں یوں دن دھاڑے دھول جھونکی جا سکے۔ عوام کے صبر و تحمل کو غلط نا سمجھا جائے نا ہی افواج پاکستان کو کسی بھی طرح مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ کچھ شرم ہوتی ہے کچھ حیا ہوتی ہے۔

گفتگو

عمران احمد

وہ ہی ہوگا جو منظور خدا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی پسند کی چیز کو کوشش سے حاصل اور اللہ تعالی سے مدد چاہ اور ہمت مت ہار اور اگر تجھ پر کوئی واقعہ پڑھ جائے تو یوں مت کہہ کہ اگر میں کرتا تو ایسا ہو جاتا۔ لیکن یوں کہہ کہ اللہ تعالی نے یہی مقدر فرمایا تھا، اور جو اس کو منظور ہوا اس نے وہی کیا۔ (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

مارچ کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔ فروری کا مہینہ ہمارے لیے بڑا ستم گر ثابت ہوا، جب ہمیں یکے بعد دیگرے دو اندوہناک جھٹکے لگے جب ہمیں اپنے ایک دیرینہ لکھاری اور قاری محمد سلیم اختر کے اچانک انتقال کی خبر ملی۔ ان اللہ وانا علیہ راجعون۔ مرحوم کو ہم نے بہت ہی صابر شاکر اور نفیس پایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل دے۔ اس ماہ ان کی آخری کہانی سنہرے لوگ شامل اشاعت ہے۔ ابھی ہم سلیم اختر کے صدمے سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ ہمارے سینئر ساتھی، لکھاری ایک طرح سے ہمارے استاد شکیل صدیقی چل بسے۔ یہ خبر اتنی اچانک تھی کہ ہم ہل کر رہ گئے۔ ہمیں ان کی جدائی کا اب تک یقین نہیں آ رہا۔ یہ شکیل صدیقی ہی تھے جنہوں نے ڈائجسٹوں میں فلمی ناول کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد دیگر مترجم نے لکھنا شروع کیا۔ میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں ان کا چہرہ میرے سامنے گھوم رہا ہے۔ ان کے متعلق لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اس لئے مزید کچھ بھی لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس مہینے بس اتنا ہی۔ اب آیئے اپنے خطوط کی طرف۔

شہزاد خان...... صادق آباد:۔ انتہائی قابل احترام جناب عمران احمد صاحب، آداب وتسلیمات! مزاج گرامی۔ فروری 2020 کا شمارہ ''سالگرہ نمبر'' حسب توقع وقت پر موصول ہو گیا، شکر گزار ہوں کہ آپ ہمیشہ مجھے پذیرائی بخشتے ہوئے میرا تبصرہ اور کہانی تازہ شمارہ میں شائع کر کے مجھ میں نئے افق کے صفحات کے لئے مزید کہانیاں لکھنے کا موقع فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس بار بھی سدا کی طرح ٹائٹل خوبصورت تھا جس پر عربی لوگوں کی فطرت کو اجاگر کر کے مصور نے معنی خیز انداز میں بہت کچھ سمجھا دیا، کہانیوں کی فہرست میں حسب روایت دستک، گفتگو، اقراء کے علاوہ بارہ عدد خوبصورت اور معیاری کہانیوں کا خوشنما گلدستہ تھا۔ اس بار چند نام نئے لکھاریوں کے نظر آئے نئے اُفق کے چاہنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ بہت خوش آئند بات ہے، میری نظر میں ہر رائٹر بہت قابل احترام ہے جس کی لکھی ہوئی ہر کہانی کی اپنی اہمیت ہے، کوئی بھی کہانی کسی پڑھنے والے کے معیار پر سو فیصد پوری نہیں اُترتی، نئے لکھنے والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ تعریف وتنقید دونوں کے لئے ہر وقت تیار رہیں، راستے کی رکاوٹیں انسان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ہمت دیتی ہیں اس لئے گھبرانا نہیں چاہئے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک میں ''کیا ہونے جا رہا ہے'' حقیقت میں ہم سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے ایک تازیانہ ہے، ملکی حالات میں بگاڑ، کشمیر کی حالت زار، افغانو کی من مانیاں، سکھوں کی مطلب پرستیاں، سابق چیف جسٹس کی ہیرا پھیریاں، غرض قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے، طاغوتی طاقتیں اس وقت مسلمانوں کے خلاف یک جان ہو گئیں ہیں اسلامی ملکوں کی سالمیت کو خطرہ ہے، اللہ پاک ہمارے ملک کے ساتھ ساتھ تمام عالم اسلام پر اپنا کرم فرمائے، آمین۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب کی ہمت کو داد دینے کو جی چاہتا ہے جو بڑی محنت اور پیار سے ہمارے محبت بھرے اور تھوڑا تھوڑا کڑوے خطوط کو بڑی خوبصورتی کیساتھ سجا کر اپنی محفل کی رونق بنا دیتے ہیں یہ ان ہی کا خاصہ ہے، مشورہ ہے کہ مہنگائی کو دیکھتے ہوئے اب رسالہ کی قیمت میں کم از کم دس روپے کا اضافہ لازمی کرنا چاہئے، خطوط میں پہلا نوازش نامہ محترم جناب محمد اکرام الحق صاحب جہلم کا تھا بہت اچھا لکھتے ہیں میں ان کے خطوط کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں، پرنس افضل شاہین صاحب کے خطوط بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، رباب فاطمہ صاحبہ اسلام آباد انہوں نے بہت کم عرصے میں بہت نام کمایا ہے اس میں ان کی رسالے سے لگن، ہمت، اور محنت کا بہت ہاتھ ہے، ان کے رسالے کے لئے بنائے گئے ٹائٹل بھی بہت منفرد اور جاذب نظر رہے ہیں، اللہ پاک انہیں بہت ساری خوشیوں سے نوازے، غلام یاسین نوناری صاحب کی رسالے سے وابستگی بے لوث ہے، ان کے خطوط میں لکھی گئی تحریر ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے، ان کا کہنا سو فیصد درست ہے کہ ایک لکھاری کو تعریف کیساتھ ساتھ تنقید کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے، ان کا حکم سر آنکھوں پر، عطیہ رانی صاحبہ کراچی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کہانی ''طلسم ہوشربا'' پسند کی، اُم ہانی پشاور کا خط بھی بہت اچھا تھا اللہ پاک انہیں خوش رکھے۔ طاہر قریشی صاحب کی ''اقراء'' میں قرآنی آیات کے تراجم ہمیشہ کی طرف نمبر ون رہے، جن میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بڑے واضح طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی اور عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، فاطمہ اعجاز صاحبہ کی ''زندگی کا امتحان'' ایک طویل کہانی تھی جس میں انسانوں کی بے حسی اور خود غرضی کو موضوع بنایا گیا اور بڑی خوبصورتی سے کہانی کے انداز میں پیش کر کے مصنفہ نے اپنی قابلیت کو آشکار کیا، اچھی کہانی تھی، کرونو وائرس کی طرح نمودار ہونے والی میری کہانی ''دجالی کیڑا'' بھی اپنی نوعیت کی عجیب کہانی لکھ دی تھی پتہ نہیں قارئین کو پسند آئے گی یا نہیں؟ مہتاب خان کی ''اندھیر نگری'' ان نوجوانوں کے لئے ایک سبق تھی جس میں لوگ جلد امیر بننے کے لئے غلط راستہ اختیار کرتے ہیں اور بعد میں نقصان اٹھاتے ہیں، غلط صحبت انسان کو ہمیشہ کے لئے برائی کی دلدل میں دھنسا دیتی ہے، حسب معمول ''آوارہ'' اپنے انجام کو پہنچی امید ہے ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب اسی طرح کی ایک اور منفرد کہانی منظر عام پر لائیں گے، فرح انیس کی ''اسیر زادی'' خوابوں کی دنیا میں غرق رہنے والی ایک دوشیزہ کی کہانی جسے ہر وقت اپنے ارد گرد اپنا محبوب نظر آتا تھا، عشق وجنون کا تانہ بانہ بنتی یہ کہانی اچھی تھی، مزید کہانیوں میں...... فسوں خیزیاں، بساط نگر، غلام روحیں، کہانی کار کا دکھ، تجدید حیات، رازِ سربستہ، بہت اچھی

کہانیاں تھیں ان سب کے مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں، ذوق آگہی کا سلسلہ اپنی پسندیدگی کی روایت برقرار رکھے ہوئے ہے سب دلچسپ اور سنجیدہ لطائف کیساتھ ساتھ کام کی باتیں اچھی تھیں، خوشبوئے سخن میں زین شکیل، احسان فارس، عثمان عبداللہ، ڈاکٹر ثروت رضوی، نیر رضوی، اسلم جاوید، راؤ تہذیب حسین، نیلم ملک، محمود کیفی کی غزلیات بہت پسند آئیں، کشف بلوچ ڈیرہ اسماعیل خان، زارا شیخ لاہور، دُرِ شہوار لاہور، نمود سحر قصور، ثناء شہزاد کراچی، من تشاء فیصل آباد، اُم ہانی پشاور، زل نور لاہور، ایمان فاطمہ بہاولپور، حسن آراء مظفر گڑھ کے انتخابات لاجواب تھے، سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق بڑی محنت اور پرخلوص محبت سے نئے اُفق کو سجاتے ہیں، ہمیشہ کی طرح آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ادارے کی تمام انتظامیہ اور دیگر سٹاف کو صحت وتندرستی کی دولت سے نوازے اور ادارہ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے، آمین ثم آمین۔ اگلے ماہ کے لئے اجازت دیجئے، اللہ نگہبان

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر:۔ اس بار نئے افق فروری کا شمارہ 22 تاریخ کو ملا پچیس تاریخ کو تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ سرورق دیکھ کر شعر کہنے کو دل چاہا۔

ہم آ کے تیرے شہر سے واپس نہ جائیں گے
یہ فیصلہ کیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

نئے افق اعزازی شمارہ بھیجنے کا بے حد شکریہ۔ دستک میں انکل جی درست فرما رہے ہیں کہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان نے پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی تھی کہ جس پر نا صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ممالک سے بھی ایک خطیر رقم ڈیم فنڈز کے نام پر جمع کر لی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ ہر طرف خاموشی چھا گئی اربوں کا ڈیم فنڈ کہاں گیا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ واقعی ان اربوں روپوں کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا ہے کہ کیا بات ہے اہل قادیان کی کہ ان کا ایک معمولی رکن بھی صدر امریکا سے براہ راست بات ہی نہیں کر سکتا بلکہ وہ صدر امریکا سے ان کے دفتر میں ملاقات بھی کر سکتا ہے جبکہ حکومت پاکستان کے وزیر سفیر اور وزیر اعظم تک کو ملاقات کے لیے ان کی اجازت کا منتظر رہنا پڑتا ہے۔ اللہ کرے کہ حکومت وقت قادیان کی بجائے مسلمانوں کے حقوق پورے کرے، آمین۔ گفتگو میں پہنچے تو آپ فرما رہے تھے کہ خوفناک کہانی نمبر کے لیے اتنی زیادہ کہانیاں موصول ہوئیں کہ ایک نمبر اور نکالنا پڑے گا۔ اس بار دو قسط وار کہانیاں اپنے اختتام کو پہنچیں۔ دونوں کا ہی اختتام بہترین انداز میں ہوا۔ اب تو ہمیں بساط گر کا شدت سے انتظار ہے۔ اس بار فرح انیس کی ''اسیرزادی'' اور شہباز اکبر الفت کی ''کہانی کار کا دکھ'' زبردست رہیں۔ ''بساط گر'' کی پہلی قسط نے ہی اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ پہلا خط محمد اکرام الحق کا تھا لگتا ہے حکمت کا کورس کیا ہوا ہے۔ میرا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ اگلا خط ناچیز کا تھا۔ پھر شہزاد خان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ میرا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ آگے بڑھے تو رباب فاطمہ کا خط تھا۔ میڈم آپ کے پہلے خط کے بارے میں تبصرہ نگاروں کے خطوط آپ نے پڑھ لیے ہوں گے۔ آپ کا یہ تبصرہ بھی شاندار ہے میرا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ غلام یاسین نوناری اور عطیہ رانی میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ نوناری صاحب آپ نے بھی حکمت کا کورس کیا ہوا ہے کیا۔ ام ہانی آپ کا پہلا خط ہے کسی بھی رسالے میں تو ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ راز سربستہ میں رستم زمان گاما پہلوان کے بارے میں پڑھا یہ پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ کلثوم نواز مرحومہ گاما پہلوان کی نواسی تھیں۔

محمد اکرام الحق...... ضلع جہلم:۔ نئے افق کا شمارہ فروری 24 جنوری کو موصول ہوا۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ سالگرہ نمبر اچھا لگا۔ سلسلہ دستک میں فاضل استاد مصنف نے بڑی ہی بھیانک صورت حال کی عکاسی کی کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ میاں یہاں ایک بار کا اور اضافہ کرتا چلوں کہ موجودہ پی ٹی آئی حکومت المعروف ''تبدیلی سرکار'' نے اقوام متحدہ میں جو نائب مندوب مقرر کیا ہے وہ بھی قادیانی ہے۔ قادیانی تو ہیں ہی کافر اور اصولی طور پر ہمیں کافروں کی اس جماعت قادیانی کو پاکستان سے ہی نکال باہر کرنا چاہیے اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ قادیانی کفار جہاں کہیں بھی سرکاری کلیدی عہدوں پر ہیں انہیں ملازمت سے برخاست کیا جائے اور آئندہ قادیانیوں کی سرکاری ملازمت پر پارلیمنٹ کے متفقہ ایکٹ کے تحت پابندی عائد کی جائے۔ میری معزز مصنفین سے اور مدیران سے گزارش ہے کہ کتاب ''قادیانیت ایک فتنہ'' جو کہ بک کارنر شوروم جہلم نے شائع کی ہے اسے قسط وار ماہنامہ نئے افق میں شائع کریں تاکہ ہمارے عوام اور ہماری نسل نو اور ہمارے بے حس اور دینی غیرت سے محروم حکمرانوں کو بھی عقل آئے۔ سلسلہ خطوط میں سب سے پہلے مجھ ناچیز کا خط تھا۔ اس کے بعد پرنس محمد افضل شاہین کا خط تھا۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اس سے آگے شہزاد خان کا محبت نامہ موجود تھا آپ نے بھی میرے تبصرے کو سراہا جس کے لیے شکریہ۔ موصوف نے بھی پرچے پر موثر تبصرہ لکھ کر دل موہ لیا۔ اس کے بعد رباب فاطمہ کا خط تھا آپ نے بھی ماہنامے پر ایک جامع تبصرہ فرمایا۔ اس کے آگے غلام یاسین نوناری صاحب کا پرخلوص اور محبت بھرے انداز تحریر میں کیا گیا محبت نامہ موجود تھا۔ آپ نے بجا فرمایا کہ مثبت تنقید بھی لکھاریوں کے ذوق کو دوام بخشتی ہے۔ عطیہ رانی اور ام ہانی کے خطوط بھی بہترین تھے۔ لفظ النصیر جو کہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے طاہر بھائی نے اس کی فقیہہ المثال تشریح بیان کی۔ آپ جیسا انداز تحریر شاید ہی پاکستان کے کسی ادیب کا ہو۔ ثناء اللہ خان کا مضمون راز سربستہ بھی خوب تھا۔ باقی تمام مصنفین کی تحریریں بھی قابل تحسین تھیں۔ میں ایک بار پھر گزارش کروں گا کہ نئے افق کا قائداعظم نمبر نکالیں یہ وقت کی ضرورت ہے۔ اگر خوفناک کہانیوں کے دو نمبر نکل سکتے ہیں تو پھر قائد کے نمبر نکالنے پر اتنی دقت کیوں دکھائی جا رہی ہے۔ ہم اگر ساری زندگی قائداعظم کے مزار کی پلکوں سے صفائی کرتے رہیں تب بھی ہم ان کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ میری تمام مصنفین سے التجا ہے کہ قائداعظم کے متعلق بھی کچھ قوم کو بتائیں ہم سمیت ہماری قوم سو رہی ہے اسے جگانے کے لیے پھر سے ایک علامہ محمد اقبال کی ضرورت ہے۔ سلسلہ ذوق آگہی میں بھی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں اور سلسلہ خوشبوئے سخن میں بھی اچھا کلام پڑھنے کو ملا۔ آخر میں ایک نسخہ ان بہن بھائیوں کے لیے جنہیں امراض معدہ نے تنگ کر رکھا ہے۔ (سونف، کالا زیرہ، گلاب کی خشک پتیاں، گل انار، سنا مکی ۵۰، ۵۰ گرام لے کر سفوف بنالیں اور صبح شام کھانے کے آدھ گھنٹے بعد ہمراہ پانی تین ماہ تک مسلسل استعمال کریں آپ کو بہتری محسوس ہوگی۔ آخر میں علامہ محمد اقبالؒ کا شعر۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
کس کہکشاں کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

عبداللہ توفیق...... حیدر آباد:۔ سلام امید ہے کہ اپنے کارہائے زندگی میں مطمئن اور خوش باش ہوں گے۔ نئے سال کا بہترین تحفہ اور نئے افق کی 43 ویں سالگرہ کے سپاس نامے پر بے حد مبارکباد۔ اس کے شایان شان ہی چمکتا دمکتا سرورق تھا۔ ویسے کیا خیال ہے ہم و آپ 2020 میں داخل ہو چلے ہیں دیکھیں نا بہترین اور ذو معنی سرورق سے کیا کچھ طشت از بام ہوتا ہے۔ لارڈ کی آزادگی کے ساتھ اس کی پر اسکیوٹر کے پرجوش نعرے بڑے فرق کی بات نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے آپ قائداعظم نمبر کا اعلان کر دیں تو نئے افق سے محبت وعقیدت رکھنے والوں سے یہ رائے عامہ میسر آجائے گی کہ وقت خاصا بدل گیا ہے ہمارا ملک ترقی پذیر اشتراک سے خود کفیل قوموں کی صفوں میں پہنچ گیا ہے۔ بہرحال سرورق کی دوشیزہ چوہدری صاحب کی جذباتی ترنگوں کی مسحور کن عکاسی کر رہی ہے۔ اس بار تمہید کی طوالت سے بار دگر کا گمان ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی ارادتوں میں سرخرو کرے اور احباب سے خاطر تعلق کو استقامت بخشے، آمین۔ آپ نے مزید نمبروں کی

اشاعت پر اعتدال کی اہمیت کو مذکور کیا مارکیٹ کی کساد بازاری اونٹ کی بے مہار چلت جیسی ہوتی ہے۔ نئے افق بلاشبہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے اس کی قیمت بڑھانے میں کیا تامل برت رہے ہیں۔ جناب یہ تو ہم مددگار لکھاریوں کے لیے نوشتہ ہوا کہ ڈائجسٹ بند ہونے سے ہماری امیدوں پر جھاڑو پھر جاتی ہے۔ کیا کہنے ہیں نئے افق کے دو ناول ختم ہو رہے ہیں تو ان کی وجہ دو ناول شروع بھی ہو رہے ہیں۔ آپ کا اصرار پڑھ کر منہ میں خاک ڈالی بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ دیرینہ تعلق اگر خلوص و دیانت پر قائم ہو تو کفر و الحاد کی یورش بھی اسے متزلزل نہیں کر سکتی برادر دل ناسور زدہ چند ٹکڑے پڑھے ہیں تو متحیر سوچوں میں غلطاں پریچاں رہ گیا ہوں اب تھوڑا انز دیک ہوتا ہوں عزیز من اک یاد آوری ہے پچھلی دفعہ خط تاخیر کی وجہ سے رہ گیا تو دشمن ہنجار نے بکل دی کہ وہ میر ابات دھرانے کی محبت باقی نہ ہو تو ساری وابستگی اکارت گئی۔ میں نے اپنے ناولٹ عورت کی پوچھ کچھ کے بارے میں درخواست کی تھی پوسٹل رسید بھی بھجوائی تھی تاہم جواب کے بغیر ہی استفسار شائع کیا گیا اس بابت کوئی قیامت گزر گئی ہے تو بتا دیں پلیز عمران بھائی ادھر نئے افق نے دل جلانے کے کیسے تیور اختیار کر رکھے ہیں۔ دیکھیں نا ’’تجدید حیات‘‘ آخری تین اقساط نے کیسی دھاک بٹھائی ہے فروری کے شمارے میں بعض کہانیاں انگشت بدنداں کے مصداق رہیں جن میں فسوں خیزیاں (گل ارباب) میں فرہاد اور خانہ بدوش رانو کیت کے جذب پر نظر پر مبنی تحریر تھی جس میں گم گشتہ دنیا کے طاغوت کا احاطہ کمال خوبی سے کیا گیا۔ ایک اور کہانی اندھیر نگری مشتبہ تانے بانے کی حامل یاد ماضی کے عذاب کو جھاڑ پھونک سے زائل کرتی عمدہ کہانی تھی۔ یوں اچھا لکھنے کی ہوک نہ اٹھے تو کیونکر گفتگو میں جہلم کے اکرام الحق کا تبصرہ سرفہرست ہے، خوش آمدید کہہ کر مری آمد کو گوارا کیا شکریہ بھائی۔ پرنس افضل شاہین مختصر تبصرہ حیران کر گیا۔ خیر آپ کا محاورہ برمحل و برجستہ لگا۔ شہزاد خان تم نے مرے خط کو درخور اعتنا نہ سمجھا کوئی بات نہیں مگر تمہارے اسم گرامی کا پورے نئے افق میں متواتر چرچا بڑی بات ہے۔ غلام یاسین نوناری، عطیہ رانی، اور ام ہانی کا بھی شکریہ اب اجازت دیں اللہ حافظ۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی:۔ محترم مدیران و ایڈیٹر سلامت تا قیامت السلام علیکم، دو خوفناک نمبرز یکدم لیے اور پڑھے۔ دوسرے نمبر میں بھی مشتاق قریشی کا عمران سیریز کا ناول ڈھونڈتا رہا، مگر صفحوں کی کمی کی وجہ سے نہ دیا جا سکا۔ خیر یہ دو عدد نمبر ہی عظیم ترین تھے اور قارئین کی خواہش پوری کر دی تھی۔ آپ لوگوں کی کاوش انتہائی چشم کشا تھی، ہر صفحہ قابل ستائش تھا۔ کمال کی بات تھی کہ یک صفحی کہانی اور طویل داستانیں معیار کے حساب سے ایک برابر تھیں، سو چھوٹی سے چھوٹی کہانی بھی ان ہی کے ہم پلہ تھی۔ یہ ایک یقیناً انہونی چیز تھی جو کہانی میں پڑھتا تھا وہی عش عش کرنے کے لائق تھی۔ مثلاً اسیر خواب، روح کا خوف، پر اسرار ہیولہ وغیرہ اسی طرح طویل کہانی حقیر محبت، قاتل محبت، راز سربستہ وغیرہ اس طرح انوکھی کہانی ڈیپ فریزر اور ناگ حویلی اور تجدید حیات جیسی کہانی واقعی چشم کشا ثابت ہوئی۔ جس طرح آپ نے عمران صاحب ایک سے دو تک کہانی نمبر آگے کیے اسی طرح آپ کی فطرت میں کہانیوں کو آگے لے جانے کا حوصلہ تھا۔ پھر آپ کا ایڈیٹوریل بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ کی فطرت میں یہ انوکھی بات ہے کہ نہیں۔ ہر کہانی کو لامحالہ ہی ٹھیک ہونا ہے اور پھر شائع ہونا ہے اور کسی کی محنت، کاوش، خون پسینہ ضائع نہ کرایا جائے۔ ہم قارئین کو یہ بہت بڑی بات کو جاننا چاہیے یہ بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ ورنہ منہ ٹیڑھا کر کے لوگ نکل جاتے ہیں۔ عمران صاحب کی یہ صفت ہمارے میگزین کو اور لکھاریوں کو ایک عجیب و غریب قسم کا حوصلہ اور بلند مقام عطا کرے گا۔ ان چیزوں کے لیے میں تو مشتاق احمد قریشی صاحب کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انوکھی عادت اور عمدہ ترین کام کرنے کی عادتوں کے حامل عمران احمد کو ہمارا ایڈیٹر چنا گیا۔ ان شاء اللہ یہ میگزین کو آسمان کی بلندیوں پر لے جائے گا آمین۔ ہر انسان جس نے کہانی محنت، عرق ریزی اور زبردست جدوجہد کے بعد صفحہ قرطاس پر بکھیری ہے تو امید کا دامن ہرگز نہ چھوڑیں بلکہ تجربہ کی اس محنت کا صلہ پورا پورا ملے گا آمین ثم آمین۔ ان ہی چیزوں کو یاد کر کے تمام چیزیں صفحہ قرطاس پر بکھری ہیں اور امید ہے کہ ایک ایک انمول کہانی پسند آئے گی۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب اگلے ماہ آپ کی انمول کہانی ضرور ہمارے لیے آئے گی۔ ناغہ کر کے جھٹکا کر دیا۔ آپ کے جاندار اور چشم کشا جنگ میں کالم اکثر پڑھتا ہوں بڑی اچھی طرح کور کیا ہوتا ہے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن دونوں کا بہترین معیار آپ لے آتے ہیں۔ دونوں رونق ہیں رسالہ کی۔ پرانے اور اس سے بھی پرانے قارئین کہاں گئے۔ چمن آباد کے قاری آئیں اور اچھے تبصرہ لکھنے والے بھی تشریف لائیں خوش آمدید، ہمارا رسالہ دن بدن نیا طویل اور بہترین لکھائی میں ہو رہا ہے۔ عمران صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ یہ چیزیں لکھاری کو حوصلہ دیتی ہیں۔ میں عمر کے لحاظ میں ذرا کم کم لکھتا ہوں بلکہ آپ سب کو اتنے حوصلے اور بہترین طریقے سے لکھتے دیکھتا ہوں تو خود بھی پرانے ساتھیوں کو حوصلہ دیتا ہوں۔ پرانے لکھنے اور پڑھنے والے مجھے جانتے ہیں کہ یہ شخص 30,40 سال سے بھی پہلے آتا تھا اور اب بھی خاصا بوڑھا ہو کر آ رہا ہے۔ دعاؤں کا طالب۔

فرزانہ کنول...... کھور، پنجاب:۔ مجھے پہلی بار نئے افق پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا میں اس قبل بھی میں بڑے شوق سے اسے پڑھتی رہی ہوں مگر کچھ سالوں تک اس میں بڑی عجیب و غریب کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر جب سے عمران سر اس کے مدیر بنے ہیں تب سے شاید اس میں کافی بہتری آ رہی ہے اس کا اندازہ دروری کا شمارہ پڑھ کر ہوا۔ اس بار ایک دوست کے توسط سے اسے دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا تو خوش گوار حیرت ہوئی اسی وجہ سے خط لکھا۔ ہر سلسلہ ہی لاجواب ہے۔ ’’اقرا‘‘ میں آیت پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ اور ’’گفتگو‘‘ والے صفحے پر تبصرہ بعد میں۔ ’’دستک‘‘ تحریر مشتاق احمد قریشی کشمیر کے بارے میں لکھی گئی تحریر اور لفظ لفظ سچ، اللہ پاک کشمیر کو آزادی کی نعمت سے نواز دے آمین ثم آمین۔ ’’زندگی کا امتحان‘‘ فاطمہ اعجاز نے اپنے قلم سے جادو جگا دیا۔ زندگی امتحان کا نام ہے۔ لیکن یہاں ہر کسی کا پرچہ دوسرے سے مختلف ہے۔ ’’دجالی کیڑا‘‘ تحریر شہزاد خان اس تحریر نے آخر تک قاری کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھا۔ تجسس سے بھرپور، اور الگ سے داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ’’اندھیر نگری‘‘ تحریر مہتاب خان، مہتاب میری ایک پیاری سی دوست کا نام ہے۔ نام پر نظر پڑتے ہی ایک عکس ابھرا۔ پھر تحریر پڑھی وہ کہتے ہیں نا فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن بس یہاں بھی یہی ہوا وہ پہلا تاثر آخر تک برقرار رہا، اور آخر میں دل سے آواز آئی۔ کمااااال کی تحریر تھی۔ فرح انیس تحریر ’’اسیر زادی‘‘ میری فرینڈ لسٹ میں ایڈ ہیں۔ لیکن کبھی بات نہیں ہوئی۔ آپ کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت زبردست لکھا۔ تجسس پر ملکہ حاصل ہو جیسے۔ ’’فسوں خیز‘‘ تحریر گل ارباب فسوں خیز تحریر میں آخر تک تجسس کے ساتھ ساتھ فسوں نے بھی باندھے رکھا۔ گل ارباب تو ہمیشہ نمبر ون پر رہی ہیں۔ ’’غلام روحیں‘‘ تحریر مونا شہزادان کو پڑھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ جب آپ کو آپ کی مرضی کا مواد پڑھنے کو مل جائے تو خوشی تو ہوگی۔ آپ کے قلم میں روانی ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھی جانے والی کہانی۔ ’’کہانی کار کا دکھ‘‘ شہباز اکبر الفت اتنی عمدہ کہانی کے الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ ایک تجسس سے بھرپور تحریر۔ چائے پاس رکھی ٹھنڈی ہو گئی مجال ہے جو ڈائجسٹ سے نظر اٹھی ہو۔ پڑھنے والے تو کہہ دیتے ہے کہ مصنف نے اس کردار کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ لیکن مصنف ہی جانتا ہے کہ اس پر کیا بیتی ہے۔ تخلیق کار کے دکھ کو کوئی نہیں سمجھتا۔ ایک اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ’’آوارہ‘‘ تحریر ذوالفقار ارشد گیلانی ایک عمدہ تحریر۔ بلاشبہ آپ پڑھتے ہوئے قاری کو اپنے ماحول میں لے جانے کے فن سے واقف ہے۔ ’’بساط گر‘‘ تحریر وحید سلطان ایک اور تجسس سے بھرپور کہانی۔ بساط میں مہرے ہوتے ہیں۔ اچھوتا سا نام پڑھ کر اچھا لگا۔ یوں لگا جیسے ہم بھی زندگی میں مہرے ہی ہیں۔ ’’تجدید حیات‘‘ صائمہ قریشی نام سے ظاہر ہے کہ زندگی میں کچھ نیا کرنا۔ بلاشبہ آپ نے بھی کہانی لکھ کر زندگی میں کچھ نیا ہی کیا۔ اگر ہم دوسرے لوگوں سے موازنہ نہ کریں تو ہر پل ہم زندگی میں نیا کام کرتے ہیں۔ اختتام تک ڈائجسٹ کے ساتھ چپکی رہی۔ بہت عمدہ سب کی محنت کو داد سرورق میں نہایت خوبصورت، اور گفتگو میں عمران سر نے سلجھے ہوئے انداز میں ڈائجسٹ کے بارے میں بتایا۔ جب سے سر عمران نے اس کی ادارت دوبارہ سنبھالی ہے نئے افق میں کافی بہتری آتی جا رہی ہے۔ اللہ انہیں ان کے تمام مقاصد میں کامیاب کرے۔ بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ پہلی بار پڑھا امید ہے آخری بار تک پہلا تاثر

برقرار رہے گا۔

تسلیم شیخ...... ساہیوال، پنجاب :۔ السلام علیکم عمران سر۔ ماشاء اللہ سے نئے اُفق بہت اچھا جا رہا ہے۔ بلکہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ماشاء اللہ۔ فروری 2020 سالگرہ نمبر تھا۔ چوالیس کا ہو گیا ہے نئے اُفق۔ بہت خوب یہ تو۔ گزرتے دنوں کے ساتھ نئے اُفق کا سرورق اور کام بہت اچھا جا رہا۔ اللہ تعالیٰ آگے بھی نئے اُفق کو خوب ترقی دے۔ آمین ثم آمین۔ اب آئی ہوں ڈائجسٹ کی طرف۔ ''دستک'' میں سر مشتاق احمد قریشی نے کشمیر کے حوالے سے جو لکھا۔ اُس سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہمارا کشمیر نا جانے کب تک یہ ظلم و زیادتی برداشت کرتا رہے گا۔ ہمارے سیاست دانوں کے آپس کے جھگڑے ہی ختم نہیں ہوتے۔ اِنہوں نے کب کشمیر کا مسئلہ حل کرنا ہے۔ بس ہم سب کشمیری بہن بھائیوں کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ ''گفتگو'' میں عمران سر آپ نے بہت اچھے انداز میں اداریے میں اپنی باتیں کی، اور سبھی کے خط اعلیٰ تھے۔ ''اقرا'' میں طاہر قریشی سر کی آیت ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ قرآن جہاں بیان ہو۔ وہ بات لاجواب کیوں نا ہو۔ اب آگے کہانیوں کا سلسلہ۔ ''زندگی کا امتحان'' میں فاطمہ اعجاز نے بہت اچھا لکھا۔ زندگی ایک امتحان ہی کا تو نام ہے، اور کامیاب کیسے ہونا۔ یہ ہم پر منحصر ہے۔ شہزاد خان کی تحریر ''دجالی کیڑا'' ہمیشہ کی طرح عمدہ۔ شہزاد خان تو نئے اُفق کا حصہ ہیں، اور مجھے لگتا ہے کہ نئے اُفق میں یہ نا ہوں۔ تو نئے اُفق ادھورا لگے۔ ''اندھیر نگری'' میں مہتاب خان نے جو پہلو بیان کیا۔ قابل دید۔ یہی کچھ آج کل معاشرے میں ہو رہا۔ ''فرح انیس'' کی تحریر اسیر زادی لاجواب تھی۔ فرح ''فسوں خیز'' گل ارباب کی تحریر عمدہ لگی۔ ''غلام روحیں'' مونا آپا کی تحریر بہت اچھی۔ بہت اچھا لکھتی ہیں آپا آپ۔ ''کہانی کار کا دکھ'' میں ہارر کہانیوں کی ملکہ ہے۔ حقیقی کہانی جب بندہ ڈھونڈنے نکلتا ہے۔ تو ہر طرف ادھوری کہانیاں، ہر بندے کی درد بھری کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ ہر کوئی دکھوں کا مارا۔ شہباز اکبر الفت نے کمال ہی کر دیا۔ کیا کہنے بھائی۔ سلسلہ وار کہانی کا اختتام ''آوارہ'' بہت اچھی رہی۔ داد ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب کو۔ ''بساط گر'' وحید سلطان کی بہت اچھی تحریر تھی۔ ''تجدید حیات'' پیاری سی صائمہ قریشی کی تحریر اپنے اختتام پر رہی۔ اور بہترین رہی۔ تجسس آخر تک برقرار رہا۔ ''رازِ سربستہ'' ثناء اللہ خان کی تحریر اچھی رہی۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن کا سلسلہ میں ہر انتخاب لاجواب۔ سب کی محنت پر داد۔ اب اجازت چاہتی۔

ابنِ طالب :۔ السلام علیکم۔ میں نئے اُفق کا نیا قاری اور لکھاری ہوں۔ پہلی بار نئے اُفق کا نام سنا تو بہت ہی پرکشش محسوس ہوا، جیسے کہتے ہیں کہ نام ہی کافی ہے۔ نئے اُفق کے نام کے ساتھ ساتھ اس میں لپٹی ہر تحریر کو ایسا ہی پایا۔ مشاق لکھاریوں کے ساتھ ساتھ میرے جیسے نئے لکھاریوں کو برابر موقع دینے کا حوصلہ نئے اُفق کا خاصہ ہے اور یہی اسے ممتاز کرتا ہے۔ نئے اُفق کے سالگرہ نمبر پر قلم اٹھایا تو سمجھ نہیں آئی کہ سرورق کی تعریف کروں، اس کے پیچھے چھپے فن کی یا خوشبودار تحریروں کی۔ میرے سمیت تمام نئے لکھاری متجسس تو ہوں گے کہ قارئین ان کی تحریر پر کیا رائے بھیجتے ہیں، جہاں تعریف خوشی کا احساس پیدا کرے گی وہیں تنقید پرسکون نیند سے جگانے والا جمپ محسوس کریں گے اور اگر اس جمپ پر آنکھ کھلی اور مسکرا کر چوکس ہوئے تو پھر آسمان اور بھی ہیں۔ فرداً فرداً سب کا نام لینا ممکن نہیں لیکن نئے اُفق کا ہر رنگ قابلِ تعریف و ستائش ہے۔ سر عمران کا ممنون ہوں کہ مجھے اس سلسلے کا حصہ بننے کا موقع فراہم کیا یقین مانیں کہ مہنگائی کے اس دور میں نئے اُفق کی یہ خدمات بہت بڑی بات ہے اور یقیناً اس کے قارئین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نئے اُفق کو بلندیاں نصیب فرمائے اور سر عمران اور ان کی باصلاحیت ٹیم کو کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے۔ والسلام۔

رباب فاطمہ...... اسلام آباد :۔ السلام علیکم۔ فروری کا شمارہ سالگرہ نمبر بہت خوبصورت سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق بہت خوبصورت تھا بس سرورق میں ایک چیز پسند نہیں آئی۔۔ وہ میں بتا چکی ہوں سر کو۔ سب سے پہلے میرا تبصرہ پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ سب نے میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ میرا لکھا پسند کیا جائے گا۔ یہ صرف آپ سب کی محبت اور خلوص ہے جو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔۔ مجھے بہت ساری دعائیں دینے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ آپ سب کے لیے بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات۔ گفتگو میں سر عمران ماشاء اللہ ہم سب کو بہت بہترین طریقے سے لے کر چلتے ہیں۔ سر نے کہا خوفناک کہانیاں جس تعداد سے آپ کو موصول ہوئیں یہ سب سر آپ کے خلوص کی وجہ سے ہے۔ اس ماہ دو سلسلے وال ناول ختم ہو گئے۔۔ افسوس ہوا بہت سے کردار ہم سے بچھڑ گئے۔ کچھ سبق دے کر۔ اس ماہ نئے سلسلے وار تحریر کے مصنف کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ پہلا خط محمد اکرام الحق کا تھا بہت عمدہ الفاظ میں تبصرے کا حق ادا کر دیا۔ دوسرا خط پرنس افضل شاہین کا قطعہ بالکل سرورق سے مناسب رکھتا ہوا تھا۔ تبصرہ بھی جامع تھا۔ تیسرا خط شہزاد خان کا تھا بہت زبردست تبصرہ تھا۔ چوتھا خط سر غلام یاسین کا تھا ہمیشہ کی طرح عمدہ اور جامع تبصرہ تھا۔ عطیہ رانی کا خط بہت زبردست تھا۔ خوبصورت لفظوں سے سجایا ہوا خط۔ ام ہانی (خان صاحب) کا پہلا خط بہت منفرد اور زبردست تھا۔ آپ کی چھلانگ بہت مزے کی تھی۔ امید ہے آگے بھی لکھتی رہیں گی۔ ''اسیر زادی'' مصنفہ فرح انیس کو پہلی مرتبہ پڑھا تھا بہت اچھی تحریر تھی۔ الفاظ کا چناؤ بھی اچھا تھا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''دجالی کیڑا، اندھیر نگری اور غلام روحیں، بہت زبردست تحریر۔ بہت اچھا میسج دینے کی کوشش کی گئی۔ منظر نگاری بہت اچھی تھی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ زندگی کا امتحان سبق آموز تحریر پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ناسور زدہ، کہانی کار کا دکھ بہت زبردست رہیں۔ الفاظ کا چناؤ بہت عمدہ تھا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ تجدید حیات تحریر کا تبصرہ ابھی ادھار ہے ان شاء اللہ مکمل تحریر پر تبصرہ کروں گی۔ ذوقِ آگہی اور خوشبوئے سخن ہمیشہ کی طرح مہک رہے تھے۔ بہت خوبصورت باغیچہ ہے یہ جہاں لوگ اپنے اپنے انتخابات سے مہکا دیتے ہیں۔ تمام لکھاریوں، مبصرین نئے اُفق کی انتظامیہ کے لیے بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات۔

فیضان احمد فیضی...... ملتان :۔ محترم عزیزم مدیران و ایڈیٹر السلام علیکم! امید واثق ہے آپ سب خوش مزاج، خوش لباس، خوش اخلاق ہوں گے۔ اپنا پہلا تبصرہ بھیجنے کا کشٹ کر رہا ہوں، فروری 2020 کا شمارہ ''سالگرہ نمبر'' بھی حسب عادت زیب نظر ہو گیا۔ جو ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح خوبصورت رنگوں کا امتزاج تھا.. نہایت مسحور کن جو اپنے خالق کی چابکدستی کا آئینہ دار ہے۔ فہرست میں حسب روایت دستک، گفتگو، اقراء کے علاوہ کئی عمدہ کہانیوں کی طویل فہرست تھی۔ کچھ نئے لکھاری کی تحاریر بھی شمارے کا حصہ بنی جو کہ خوش آئند ہے۔ ان سے مؤدبانہ التجا ہے کہ ابتدائیہ پیشکش میں کمی ضرور ہوتی ہے مگر وقتاً فوقتاً اس میں بہتری آتی جاتی ہے۔ ہر نیا لکھا پہلے والے پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ اپنے قلم میں تقویت پیدا کرنے کیلئے لکھنے کیساتھ ساتھ مطالعہ بھی وسیع کریں۔ مثبت تبدیلیوں کیلئے وقت درکار ہوتا ہے۔ ادب میں تسلسل اور دلچسپی آپ کو ایک اچھا مقام دے سکتی ہیں۔ مشتاق احمد قریشی صاحب نے دستک میں کیا عناصر پہ بات کی جو کہ عصرِ نو کا تقاضہ ہے۔ جنھیں زیر بحث لانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس قوم کا المیہ ہے کہ وہاں چلتے ہیں جہاں راہنما چلاتا ہے۔ ہماری ذہنیت مفلوج ہو چکی ہے۔ خطوط میں پہلا سندیسہ اکرام الحق صاحب کا تھا، ہمیشہ مثبت لکھتے ہیں۔ پرنس افضل شاہین صاحب کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ رباب فاطمہ صاحبہ اسلام آباد سے ان کی شخصیت بہت معتبر ہیں۔ رسالے کے تئیں نہایت مخلصانہ طرز عمل رکھتی ہیں۔ رسالے کیلئے ان کا کردار نہایت مثبت رہا ہے۔ ان کا آرٹ بھی بہت متاثر کن ہے۔ ان کے لیے بہت سی دعائیں، سدا شاد و آباد و بامراد رہیں۔ عطیہ رانی کراچی سے ان کی سوچ نے بھی ان کی شخصیت کی عکاسی کی ہے۔ ام ہانی پشاور سے ان کا خط بھی اچھا تھا، ہمیشہ سکھی رہیں۔ فاطمہ اعجاز صاحبہ کی کہانی ''زندگی کا امتحان'' میں مادیت پرستی اور درندگی کو موضوع بنا کر صفحہ قرطاس پر رواداری سے بکھیرا جو ان کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ ''دجالی کیڑا'' کے مصنف نے بھی ہمیشہ کی طرح اپنے سحر میں جکڑا اور ایک اچھا تاثر دینے

میں کامیاب ہوئے، بہت سی دعائیں آپ کے لیے۔ مہتاب خان کی ''اندھیری نگری'' میں کئی مثبت ومنفی زاویے پنہا ہیں۔ کیسے ہم نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے اندھے سانپ بن جاتے ہیں اور نیتجتاً خود کو زخمی کر لیتے ہیں۔ ''آوارہ'' کے مصنف ذوالفقار ارشد گیلانی کیلئے بھی بہت سی داد ایک اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔ آپ کی نئی تخلیق کے منتظر رہیں گے۔ ''اسیر زادی'' کی خالق فرح انیس صاحبہ کی کہانی کا مرکزی خیال بھی اچھا تھا۔ رومانوی موضوع تھا۔ عشق کے تار چھیڑتی کئی جذبات اپنے اندر سموئے دلگداز کہانی۔ مزید برآں جس جس نے بھی قلم کشائی کی سب ہی داد کے مستحق ہیں۔ سب کیلئے نیک تمنائیں۔ باقی تمام سلسلے ذوق آگہی، خوشبوئے سخن بھی اپنا سحر قائم کیے ہوئے ہے۔ سب احباب کی کاوشوں کو میرا سلام۔ آپ سب کے ادبی مستقبل کیلئے دعا گو ہوں۔ شاد رہیں۔

اسما حجاب شاہ...... راولپنڈی:۔ السلام علیکم۔ احبابِ گرامی امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ فروری 2020 کا شمارہ سالگرہ نمبر ہاتھ میں لیا تو، آنکھوں میں توقعات کے تارے جھلملانے لگے، سرورق پر نظر پڑی، تو خوش جمال دوشیزہ سے نظریں ٹکرائیں جس کے پس منظر میں عربک فطرت نے اپنے رنگ بکھیرے تھے، مصور کو دل ہی دل میں داد دے کر فہرست کا رخ کیا، جہاں ''دستک'' کے کمال ''اقراء'' کے جمال، اور ''بارہ عدد تخلیقات'' بے مثال موجود تھے۔ ''نئے افق'' کی اونچائیوں پر نئے لکھاریوں نے بھی اپنے ذوق کے تارے ٹانکے تھے، اور آج کا نوآموز لکھاری ہی ادب کا مستقبل ہے۔ نئے لکھاریوں کو میرا مشورہ ہے کے تعریف کی گل پاشی بھی محسوس کریں مگر تنقید کے کانٹے چبھنے پر سفر روک نہ دیا کریں بلکہ انہیں نکال کے سفر جاری رکھیں گے تو یہی کانٹے منزل کا نشاں دیں گے۔ مشتاق احمد قریشی کی دستک میں پہنچ کے جو آگہی کے در وا ہوئے تو بے اختیار امت مسلمہ کی آسانی وکامرانی کی دعا کیلئے ہاتھ اٹھ گئے۔ ''گفتگو'' میں مہکتے، لہکتے، بل کھاتے اور لہراتے خطوط کی ترتیب دیکھ کے عمران احمد کی عمدہ ظرفی کو سراہے بنا رہ نہیں سکے۔ پرنس افضل شاہین، اکرام الحق، ام ہانی اور غلام یاسین کی سخنوری لاجواب ہے، عطیہ رانی کے الفاظ میں محبت واپنائیت کے دریا سمٹے نظر آتے ہیں جبکہ ہماری محبوب ہستی رباب فاطمہ کے سہل الفاظ میں بھی بلا کی رعنائی ہے ان کی حوصلہ افزائی تو مرہم کا کام کرتی ہے۔ ''اقراء'' میں طاہر قریشی کی لاجواب ترتیب نے بے اختیار ہمیں سبحان اللہ العظیم کے ورد پر لگا کے اپنا فرض پورا کر لیا۔ اور اب آتے ہیں گلستان تخلیقات میں، اندھیر نگری، دجالی کیڑا، زندگی کا امتحان، آوارہ، اسیری زادی، فسوں خیزیاں، بساط نگر، غلام روحیں، تجدید حیات، راز سربستہ اور کہانی کار کا دکھ، ان سب کہانیوں میں زندگی کے رنگ دراز ملے تو مسرت وشادمانی بھی پائی گئی حزن وملال کی تھکاوٹ بھی تھی اور عشق کے درد کی کراہیں بھی، فطری تخریب کاریاں اور فکری شعور کی بیداری بھی۔ (دل تو کر رہا فرداً فرداً تبصرہ کرتے کہانیوں پر) مگر ہائے اس وقت کا دامن جو ہمارے لیے تنگ ہی رہا۔ آگے بڑھنے پر ''ذوق آگہی'' کے طلسم نے جکڑ لیا اور یہاں کے ناچتے رنگوں کو دیکھ کے نکلے تو سحر زدہ نکلے۔ ''خوشبوئے سخن'' کے کیا کہنے کہ یہاں تو شعراء نے اپنی تخلیقاتی گلزار سے ہمارے دل ودماغ کو معطر کر دیا اور ہمارے پیاسے ذوق کو سیراب کر دیا۔ تو جناب جاتے ہوئے انتظامیہ ''نئے افق'' کے بارے میں محسوسات کو دل میں رکھنا زیادتی میں شمار ہوگا۔ ''نئے افق'' ادب کے عہد شباب میں کھلتا ہوا مہکتا ہوا گلاب ہے، اس کی تازگی کیلئے بہت ساری دعائیں، اور انتظامیہ کے نظم ونسق کو بہت سی داد وسلام، سلامتی ہو سب پر۔

عطیہ رانی...... کراچی:۔ احباب گرامی امید ہے سب بخیر ہوں گے قدرت کی انمول نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ اللہ آپ سب ہی کو ہمیشہ یوں ہی خوش باش رکھے آمین۔ ہاں تو جناب من بات کرتے ہیں نئے افق کے خوبصورت شمارے فروری 2020 کے سالگرہ نمبر کا جو اس وقت میرے ہاتھ میں موجود ہے اور افق پر ستاروں کے جیسا جگمگا رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ شاندار وضع قطع کے ساتھ سنوارا گیا ہے شمارے کو۔ نئے افق کا شمارہ موصول ہوتے ہی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے خوشی کی انتہا نہیں رہتی جب اس شمارے میں اتنی خوبصورت تخلیقات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ماشاء اللہ تمام ہی مصنف بہترین تخلیق قاری کی نذر کرتے ہیں آپ سب مصنفین کے لیے ڈھیروں دعائیں یوں ہی ادب کی دنیا میں راج کرتے رہیں آمین۔ اب چلتے ہیں افق کے شمارے کی جانب سب سے پہلے تو میں مشکور ہوں نئے افق انتظامیہ کی کہ میرے ادنی سے تبصرے کو نئے افق کی زینت بنایا اس عزت افزائی کی تہہ دل سے ممنون ہوں آپ سب کی۔ ابتدائیہ فہرست میں ہمیشہ کی طرح دستک، گفتگو، بارہ عدد خوبصورت معیاری تخلیق تھیں کہانیاں بہترین ہیں۔ اس شمارے میں کچھ نام نئے لکھاریوں کے نظر آرہے ہیں اس کا مطلب ہے نئے اُفق کے چاہنے والوں کی تعداد میں گونا گوں اضافہ ہو رہا ہے یہ خوش آئند بات ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے ہم مبصرین تنقید برائے اصلاح کر کے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ یہ ادب کا سرمایہ ہیں۔ اسی طرح نوآموز لکھاریوں سے کہنا چاہوں گی کہ تنقید کو کھلے دل سے تسلیم کرتے ہوئے ان تبصروں کو مثبت لیتے ہوئے ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آگے چلتے ہیں خطوط کی جانب۔ جو محترم عمران احمد سر نے بہترین انداز میں منفی۔ مثبت دونوں طرح کے خطوط کو خوبصورتی سے شامل اشاعت کیا ہمیشہ کی طرح یہ سلسلہ بہت پسند آیا۔ خطوط میں پہلا پیغام موصول ہوا۔ محترم محمد اکرام الحق صاحب کا بہت اچھا لکھا۔ پرنس افضل شاہین کے خطوط بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ محترمہ رباب فاطمہ پیاری بہنا جیسی دوست جو حساس طبیعت رکھتی ہیں ادب سے انکا لگاؤ قابل ستائش ہے ادب کے افق پہ سنہرے حروف میں ان کا نام جگمگاتا ہے ماشاء اللہ ہر کام کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے نبھاتی ہیں کمال کی ایڈیٹر ہیں رباب کے بنائے گئے ٹائٹل بھی بہت منفرد ہوتے ہیں اللہ رب العزت ان کے فن کو عروج بخشے خوشیاں نصیب کرے آمین۔ محترم غلام یاسین نوناری۔ ان کے خطوط میں لکھی گئی تحریر ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے میں ان کی بات سے متفق ہوں کہ ایک لکھاری کو تعریف کے ساتھ تنقید کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنا چاہئے کیونکہ یہ تنقید لکھاری کے لیے ایسی سیڑھی ہے جو آگے چل کر اسے بلندی پر پہنچائے گی۔ طاہر قریشی صاحب کی ''اقراء'' میں قرآنی آیات کے ترجمے بہت عمدہ رہے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بڑے واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ محترمہ فاطمہ اعجاز کی ''زندگی کا امتحان'' کافی طویل کہانی تھی لیکن خوبصورت پیغام دیا کہانی نے انسان کی خودغرضی بے حسی کو بیان کیا گیا۔ سر شہزاد کی کہانی ''دجالی کیڑا'' بھی اپنی نوعیت شاندار کہانی اس بار بھی بازی لے گئی ماشاء اللہ۔ محترمہ مہتاب خان کی ''اندھیر نگری'' نئی نسل کے لئے سبق آموز کہانی جس میں لوگ جلد امیر بننے کے لئے جائز ناجائز راستہ اختیار کرتے ہیں جس کا بعد میں نقصان بھی اٹھاتے ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اچھے دوست بنائیں اچھی صحبت کا اثر اچھا بری صحبت کا اثر برا ہی ہوتا ہے۔ محترم ذوالفقار ارشد گیلانی کی ''آوارہ'' اختتام کو پہنچی لیکن میں مکمل نہیں پڑھ سکی۔ محترمہ فرح انیس کی ''اسیر زادی'' خوابوں کی شہزادی جو خوابوں کی دنیا میں رہنے والی ایک حسینہ کی کہانی جس کو اپنا محبوب ہمیشہ اپنے آس پاس محسوس ہوتا تھا۔ عشق میں ڈوبی حسینہ کی کہانی دلچسپ لگی۔ تمام ہی کہانیاں بہترین تھیں۔ فسوں خیزیاں، بساط نگر، غلام روحیں، تجدید حیات، راز سربستہ کافی شاندار کہانیاں تھیں ان تمام کہانیوں کے تخلیق کاروں کو مبارکباد۔ ذوق آگہی کا سلسلہ بہت پسند آیا تمام طنز ومزاح اور سنجیدہ لطائف کیساتھ ساتھ کام کی باتیں بھی بہت عمدہ رہیں۔ خوشبوئے سخن میں زین شکیل، احسان فارس، عثمان عبداللہ، ڈاکٹر ثروت رضوی، نیر رضوی، اسلم جاوید، تہذیب حسین نیلم ملک، محمود کیفی کی شاعری نے بہت لطف دیا۔ انتخابات بھی بہترین رہے سب ہی باذوق ممبران کے ماشاء اللہ۔ خوبصورت نئے اُفق کو اللہ پاک مزید کامیاب کرے۔ تمام انتظامیہ کی کاوشوں کو میرا سلام۔ اللہ آپ سب کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

الکریم
(عزت والا)

کریم: کا مادہ کرم سے ہے اور صفت صیغہ واحد مذکر ہے۔ اس کے معنی ہیں صاحبِ کرم تکریم والا' کریم کے معنی ہیں بزرگ' بڑا عزت والا' عمدہ' احسان کرنے والا' پیہم نعمتوں سے نوازنے والا' بے حد سخی' بے حد معاف کرنے والا' ہمت والا' بخشش وعنایات کرنے والا' مہربان' بہت بامروت' بڑی ہمت وحوصلہ والا' یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ خاص ہے اس سے مراد ایسی اعلیٰ ظرفی ہے جو کسی اور کو نصیب نہ ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی جو بے حد وحساب کرم کرنے والی ہے جو بہت بخشش وعظمت والی ہے جو بہت ہی معزز' بزرگی والی ہے جو بہت عزت وتوقیر عطا کرنے والی ہے' عزت' بزرگی توقیر وعطا اور بخشش کا وہ منبع ہے یہ سب اسی سے شروع اور اسی پر ختم ہیں۔ وہی ذاتِ عالی ہے جو سب پر قدرت رکھتی ہے۔ صرف اسے ہی ہر قسم کی قدرت ہے وہ جسے چاہے معاف کردے اور جو وعدہ وہ کرے اسے پورا کرے اور جب دینے پر آئے تو تمام توقعات سے بڑھ کر عطا کرے۔ جو شخص بارگاہِ الٰہی میں التجا کرے اسے مایوس نہ لوٹائے۔

ترجمہ:۔ اے انسان! تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے بہکایا؟ (الانفطار۔٦)

ارشادِ باری تعالیٰ ہو رہا ہے اور انسان کو مخاطب کیا جارہا ہے کہ اے انسان! تجھے کس نے بہکا دیا جو کفر پر کمربستہ ہوگیا ہے۔ اے انسان ذرا غور تو کر کہ تجھے کس نے یہ حیات بخشی ہے؟ کون تیرا مربی ومنگہبان ہے؟ کون تیری پرورش کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہے؟ کون تیری ہر ہر ضرورت کو پورا کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تمہیں انسانیت بخشی ہے؟ جس کی وجہ سے تم غور وفکر کرتے ہو' بات کو سمجھتے ہو' حیوانیت سے بلند ہوتے ہو' آخر وہ کیا چیز ہے جس نے تمہیں اپنے رب کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کردیا ہے۔ اس رب کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے تجھ پر احسان کیا' تجھے وجود بخشا ہے اسباب حیات تجھے مہیا کئے ہیں' اس رب کے احکام کو ماننے میں کوتاہی وغفلت برتتے ہو' سستی کرتے ہو' اللہ جو نہایت ہی مہربان اور پروردگار ہے' اس نے قدم قدم پر اپنی رحمتوں اور فضل وکرم کی بارش برسا رکھی ہے جس کی سب سے بڑی نعمت تو یہ انسانیت ہے جو تمہیں میسر ہے۔ یہ انسانیت کا ہی حاصل ہے کہ انسان نیک وبد میں تمیز کرسکتا ہے۔

انسان اگر عجائبات عالم پر غور نہ بھی کرے' صرف اپنی ذات پر ہی اگر غور وفکر کرے اور جدید تحقیق پر تصنیف کی گئی کتب کا ہی مطالعہ کرے تو انسانی جسم کی ساخت اور اس میں موجود عجائبات سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں' حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو موجودہ خوبصورت معتدل اور متناسب جسم' شکل وصورت

پر پیدا کرنا اور اس کے تمام اعضاء کا پوری طرح اپنے اپنے کاموں کو پورا کرنا اور کرتے ہی چلے جانا ایسی حقیقت ہے جس پر انسان اپنے خالق و مالک کا جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم ہی رہے گا۔

انسانی جسم میں جو بڑے بڑے اہم نظام اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں مثلاً ہڈیوں کا نظام' عضلات کا نظام' جلد کا نظام' ہاضمے کا نظام' دورانِ خون کا نظام' سانس کا نظام' تناسل کا نظام' شریانوں کا نظام' اعصاب کا نظام' پیشاب کا نظام' قوت وذائقہ کا نظام' قوت مشاہدہ اور سمع وبصر کا نظام' یہ تمام نظام اپنی اپنی جگہ عجائبات قدرت میں شمار ہوتے ہیں کوئی آلہ ان کے متبادل طور پر ایجاد کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر انسان غور وفکر سے کام لے تو وہ اپنے ربِّ کریم کے اتنے عظیم احسانات کا اپنے خالق کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے محبت واخلاص اور پورے احترام کے ساتھ جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم ہی رہے گا۔

ترجمہ:۔ کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر گزاری کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے لئے ہی مفید ہے' ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا پروردگار بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔ (النمل۔۴۰)

آیتِ کریمہ کے ذریعے ربِّ کائنات تمام انسانیت کو اور خصوصاً اہلِ ایمان کو تنبیہ اور تاکید فرما رہا ہے اور انہیں ان کے مفاد میں سمجھا رہا ہے کہ وہ اپنے رب اپنے مالک وخالق کا شکر ادا کریں یا نہ کریں اللہ تبارک وتعالیٰ انسانوں کے کسی بھی طرح اور کسی بھی قسم کے شکر کا محتاج نہیں ہے اسے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اس کا بندہ اس کا شکر ادا کرے یا نہ کرے۔ اس کی بادشاہی اور حکمرانی میں' اس کے اقتدار وحکومت میں' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' نہ شکر گزاری سے اس کی سلطنت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی نافرمانی ناشکر گزاری اور احسان فراموشی سے یکسر کوئی کمی آتی ہے۔ وہ قادرِ مطلق تو آپ اپنے بل' اپنی قوت واقتدار کے بل پر یہ سارا نظامِ کائنات چلا رہا ہے۔ بندوں کے ماننے یا نہ ماننے سے اللہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ وہ اگر شکر ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حصول کے دروازے اپنے آپ پر کھلوا لیتا ہے اور نعمتوں' انعاماتِ الٰہی کا حصول اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور اگر ناشکری' نافرمانی کرتا ہے تو وہ خود پر ظلم کرتا ہے۔ اللہ کی عنایات وفضل وکرم سے محروم رہ جاتا ہے۔ انعاماتِ الٰہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ صفتِ کریمی ہے کہ جب اس کا کوئی بندہ شکر گزاری کرتا ہے تو وہ غنی وکریم ہستی اپنے شکر گزار واطاعت شعار بندے کو زیادہ اور زیادہ عطا کرتا چلا جاتا ہے' کیونکہ وہ غنی ہے' اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں وہ کریم ہے اس لئے وہ سخاوت کرتا ہی رہتا ہے۔

ٹھنڈا گوشت

احمد اقبال

سڈنی شیلڈن کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بھی وہ کچھ لکھتے ہیں تو صفحات پر موتی بکھر جاتے ہیں انہیں پڑھتے ہوئے قاری پر سحر طاری ہوجاتا ہے۔ پڑھنے والا ان کے تخلیق کردہ جہان کی خوب صورت وادیوں میں کھو سا جاتا ہے۔ مغرب میں وہ بیسٹ سیلر ناول نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے ہر ناول نے فروخت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں، اپنے طرز تحریر اور مضبوط پلاٹ کے باعث وہ اردو قارئین میں بھی بہت مقبول ہیں ان کے کئی ناول نئے افق کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں اس ماہ ہم ان کے شہرہ آفاق ناول The Naked Face کا ترجمہ قند مکرر کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

ایک ماہر نفسیات کی روداد، اس کا واسطہ ایسے شخص سے پڑ گیا تھا جو اپنے محبوب کا بدلہ لینا چاہتا تھا

برف باری اب بھی جاری تھی لیکن اس سے رنگ و نور کے اور خوشبو کے اس سیلاب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی جو فرط مسرت سے دمکتے چہرے اور روشن مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہجوم کی صورت میں بازاروں اور شاہراہوں پر پہنچ گیا تھا شاید اس شہر کی طرح دنیا کے ہر شہر میں جہاں بھی کرسمس کا انتظار کرنے والے تھے وہاں یہی رونق اور گہما گہمی یہی زندگی کی سنسنی خیزی اور ایسی ہی ہنگامہ آرائی تھی۔ لوگ زندگی کے ایک دن کو خوشیوں سے بھر دینے کے لیے خریداری میں مگن تھے باتیں کرتے ہنستے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹکراتے اور بچ نکلتے۔ وہ کاروں کی بے حساب دوڑتی ہوئی روشنیوں کے بے نیاز فٹ پاتھ کے ایک کنارے پر چلتا رہا اپنے ماضی پر شرمندہ اور اپنے مستقبل سے پرامید۔ ایک ایسا شخص جو گھر کا راستہ بھول گیا تھا جو صراط مستقیم سے بھٹک گیا تھا تین برس کی جدوجہد کے بعد اپنی دنیا میں لوٹ رہا تھا اس یقین کے ساتھ کہ اب وہ کبھی اپنے بیوی بچوں کو اس کرسمس پر کسی احساس محرومی کا شکار نہیں ہونے دے گا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر تین سال انتظار میں بسر کرنے والوں کو ایسا تحفہ پیش کرتا ہوں جو ان کے اب تک کے تمام رنج والم اور دکھ درد کے احساس کو مٹا دے تو مسئلہ انتخاب کا ہوگا۔ بے شک ان سب کے لیے کرسمس کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ بیوی کی تنہا سنسان اور خزاں رسیدہ محبت کی پرآشوب راتیں پھر جذبات کے ہفت رنگ اجالے سے اور تمناؤں کی سیج پر مہکنے والے پھولوں کی خوشبو سے آباد ہوجائیں گی اور ان کے بچے جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم تھے پھر دوسرے بچوں کی طرح محبت اور شفقت کے حقدار ہوجائیں گے لیکن اسے خالی ہاتھ تو گھر نہیں پہنچنا چاہیے دکانیں تحائف سے بھری پڑی تھیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے کیا خریدے اور بچوں کے لیے کیا لے۔

اچانک اس کی کمر میں درد کی ٹیس اٹھی جس نے لمحہ بھر کے لیے اسے مفلوج کردیا پھر یہ درد ریڑھ کی ہڈی میں اترنے لگا اس کے وجود پر پھیلنے لگا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی اور ناکام رہا پھر اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن چند سیکنڈ کے اس وقفے میں درد نے اس کے پورے وجود کو مفلوج کردیا تھا اور وہ فٹ پاتھ پر گر پڑا، آوازوں کا ایک بھنور سا اس کے گرد محیط تھا اور وہ خاموشی اور تاریکی کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا لہو اس کے کپڑوں کو تر کرتا ہوا فٹ پاتھ کے کناروں سے بہہ کر سڑک پر آ گیا تھا اور لہو کی سرخی پر برف کی سفیدی برس رہی تھی۔ خون جمتا جا رہا تھا اور روح کے

بعد اس کے بدن سے حرارت بھی رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی لاش تماشائیوں کے درمیان تماشا بنی پڑی تھی اور قدرت اس پر برف کی سفید چادر ڈال رہی تھی۔

.....☆❁☆.....

کیرل رابرٹ نے ان دونوں کی صورت کو دیکھا اور انہیں پہچان لیا ان کے سوٹ ایک جیسے تھے ان کے انداز و اطوار میں فرق نہیں تھا دونوں کے سپاٹ چہروں کی بے حسی یکساں تھی اور ان کی آنکھیں کسی کیمرے کے لینس یا سرچ لائٹ کی طرح دیکھتی تھیں اور شکوک سے جنم لینے والے سوالات ان آنکھوں میں یوں پڑھے جا سکتے تھے جیسے ٹی وی کے روشن اسکرین پر عبارت کیرل اپنی سابقہ زندگی میں ان سے بارہا مل چکی تھی۔ اس کا سیاہ چہرہ خوف زدہ نظر آنے لگا اتنی مدت کے بعد یہ لوگ کیوں آئے ہیں کیا انہیں معلوم نہیں کہ پرانی کیرل مر چکی ہے اور اپنے دوسرے جنم میں کیرل کوئی تھرڈ ریٹ طوائف نہیں ہے۔ بلکہ ملک کے سب سے بڑے ماہر نفسیات اور ڈاکٹر کی سیکرٹری ہے۔

''یس پلیز۔'' وہ ہمت سے کام لے کر مسکرائی۔

''ہم ڈاکٹر جان سن سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ایک نے اپنا شناختی کارڈ آگے بڑھایا کیرل صرف اس کا نام ہی پڑھ سکی۔

''آئی ایم سوری لیفٹیننٹ مائیکل۔'' کیرل نے شائستگی سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو دیکھنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔''

''مس بلیک بیوٹی۔'' دوسرے نے اپنا کارڈ نکال کر ڈیسک پر جھکتے ہوئے کہا۔

''میں سارجنٹ اینجلو ہوں اور میرا تعلق بھی قتل کی تفتیش کے شعبے سے ہے اگر ڈاکٹر موجود ہے اور تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو تو یہ سمجھ لو کہ اس سے نقصان ڈاکٹر جان سن کو ہوگا بعد میں اسے پولیس اسٹیشن آنا پڑے گا۔''

''سارجنٹ اینجلو۔'' کیرل نے سخت لہجے میں کہا۔

''میرا صحیح نام کیرل رابرٹ ہے مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ تم لوگ کون ہو۔''

''ہم بھی سمجھتے ہیں کہ مس کریل رابرٹ کہ تم کون ہو۔'' اینجلو نے حقارت سے کہا۔

''تمہارا نامہ اعمال تمہاری طرح سیاہ ہے۔''

''تم وہی ہو نا۔'' احساس ذلت اور غصے کے باعث کیرل کا چہرہ بگڑ گیا۔

''گیٹ آؤٹ۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں وہ کیرل نہیں ہوں اور تم جیسے کتوں کے بھونکنے سے نہیں ڈرتی تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟''

لیفٹیننٹ مائیکل نے صورت حال کو سنبھال لیا اور اینجلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے خاموشی رہنے کا اشارہ کیا۔

''مس کیرل ڈاکٹر جان سن نہیں ہیں تو ہم پھر آئیں گے۔'' کیرل نے سر ہلایا اور انہیں دروازہ کھول کر باہر جاتے دیکھتی رہی۔ آج بہت مدت کے بعد کسی نے اس کے منہ پر کہا تھا کہ وہ سیاہ فام ہے اور اس ماضی کا حوالہ دیا تھا جسے وہ دفن کر چکی تھی وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چار سال قبل وہ ایک لاوارث لڑکی تھی جس نے اپنے شباب کے دروازے قبل از وقت ان سب کے لیے کھول دیے تھے جو چند ڈالر دے سکتے تھے وہ ہر نشے کی عادی تھی چنانچہ پہلی بار پولیس نے عصمت فروشی کے جرم میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھی۔

''کیا عمر ہے تمہاری مس کیرل رابرٹ؟'' جج نے الزامات کی فہرست دیکھ کر کہا۔

''عمر..... عمر کیا ہوتی ہے جج صاحب جو کچھ ہے وہ زندگی کے تجربات کا نام ہے میں تو چودہ برس میں جوان ہوگئی تھی اور زندہ رہی تو چودہ برس بعد بوڑھی نظر آؤں گی۔ آخر اٹھائیس سال کی جوان عورت کو کون بوڑھا بنا دیتا ہے جناب والا اب میں سولہ سال کی ہوں مگر آپ.....'' وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

''شٹ اپ۔'' جج نے کہا اور اسے ایک مہینے کے لیے ریمانڈ ہوم بھیج دیا۔ جج رحم دل آدمی تھا اور کیرل کے حالات کی مجبوری سے متاثر ہو گیا تھا ورنہ اس توہین آمیز رویے پر کیرل کو سال بھر کے لیے جیل میں بند کر سکتا تھا۔ کیرل کی بدقسمتی کہ پولیس نے اسے دوسری بار پکڑا تو پھر اسی جج کی

Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

عدالت میں کھڑا کر دیا جج نے اسے پہچان لیا۔

''کیرل رابرٹ، تمہیں پھر یہاں دیکھ کر مجھے افسوس ہوا ہے۔''

''مجھے بھی بڑا افسوس ہوا ہے جج صاحب۔'' کیرل نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''آپ ابھی تک یہاں بیٹھے ہیں ترقی کر کے ہائیکورٹ میں نہیں پہنچے یہ دشمنوں کی سازش ہے یا آپ کی نالائقی؟'' وہ ہنسی۔

جج کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔

''پچھلی مرتبہ نابالغ اور لاوارث سمجھ کر میں نے تم پر ترس کھایا تھا اور تمہاری بدتمیزی کو نظر انداز کر کے یہ موقع دیا تھا کہ اپنی عادات اور طور طریقے بدل لو لیکن اب تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ تمہارا کوئی ضامن ہے؟'' کیرل کے جواب دینے سے پہلے کوئی شخص اٹھا۔

''مائی لارڈ اگر آپ اجازت دیں تو میں مس کیرل رابرٹ کی ذمہ داری قبول کر لوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تیسری بار کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں ہوگی۔''

کیرل کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا جج سمیت عدالت میں کسی کو بھی یقین نہیں آیا کہ اتنا نامور ڈاکٹر ایک حبشی طوائف کے بارے میں اتنے اعتماد سے بات کر رہا ہے جیسے کیرل اس کی بیٹی ہو، چند لمحے وہ شخص مکمل خاموش اور سکون سے کھڑا رہا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' جج نے حیرانی سے کہا

''آپ جانتے ہیں یہ لڑکی کون ہے، اس کا ماضی کیا ہے؟''

''نو سر۔'' جان سن نے کہا۔

''مجھے اس کے نام اور ماضی سے کوئی تعلق نہیں، مجھے صرف حالات کی سختی کا شکار ہونے والی ایک لڑکی کا مستقبل اچھا دیکھنے کی آرزو ہے اور اس کے لیے میں کوشش ضروری سمجھتا ہوں۔''

جتنی دیر وہ بولتا رہا کیرل اس پر نظریں جمائے کھڑی رہی اور ایک سوال اس کے ذہن میں مسلسل گردش کرتا رہا۔ گرجا کے متواتر بجنے والے گھنٹے کی طرح اور ٹرین کے متحرک پہیے کی طرح صدا دیتا رہا۔ کیوں..... کیوں..... یہ باعزت اور شریف صورت شہرت یافتہ، دلکش شخصیت کا مالک سفید فام نوجوان ڈاکٹر اس کے مستقبل کی بات کیوں کر رہا ہے؟ کیا دلچسپی ہے اسے ایک ایسی عورت کے مستقبل سے جس کا رنگ قابل نفرت ہے کیا یہ بھی کوئی نفسیاتی مریض ہے جنس کا کوئی منفی پہلو ہے کہ اسے کوئی سفید فام شریف زادی وہ آسودگی نہیں بخشتی جو کالے رنگ کی ایک بدنام طوائف سے ملتی ہے۔ کیرل نے ہر طرح کے جنسی مریض دیکھے تھے وہ بھی جو اس سے عورت کی طرح نہیں مرد کی طرح حظ اٹھانا چاہتے تھے۔ اسے اذیت دے کر لطف لیتے تھے اس کے بدن کو دانتوں سے کاٹ کر سگریٹ سے جلا کر خوش ہوتے تھے یا اس کے برعکس کیرل سے کہتے تھے کہ ان پر مشق ستم کرے کیرل نے مرد کو ہر روپ میں دیکھا تھا لیکن ڈاکٹر جان سن نے اسے حیران کر دیا تھا۔ جج نے کیرل سے کہا تھا کہ وہ خوش قسمت ہے کیرل واقعی خوش قسمت تھی جب وہ ڈاکٹر کے گھر پہنچی تو اس گھر کی خوب صورتی نے پرتکلف سامان آسائش نے اور ڈاکٹر جان سن کے رویے نے اسے خوشی سے پاگل کر دیا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو مبارک باد دی خوب کھاؤ پیو اور عیش کرو جانا پڑے تو جو ہاتھ لگے لے کر بھاگ جاؤ اور تقدیر زیادہ مہربان ہو تو ہمیشہ کے لیے پھانس لو شادی کر کے۔

ڈاکٹر نے راستے میں اس سے بالکل نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے وہ گناہ کی اس دلدل میں کیسے پھنسی اور اب شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی ہے یا نہیں وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ گھر پہنچ کے بھی اس نے کیرل کو نہیں بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس نے کیرل کو اطمینان سے بیٹھ جانے کے لیے کہا کیرل سے پوچھا کہ وہ کیا پیئے گی اور پھر کیرل کے لیے شراب اور اپنے لیے کافی لایا کیرل منتظر رہی کہ وہ مطلب کی بات کرے مگر وہ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا اپنے گھر کے بارے میں اپنے مریضوں کے بارے میں ان شہروں کے بارے میں جو اس نے دیکھے تھے روم میں کیا جادو ہے سوئٹزرلینڈ کے حسن میں کتنا سحر ہے جاپان کی روایات کتنی قدیم کتنی جدید اور کتنی پراسرار ہیں کیرل سوچتی رہی کہیں ڈاکٹر جان سن ان مردوں میں تو نہیں جو باتوں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن جان سن نے کافی ختم کر کے کیرل کے لیے اپنا ایک نائٹ سوٹ نکالا۔

''تم اس میں کارٹون تو لگو گی لیکن مجبوری ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''جب تک زنانہ کپڑوں کا انتظام نہ ہو جائے اسی سے کام چلاؤ میرا مطلب ہے شام تک تمہارے نئے کپڑے آجائیں گے۔ اب تم غسل کرو اور میں لنچ کا انتظام کرتا ہوں اپنا کھانا میں خود پکاتا ہوں کبھی کبھی۔''

کیرل اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔ جب وہ نہا کر نکلی تو کھانا تیار تھا۔ شاید کھانے کے بعد کچھ ہو، کیرل نے سوچا کھانے کے دوران وہ کیرل کو یقین دلاتا رہا کہ وہ چاہے تو بڑی اچھی سیکرٹری بن سکتی ہے اور ٹائپ سیکھنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں دفتر میں کوئی کام نہیں اور جو ہے کیرل دیکھ لے گی کھانے کے بعد وہ اسے دفتر میں لے گیا اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

''ابھی مریض آئیں گے۔'' اس نے ایک ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔

''میں ہر روز چار مریض دیکھتا ہوں آج کے چار مریض یہ ہیں۔'' اس نے ایک صفحے پر انگلی رکھی۔ ''جب یہ آئیں تو انہیں باری باری اندر بھیج دو۔ ٹیلی فون آئے تو پوچھ لو کیا کام ہے ضروری کام ہو تو مجھ سے بات کرا دو۔ نیا کیس ہو تو ڈائری میں دیکھ کر تاریخ دے دو فیس بتا دو اس کا نام پتا لکھ لو اس کام کے چار سو ڈالر ماہانہ ملیں گے تمہیں۔ یہ دو سو ایڈوانس ہیں۔'' اس نے دو نوٹ آگے بڑھائے۔

کیرل کے ہاتھ بے اختیار نوٹوں کی طرف بڑھ گئے۔

''لیکن تمہارا کام کل سے شروع ہوگا جب تم صحیح لباس پہن کر بیٹھو گی آج آرام کرو۔'' وہ اسے ہکا بکا چھوڑ کر اپنے آفس میں چلا گیا۔

وہ دونوں نوٹ سنبھالے واپس اندر آ گئی اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ کیونکہ ایسا سلوک اس کے ساتھ نہ کسی نے کیا تھا اور نہ وہ اس کا تصور کر سکتی تھی۔ وہ شام تک سوتی رہی۔ رات تک حسب وعدہ اس کے کپڑے آ گئے پھر ڈاکٹر جان سن اسے اپنے ساتھ کار میں لے گیا۔ انہوں نے کھانا باہر کھایا اور کیرل کو ڈاکٹر جان سن کے ذہنی توازن پر شبہ ہونے لگا وہ اسے کسی معزز عورت کی طرح ساتھ لیے پھر رہا تھا اور اپنی شہرت کے باوجود ذرا بھی شرمندہ نہ تھا کہ ایک گھٹیا درجے کی رسوائے زمانہ کالی چمڑی والی طوائف کو ساتھ لیے گھوم رہا ہے واپسی پر اس نے کیرل کو ایک کمرے میں چھوڑ دیا۔

''یہ تمہاری خواب گاہ ہے یہاں ضرورت کا سب سامان ہے لیکن کسی چیز کی کمی ہو تو بتا دینا۔''

اس نے کیرل کو بستر پر لٹا دیا اور اس پر کمبل پھیلا کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اگر تم نے مجھے غلط سمجھا ہے کیرل تو قصور تمہارا نہیں ہے حالات کا ہے اب تک تمہیں یقین آ چکا ہوگا کہ میں عورت کے قابل نہیں لیکن کیرل بہت دن ہوئے مجھے ایک ایسی عورت مل گئی تھی جو میرے خوابوں اور خیالوں کی تصویر تھی چنانچہ میں نے اس سے شادی بھی کر لی تھی شادی کے بعد ہم نے ایک سال ہنی مون کیا، اپنی اور اپنے مستقبل کے اور اپنے بچے کے مستقبل کی باتیں کرتے گزار دیا لیکن اس بچے کے جنم لینے سے قبل ہی میری بیوی ایک حادثے کا شکار ہو کے مر گئی۔ اسے کسی نے مار دیا۔'' وہ بولتا رہا اور کیرل سنتی رہی پھر کیرل بولتی رہی اور وہ سنتا رہا سگریٹ اور کافی پیتا رہا اور شراب کے جام کیرل کو دیتا رہا اور رات گزر گئی کیرل نے اسے سب بتا دیا مگر یہ چار سال پہلے کی بات تھی اب وہ ڈاکٹر جان سن کی بہترین سیکرٹری تھی سخت نیک چلن اور باہمت۔

دروازہ اب بھی کھلا تھا کیرل نے سوچا کہ اب اسے آفس بند کر دینا چاہیے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ایک شخص دروازے سے اندر آ گیا تھا اور کیرل نہ جانے کیوں خوف زدہ ہو گئی تھی شاید اس اجنبی کی صورت اس کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کی چمک میں خوفزدہ کر دینے والی کوئی بات تھی اجنبی نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کیرل کی طرف بڑھا وہ فرشتہ اجل تھا۔

.....☆❁☆.....

میز پر رکھا ہوا زرد رین کوٹ پشت پر سے لمبائی کے رخ کٹا ہوا تھا اور اس پر خون کے سرخ دھبے پھیلے ہوئے تھے۔

''آپ اسے پہچانتے ہیں؟'' لیفٹیننٹ مائیکل نے کہا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر جان سن نے کہا۔

''یہ رین کوٹ میرا ہی ہے میں نے اپنے ایک مریض

کو دیا تھا کیونکہ برف باری اچانک شروع ہوگئی تھی وہ گھر سے رین کوٹ لے کر روانہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت موسم صاف تھا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' مائیکل نے کہا۔ ''وہ آپ کے پاس دس بجے پہنچا تھا اور آپ کے کہنے کے مطابق ٹھیک پچاس منٹ آپ کے ساتھ رہا تھا ٹھیک گیارہ بجے کسی نے پیچھے سے اس پر خنجر کا وار کر کے اسے مار دیا دس منٹ میں وہ زیادہ دور نہیں پہنچا تھا بازار میں کرسمس کی خریداری کرنے والوں کا ہجوم تھا مگر کسی نے قاتل کو وار کرتے نہیں دیکھا جب وہ گرا تو بہت سے لوگوں کی نظر اس پر پڑی لیکن مقتول کسی کو کچھ نہیں بتا سکا اور اس کی لاش بہت دیر تک فٹ پاتھ پر برف میں پڑی رہی۔ وہ تین سال سے آپ کا مریض تھا اس نے یقیناً اپنی زندگی کے تمام حالات آپ کو بتائے ہوں گے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی نے اسے کیوں قتل کیا؟ ڈاکٹر سے خصوصاً ماہر نفسیات سے لوگ کچھ نہیں چھپاتے اپنی پریشانیاں الجھنیں۔''

''اس کا تو کوئی بھی دشمن نہیں تھا۔ اس کی ایک پریشانی تھی مگر اب وہ ٹھیک تھا۔'' ڈاکٹر جان سن نے بتایا۔

''وہ کیا شکایت لے کر آیا تھا۔'' مائیکل نے کہا۔

''تین سال پہلے..... اس کا مسئلہ یہ تھا کہ عورتوں سے زیادہ وہ مردوں کی طرف راغب ہوگیا تھا۔'' ڈاکٹر جان سن نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''یہ تبدیلی شادی کے دس سال بعد نمودار ہوئی تھی چنانچہ اس کی بیوی اور تین بچے بہت پریشان تھے خود اسے بھی احساس تھا کہ وہ ان پر ظلم کر رہا ہے تین سال کی محنت کے بعد میں اس کی یہ ذہنی بیماری دور کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے دوست کو چھوڑ دے گا اور کرسمس اپنی فیملی کے ساتھ منائے گا مجھے یقین ہے وہ زندہ رہتا تو اس کی زندگی عام لوگوں کی طرح ہنسی خوشی گزرتی۔''

''یہ بڑا عجیب کیس ہے عموماً ایسے لوگ شادی ہی نہیں کرتے مگر آپ کہتے ہیں اس کے تین بچے تھے اور وہ عورت سے نفرت کرنے لگا تھا۔ آپ خود بہت ہینڈسم آدمی ہیں کیا ان تین برسوں میں اس نے کبھی آپ سے کسی غیر معمولی لگاؤ کا اظہار نہیں کیا؟'' لیفٹیننٹ مائیکل نے اچانک کہا۔

ڈاکٹر جان سن کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''نہیں لیکن یہ عین ممکن تھا۔ ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ مریض ڈاکٹر کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتے ہیں خصوصاً عورتیں مگر میک نے ایسا نہیں کیا۔''

''اس کے برعکس ایک سوال۔'' مائیکل نے ڈاکٹر جان سن پر نظر جما کر کہا۔ ''آپ اس کی ایک کمزوری کو جانتے تھے کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو اور اس نے آپ کی خواہش کو پورا کرنے سے انکار کیا ہو تو آپ مشتعل ہوگئے ہوں یا آپ بدنامی کے خیال سے ڈر گئے ہوں؟''

''لیفٹیننٹ..... اس نے میرا رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ وہ غلط فہمی کے باعث مارا گیا قاتل نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔'' جان سن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں یہ بات پوچھنے ہی والا تھا کیا آپ کا ایسا کوئی دشمن ہے۔ پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس نے غلطی سے مسٹر میک کو قتل کر دیا کیونکہ وہ آپ کا رین کوٹ پہنے ہوئے تھا۔'' مائیکل نے کہا۔

ڈاکٹر جان سن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی وہ جانتا تھا کہ پولیس کے لیے قتل کا سراغ لگانا زیادہ اہم ہے۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ کتنا مقدس ہوتا ہے۔ وہ مائیکل کے شکوک کا اندازہ اس کے لہجے سے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے اور اس کی باتوں سے کر سکتا تھا اگر وہ شہر کا معزز ڈاکٹر نہ ہوتا تو مائیکل صاف کہہ دیتا کہ مسٹر جان سن اگر اس کا بھی کوئی دشمن نہیں تھا اور تمہارا بھی نہیں بنے اور اگر وہ تین سال سے جنسی بے راہ روی کا شکار مرد تم سے مکمل تنہائی میں رازداری کے ساتھ ملتا تھا تو یہ ثابت کرنے کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی کہ تم نے اس سے غیر فطری تعلقات قائم رکھے اور جب وہ تم سے اکتا گیا اور آخری بار رخصت ہوا تو بدنامی اور بلیک میلنگ کے خوف سے تم نے اس کا پیچھا کیا اور اپنے کلینک سے کچھ دور جا کے اسے مار دیا پھر تم لوٹ آئے اور کسی کو کبھی بھی معلوم نہیں ہوا کیونکہ وہ تمہارا آخری مریض تھا۔

اینجلو اور مائیکل بڑے غور سے ڈاکٹر جان سن کی صورت دیکھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر جان سن میں آپ سے پھر درخواست کروں گا کہ مقتول مریض کی کیس فائل پولیس کو دے دی جائے۔'' مائیکل نے کہا۔

''سوری لیفٹیننٹ۔اس فائل میں مرنے والے کی زندگی کے بہت سے راز محفوظ ہیں، اس نے مجھ پر اعتماد کیا تھا اور اس کی موت کے بعد میرے لیے ہر راز ایک امانت ہے جو میں کسی کے حوالے نہیں کرسکتا اور کوئی مجھے اس پر مجبور بھی نہیں کرسکتا۔'' ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ آس پاس اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے صاف ستھرے اور فیشن ایبل کپڑے پہننے والے تن کے اجلے انسانوں کے من کتنے میلے ہیں۔ان سب کے خیالات میں کتنی غلاظت ہے جرم گناہ کی اس آلودگی کو دھو کر آدمی کی روح کو دھوپ کی طرح اجلا کردینا کتنا مشکل کام ہے یہاں خطا کاروں کی نظر سب کو خطا کار دیکھتی ہے تو نظر کا کیا قصور دو گھنٹے بعد جب وہ گاڑی کو پارکنگ ایریا میں چھوڑ کے اس عمارت میں داخل ہوا جس کی تیسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا تو ڈاکٹر جان سن نے حسب معمول چوکیدار سے اس کی خیریت پوچھی چوکیدار بے حد باتونی تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں اس نے ''تھینک یو'' کہا اور نظریں چرا کے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔جان سن تھوڑا سا حیران ہوا اور لفٹ میں کھڑا ہوگیا لفٹ میں خود کو دنیا کا سب سے دکھی انسان سمجھتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ایسا کوئی مرض نہیں تھا جو اسے یا اس کے بیوی بچوں میں سے کسی کو لاحق نہ ہو چنانچہ وہ آتے جاتے جان سن کو کسی نہ کسی کاغذ کے پرزے پر کوئی دوا لکھوا دیتا تھا۔اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔وہ جانتا تھا کہ پولیس کے لیے قتل کا سراغ لگانا زیادہ اہم ہے یہ بات اہم نہیں ہے کہ ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ کتنا مقدس ہوتا ہے۔وہ مائیکل کے شکوک کا اندازہ اس کے لہجے سے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے اور اس کی باتوں سے کرسکتا تھا۔اگر وہ شہر کا معزز ڈاکٹر نہ ہوتا تو مائیکل صاف کہہ دیتا کہ مسٹر جان سن اگر اس کا بھی کوئی دشمن نہیں تھا اور تمہارا بھی نہیں ہے اگر اس کے قتل کا سبب کوئی نہیں تھا اور تمہارا بھی نہیں ہے اور اگر وہ تین سال سے جنسی بے راہ روی کا شکار مرد تم سے مکمل تنہائی اور راز داری کے ساتھ ملتا تھا تو یہ ثابت کرنے کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی کہ تم نے اس سے غیر فطری تعلقات قائم رکھے اور جب وہ تم سے اکتا گیا اور آخری بار رخصت ہوا تو بدنامی اور بلیک میلنگ کے خوف سے تم نے اس کا پیچھا کیا اور اپنے کلینک سے کچھ دور جا کے اسے مار دیا پھر تم لوٹ آئے اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوا کیونکہ وہ تمہارا آخری مریض تھا۔

آخر اچانک ساری دنیا کا رویہ کیوں بدل گیا ہے۔ جان سن نے حیرانی سے سوچا۔رویہ شاید دنیا کا نہیں بدلا میری نگاہ میں فرق آ گیا ہے اس نے لفٹ سے باہر قدم رکھا تو اپنے دروازے پر پولیس مین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا خطرے کی بو لوگوں کا بدلا ہوا رویہ اور ماحول پر مسلط ایک پر اسرار سکوت یہ بھیانک خاموشی یہ سب اس کا وہم ہے یا حقیقت ہے؟

''کیا بات ہے؟'' اس نے پولیس مین سے پوچھا جو ہاتھ پیچھے باندھے بت کی طرح کھڑا تھا۔

''تم اندر جا کر دیکھ سکتے ہو۔'' پولیس مین نے پلکیں جھپکائے بغیر اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جان سن نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے پولیس والے اس کے فلیٹ میں وارنٹ کے بغیر داخل ہونے کی جرأت بھی نہیں کرسکتے اور شاید اندر لیفٹیننٹ مائیکل ہوگا جو آفس میں بیٹھ کر کارل مارک کی فائل دیکھنا چاہتا ہوگا۔خیر نہ وہ فائل دے گا نہ دیکھنے دے گا اس نے فیصلہ کیا اور اندر داخل ہوگیا اس کے بالکل سامنے کیرل رابرٹ کی لاش پڑی تھی۔اس کا سیاہ ننگا بدن بستر پر تھا اور ٹانگیں بستر سے نیچے لٹک رہی تھی اس کے دونوں ہاتھ بستر پر پھیلے ہوئے تھے اور ان کی بند انگلیوں نے شدت کرب میں چادر کو بالیا تھا کیرل کے منہ میں اس کی آواز کو بند رکھنے کے لیے کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا اس کے سارے بدن پر زخموں کے نشان تھے۔خنجر کے زخم جو زیادہ گہرے نہیں تھے اور کھال جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی سگریٹ سے جلی ہوئی کھال کے داغ جسم کے نازک حصوں پر تھے آخر میں قاتل نے کیرل کی آنکھوں میں اس

کے حلق میں سینے پر اور دونوں ٹانگوں کے درمیان تیزاب ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر نے ایسا دہشت ناک منظر نہ زندگی میں دیکھا تھا نہ کسی فلم میں اور نہ تصور میں کمرہ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا کسی چکردار جھولے کی طرح جس میں ایک جگہ کیرل کی اندھی مسخ شدہ عریاں لاش رکھی تھی جو ہر بار اس کی نظر کے سامنے سے گزرتی تھی تو کہتی تھی کہ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو کہ وہ جو نوشتہ دیوار ہے اسے کون بدل سکتا ہے۔ پھر کبھی کسی طوائف کسی تھرڈ ریٹ سیاہ فام فاحشہ کو عزت نہ دینا اس سے شرافت کا سودا نہ کرنا کیونکہ اس کی موت پر تمہارا اختیار نہیں۔ دنیا اگر نہیں چاہے گی اور تقدیر کو منظور نہیں ہوگا تو شرافت اور عزت کی موت اسے کبھی نصیب نہیں ہوگی۔

وہ ایک کرسی پر گر پڑا۔ اسے اپنے سامنے لیفٹیننٹ مائیکل کا چہرہ نظر آیا اس کے پیچھے اینجلو تھا اردگرد بہت سے لوگ تھے پولیس کے فوٹو گرافر ڈاکٹر اور ایمبولینس والے جو کیرل کو مردہ خانے لے جانا چاہتے تھے۔ کہیں دور سے مائیکل کی آواز آئی۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر جان سن کہ تمہاری سیکرٹری کو تین ماہ کا حمل تھا؟'' پھر یکلخت ہر سمت سے اسی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' جان سن نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے بے بسی سے ہر طرف دیکھا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ گزشتہ دو گھنٹے سے تم کہاں تھے؟'' بازگشت پھر سنائی دی۔

''میں؟'' جان سن نے بے خیالی میں کہا۔

''کہیں نہیں کسی کے ساتھ نہیں میں اکیلا پھرتا رہا میرا ذہن کارل مارک کی موت سے پریشان تھا۔

''کسی نے تمہیں دیکھا؟ کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے یا کسی بار روم میں کسی کافی ہاؤس میں؟'' مائیکل نے کہا۔

ڈاکٹر جان سن نے پھر مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ اس کا گواہ کوئی بھی تو نہیں تھا کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ اس نے کیرل کو قتل نہیں کیا اب صرف مائیکل تھا جو کہہ رہا تھا۔

''تم نے اسے قتل کیا اور گھر سے نکل گئے تم جانتے تھے کہ کچھ دیر میں اس قتل کی خبر پولیس کو ضرور مل جائے گی اور پولیس کے پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد تم معصوم صورت بنائے آ پہنچو گے یہ بتانے کے لیے کہ تم ڈاکٹر ہو اور اس لڑکی کو گناہ کی دلدل سے نکالنے والے تم ہی تھے دنیا جانتی ہے کہ تم نے ایک طوائف کو شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ کیا یہ دنیا جانتی ہے کہ تم نے اس طوائف کے ساتھ کیا کیا؟ تم نے اسے دنیا کے مردوں سے چھین کر اپنے لیے ریزرو کر لیا اور اسے سیکرٹری کا معزز رتبہ دے دیا۔ تم کہتے ہو کہ اس سے تمہارا رشتہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر استوار تھا اور کیرل کسی سے ملتی بھی نہیں تھی اس کا کوئی بوائے فرینڈ یا منگیتر بھی نہیں تھا کیا صرف انسانی ہمدردی کے رشتے نے اسے حاملہ کر دیا؟ مائی فٹ تم دنیا کو یا مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ چار سال تک ایک سیاہ فام طوائف رات کو تمہارے ساتھ تنہا رہی مگر تم نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمہیں عورت سے دلچسپی نہیں تھی۔ تم دوسری لائن کے آدمی تھے۔''

''لیفٹیننٹ.....'' جان سن نے بے بسی سے کہا۔ ''تم کسی ثبوت کے بغیر یہ نتائج کیوں اخذ کر رہے ہو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کارل مارک اور کیرل کے قتل میں کوئی بات مشترک ضرور ہے مجھے یہ کسی جنسی جنونی کی حرکت نظر آتی ہے مگر میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔''

''کیا تمہارے مریضوں میں کوئی ایسا ہے..... یا پہلے تھا؟'' لیفٹیننٹ مائیکل نے کہا۔

''مجھے پریکٹس کرتے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں بہت سے خطرناک قسم کے نفسیاتی مریض بھی میرے پاس آئے ہیں ان میں کچھ قابل علاج تھے اور ٹھیک ہو کر چلے گئے لیکن یہ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی پھر جنون میں مبتلا ہو گیا ہو۔ جو علاج کے باوجود زیادہ خطرناک ہو گئے تھے انہیں میں نے پاگل خانے بھیج دیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاگل خانے سے کسی کو فرار ہونے کا موقع مل گیا ہو مجھے دیکھنا پڑے گا کہ ایسے کتنے تھے میرے پاس ان کی گفتگو کے ٹیپ ہیں اور فائلیں ہیں۔'' ڈاکٹر جان سن نے کہا۔

''اگر تم نے کوئی کیس ڈھونڈ نکالا ڈاکٹر جان سن اور اپنا الزام کسی اور کے سر تھوپنے کی کوشش کی تب بھی تمہارے پاس ایک سوال کا جواب نہیں ہوگا کسی نے یہ قتل کیوں

کیے؟ بے سبب کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا اور سبب دیکھا جائے تو الزام تمہارے سوا کسی پر نہیں آتا شاید کیرل کو معلوم ہو گیا تھا کہ کارل مارک کو تم نے قتل کیا ہے اس نے باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ جھگڑے کا سبب کیا ہے شاید وہ پہلے سے یہ بات جانتی تھی کہ تم ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہے ہو اور تمہارے تعلقات کارل مارک سے بھی ہی وہ حاملہ بھی ہو چکی تھی اور تمہارے لیے دہرے خطرے کا باعث بن گئی تھی شاید تم بھی پہلے ہی سے طے کر چکے تھے کہ اس خطرے سے نجات ضروری ہے اور اگر کیرل نہ مانے تو کیرل سے نجات حاصل کرنی ضروری ہے کیرل جیسی عورت تمہیں بلیک میل کر کے ہی تم سے شادی کر سکتی تھی۔ وہ یقیناً اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوگی ابھی میں تمہیں گرفتار نہیں کر رہا ہوں ڈاکٹر جان سن لیکن تم کسی وکیل سے مشورہ کر لو تو بہتر ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

جب وہ چلا گیا اور کیرل بھی چلی گئی اور اسے لے جانے والے بھی چلے گئے تو جان سن تنہا اپنے ہی خیالات کے غول بیابانی میں گھر گیا۔ جہاں کیرل تھی وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا خانہ ویرانی اور ماتم ایک شہر آرزو کے سوا اداسی کے سوا اور دل شکستگی کے درد لا دوا کے سوا توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا۔ اس آئینے میں شیشہ گر کو اپنے کمال ہنر کا عکس نظر آتا تھا کیرل کو اس نے پتھر سے تراشا تھا اور ہیرا بنا دیا تھا۔ یہ ہیرا پھر زمین کی خاک میں گم ہو گیا تھا جس کی آب میں اس کے ماتھے کا پسینہ اور اس کے جگر کا لہو شامل تھا اسے دنیا نے کسی حال میں جینے نہ دیا نہ طوائف بن کر نہ عورت بن کر اسے نہ بدنامی راس آئی نہ نیک نامی اور جب جینے کا سلیقہ آیا تو مہینے کی مہلت نہ ملی اسے مائیکل کی بات یاد آئی وہ کسی کو تین ماہ سے اپنے وجود میں پرورش کر رہی تھی چپکے چپکے اتنی راز داری کے ساتھ کہ جان سن جیسے قابل اعتماد موکل و غم خوار کو بھی خبر نہ ہوئی۔

کیوں؟ کیرل نے اسے ہمزاد کیوں نہیں بنایا؟ وہ اس کی مدد کر سکتا تھا۔ اسی کی مدد نے کیرل کو استحصال کرنے والی دنیا کے خلاف صف آرا ہونا سکھایا تھا اور پھر کیرل جانتی تھی کہ جان سن کے ضابطہ اخلاق میں یہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ زندگی عطا کرنا ان دونوں کے لیے ایک جیسا مقدس فریضہ تھا ہر ڈاکٹر کے لیے اور ہر کیرل کے لیے گناہگار وہ تھے جو زندگی لیتے تھے یا زندگی کی آبرو لیتے تھے یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو کیرل بتانا چاہتی تھی مگر بتا نہ سکی مجبوری یا مصلحت کے تقاضے اسے روکتے رہے۔ اس نے کیرل کے کمرے کا رخ کیا۔ بند دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا کوئی نہیں آئے گا اس کے ویران میکدے میں ہر چیز وہی تھی۔ ویسی ہی تھی اور وہیں تھی مگر کیرل صرف ایک نام رہ گئی تھی۔ دل میں گم ہو جانے والی یاد کی طرح بے وجود وہ اس کے خالی بستر کو میز پر رکھی ہوئی ذاتی استعمال کی چیزوں کو الماری میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو دیکھتا رہا کیرل سے اس کی ذہنی وابستگی پرورش کرنے والے کی طرح تھی وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کیرل اس کی جوان بیٹی تھی جو چار برس سے نہیں ابتدا سے اسی گھر میں تھی اور یہ احساس غلط بھی نہیں تھا کیرل کی موجودہ زندگی کا آغاز اور انجام جان سن کے سامنے ہوا تھا اس نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں کاغذات کے نیچے ایک ڈائری تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور پڑھنے لگا کسی احساس جرم وندامت کے بغیر کیوں کہ کیرل زندہ ہوتی اور دیکھ لیتی تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ ان کی زندگی ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب تھی اور ان کے اعتماد کا رشتہ ایسے ہی قائم تھا۔

آخری صفحے سے گزر کر اس نے ڈائری بند کر دی اور کمرے میں ٹہلنے لگا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کیرل نے اسے زندگی کے اس راز میں شریک کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ کرسمس پر ڈاکٹر کو یہ خوش خبری دینا چاہتی تھی کہ اس نے کسی کو اپنا رفیق حیات منتخب کر لیا ہے وہ کیرل جو اس گھر میں پہلے دن اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کی گود میں آ بیٹھی تھی۔ جسے دو بار عصمت فروشی کے جرم میں عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا جس نے عدالت کے سامنے اپنے جواں جسم کی سر عام نمائش کرتے ہوئے عار محسوس نہ کی تھی۔ جس کے لیے مرد ایک ڈالر کا دوسرا نام تھا اب چپکے چپکے عشق کر رہی تھی ان گنت مردوں کی آغوش میں اپنے جسم کے ٹھنڈے گوشت کو پھینک دینے والی طوائف اپنے اسی جسم کو ایک مقدس امانت کی طرح رسم دنیا کے مطابق مذہب کے اصولوں اور قانون کے ضابطوں کے مطابق صرف ایک مرد کے سپرد کرنا چاہتی تھی جو اس کی حفاظت کر سکے اور یہ

بے وقوف لڑکی جان سن سے اس طرح ڈرتی تھی جیسے ہر لڑکی آغاز شباب کے پہلے معاشقے پر باپ سے ڈرتی ہے اس نے ڈائری میں لکھا تھا۔

"اگر ڈاکٹر جان سن نے اسے پسند نہ کیا تو میں کیا کروں گی خداوند مجھے انتخاب کی آزمائش سے بچانا۔"

ڈاکٹر جان سن کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے یا قہقہے مار کر ہنسے بھلا تم کیا کر سکتی تھیں کیرل اور میں کیا کر سکتا تھا یوں نہ تھا ہم نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے مگر یہ ہمارے اختیار کی بات نہ تھی انتخاب ہمارا نہ تھا مائیکل نے تفتیش کیے بغیر کیرل پر تہمت لگا دی تھی اور اسے مورد الزام قرار دے دیا تھا۔

اس نے ڈائری کو مقفل کر دیا اسے ایک سوال کا جواب تو مل گیا تھا یعنی یہ کہ کیرل کو تین ماہ کا حمل کیوں تھا لیکن اس سے جان سن کے مسائل ختم نہیں ہوتے تھے۔ اصل مسئلہ مائیکل کا عداوت آمیز رویہ تھا جس سے انتقام کی بو آتی تھی۔ وہ ڈاکٹر جان سن کو رسوا کرنے اور قتل کے جرم میں ملوث کرنے پر کمر بستہ نظر آتا تھا قدرت نے اسے موقع فراہم کیا تھا کہ دو سال بعد ڈاکٹر جان سن کو سچ بولنے کی سزا دے۔

دو سال پہلے لیفٹیننٹ مائیکل کا پارٹنر ایک جنونی کے ہاتھوں مارا گیا تھا خود مائیکل کے جسم سے تین گولیاں نکالی گئی تھیں اور وہ چھ ماہ تک موت و زیست کی کش مکش سے گزر کر اسپتال سے نکلا تھا تو اپنے پارٹنر کے قاتل کو قانون کے ہاتھوں تختہ دار تک گھسیٹ کر لے جانے کی قسم کھا چکا تھا۔ مگر قاتل کا دفاع کرنے والے وکیل نے یہ موقف اختیار کیا کہ ملزم ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ تصدیق کے لیے عدالت نے ڈاکٹر جان سن کو بطور ماہر طلب کیا اور جان سن نے تفصیلی معائنے کے بعد قاتل زیفرن کو ناقابل علاج حد تک پاگل قرار دیا مائیکل کے عزائم خاک میں مل گئے اور زیفرن کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ مائیکل نے بے بسی مایوسی اور اشتعال کے عالم میں ڈاکٹر جان سن پر الزام عائد کیا کہ اس نے قاتل کی حمایت کی اور اس کے دوست احباب سے رشوت لے کر غلط رائے دے دی لیکن جان سن کی رپورٹ سو فیصد ایماندارانہ مشاہدے پر مبنی تھی اور وہ بے بنیاد الزامات کی تردید بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا اس کا رویہ اس

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ نئے اُفق کراچی
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
6000 روپے
میڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے
5000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ مقامی افراد
ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216
موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242
رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز
81 [illegible] ہاکی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510
فون نمبرز: +922-35620771/2
naeyufaq.com
Info@naeyufaq.com

کے عزائم کا غماز تھا۔

وہ کیرل کے بستر پر لیٹ گیا جس میں اس کے بدن کی خوشبو بسی ہوئی تھی یونہی چھت کو گھورتے گھورتے اور سوچتے سوچتے اس نے سگریٹوں کا پیکٹ پھونک دیا گزرے ہوئے وقت کی وہ متحرک فلم جو اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھی آنکھیں بند ہوتے ہی خواب بن گئی جس میں کیرل ہنوز زندہ تھی ہنستی مسکراتی۔ فائلیں نکالتی باتیں کرتی ٹائپ کرتی مستعد فرض شناس ذہین۔

وہ باہر نکلا تو سڑک دور دور تک خالی پڑی تھی۔ گہری دھند میں اسٹریٹ لائٹ کا اجالا ایک مختصر سے دائرے تک محدود ہو گیا تھا۔ جو کھمبے کے نیچے چند فٹ تک روشن نظر آتا تھا اور روشنی کے یہ دھبے سیاہی کی چادر میں سفیدی کے پیوند کی طرح پھیلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سرد رات میں ہر چیز ٹھٹھری ہوئی اور منجمد لگتی تھی۔

پیٹر کے گھر کی فضا میں زندگی تھی۔ خلوص تھا اور سینٹرل ہیٹنگ کے نظام کے باعث سردی کا وجود نہ تھا پیٹر نے اور اس کی بیوی لوزا نے بڑے اصرار سے جان سن کو اپنی شادی کی تیسری سالگرہ پر مدعو کیا تھا اور اسے تمام مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ایک کپ کافی کے لیے روک لیا تھا۔ پیٹر سے اس کے مراسم بڑے پرانے تھے اور اس کی بیوی لوزا بڑی خوبیوں کی مالک تھی۔ اس کے انداز میں اپنائیت کا اور بے تکلفی کا وہ سلوک ملتا تھا جو اعتماد عطا کرتا تھا پہلی بار اس سے ملنے والا بھی یوں محسوس کرتا تھا جیسے وہ اس کے خلوص اور عنایت سے اب تک محروم نہ تھا کبھی ماں کے روپ میں کبھی بہن بن کر اور کبھی بیٹی کی طرح یہی عورت پہلے بھی جینے کے لیے عزم اور محبت کا سرمایہ فراہم کر چکی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر جان سن کے لیے نئی زندگی کے ہنگامے باعث تفریح نہ تھے لیکن وہ تنہائی سے فرار چاہتا تھا لوزا سے مل کر کچھ دیر کے لیے بھول جانا چاہتا تھا کہ بے گناہ ہونے کے باوجود اس کے پاس بے گناہی کا ثبوت نہیں اور مائیکل اس کے گرد شکوک و شبہات کا جال بنتا جا رہا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی یہاں آنے کا ایک مقصد تھا وہ پیٹر کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اس نے اپنے جس دوست کو مشورے کے لیے بھیجا تھا وہ عدم توازن کی اس منزل پر ہے کہ کسی بھی وقت اس کا دماغ الٹ سکتا ہے اور اس کا پاگل پن خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے کسی بھی معالج کے لیے وہ بڑا کٹھن وقت ہوتا ہے جب اسے مریض کے لواحقین کو بتانا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ غلط ہوئی ہیں اور اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے پیٹر کا دوست برک بڑے اچھے عہدے پر فائز تھا اب اس کی ملازمت کا ختم ہو جانا اتنا ہی یقینی تھا جتنا اس کا پاگل خانے جانا۔

اس کی گاڑی سڑک کے دوسرے کنارے پر تھی۔ اس نے عادت کے مطابق سڑک کو عبور کرنے کے لیے فٹ پاتھ سے نیچے قدم رکھتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ سڑک بدستور خالی پڑی تھی۔ دونوں کناروں پر کاروں کی ایک قطار روشنیاں گل کیے خاموش کھڑی تھی۔ ابھی جان سن نے آدھی سڑک بھی طے نہیں کی تھی کہ یکلخت ایک کار کا سایہ سا نمودار ہوا۔ وہ کاروں کی قطار میں سے نکلنے والی کار ہی ہو سکتی تھی کیونکہ جان سن نے اسے دور سے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا یا شاید وہ لمحہ بھر کے لیے غافل ہوا تھا اور کوئی کار اچانک روانہ ہوئی تھی۔ اس نے طویل کار کو اپنی سمت بڑھتے ہوئے دیکھا اور بے اختیار دو قدم پیچھے ہو گیا۔ کار نے بھی اپنا رخ بدلا اور جان سن کو اچانک ہیڈ لائٹس کے بند ہونے کا احساس ہوا اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ ڈرائیور نشے میں دھت ہے وہ دوڑ کر آگے بڑھا کار لہرائی اور پھر جان سن کی طرف بڑھی۔

دوسرے کنارے کی فٹ پاتھ صرف دو قدم دور تھی۔ جب کار نے اسے آ لیا۔ آخری وقت میں جان سن نے سمجھ لیا تھا کہ حملہ ان کی زندگی پر ہوا ہے مگر اس وقت فرار کی کوئی صورت نہ رہی تھی لیکن اس نے جست لگائی کار فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور اس کے بمپر اور بونٹ کا ایک کونا جان سن سے ٹکرایا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی طاقت ور ہاتھ نے اسے اٹھا کے دیوار پر دے مارا ہے۔ اس نے کار کو چند انچ دور سے گزرتے اور قوس بناتے ہوئے فٹ پاتھ سے نیچے اتر کر فرار ہوتے دیکھا لیکن دیوار نے تصادم کے بعد اسپرنگ کی طرح آگے دھکیل دیا تھا وہ فٹ پاتھ کے سنگین فرش پر منہ کے بل گرا اور کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا۔ مکمل بے ہوشی نے اس سے یخ بستہ رات کا وجود کا اسٹریٹ لیمپ کے اجالے کا اور اپنی رگ رگ میں اترتے ہوئے درد کے احساس کو چھین لیا۔

ہوش آیا تو وہ ڈاکٹر ہیرس کے کلینک میں صاف ستھرے بستر پر لیٹا ہوا تھا اپنے سامنے لگی ہوئی کیلنڈر والی دیوار کی گھڑی پر نگاہ ڈالنے سے اسے معلوم ہوگیا کہ وہ قاتلانہ حملہ گزشتہ شب کی بات تھی زندگی کے یقین اور تحفظ کے احساس کے ساتھ ہی اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیت بحال ہونے لگی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا لیکن اس نے اندازہ کرلیا کہ جسم کی تمام ہڈیاں سلامت ہیں اور یہ درد چوٹ کا نتیجہ ہے۔ اس کی کمریوں ہوگئی تھی جیسے اس پر سیمنٹ کا پلاسٹر چڑھا دیا گیا ہے مگر تھوڑی سی قوت برداشت کا مظاہرہ کر کے وہ کروٹ بدلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس اندھی کار کے قاتل ڈرائیور نے تو اپنی دانست میں جان سن کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور مطمئن ہو کر چلا گیا تھا مگر جان سن جو تصادم کے بعد ضرب کی شدت سے بے ہوش ہوا تھا کسی پولیس مین یا راہ گیر کی وساطت سے ڈاکٹر ہیرس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کا رات بھر بے ہوش رہنا ناممکن تھا یہ ڈاکٹر ہیرس کے خواب آور انجکشن کا اثر تھا کہ وہ دس گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا تو صدمے کا اثر جسم تک محدود رہ گیا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل تھا۔

اپنی زندگی پر اس حملے کے بعد اس کے شکوک یقین میں بدل گئے تھے کارل مارک کو یقیناً کسی نے اس کے دھوکے میں مار دیا تھا۔

کیرل اس لیے ماری گئی تھی کہ اس نے قاتل کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی پہلی ناکامی کا ازالہ کرنے پہنچا تھا مگر جان سن کے نہ ملنے سے اس کے لیے ایک خطرہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ پھر کبھی موقع ملنے پر اس نے جان سن کو قتل کر دیا تو کیرل اسے شناخت کرلے گی۔ اس کی سمجھ میں دو باتیں نہیں آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا دشمن کون ہے اور کیوں اس کی جان کے درپے ہے۔ زر، زمین، اور زن کے علاوہ بھی دنیا میں قتل کے اسباب تھے تو جان سن کے لیے نہیں تھے دوسری بات کیرل کے قتل میں تشدد کے مظاہرے کی تھی اسے قتل کرنے کے لیے آنے والا اگر کیرل کو افشائے راز کے خوف سے ختم کرنا چاہتا تھا تو کم سے کم وقت میں اپنا کام ختم کر کے جاسکتا تھا لیکن کیرل کو بڑی اذیت دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس سے کوئی مطالبہ کیا تھا جسے کیرل نے پورا نہیں کیا۔ شاید اس سے کوئی کیس فائل یا ٹیپ مانگا ہو اور اس نے چابی دینے سے انکار کر دیا ہو۔ کوئی اس سے جان سن کے کسی مریض کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتا ہو جو کیرل نے نہ بتائی ہو اس خیال سے کہ بعد میں اس مریض کو بلیک میل نہ کیا جاسکے۔

جان سن کے پاس اپنے نفسیاتی مسائل لے کر آنے والے مروجہ طریقہ علاج کے مطابق آرام سے لیٹ کر اپنی زندگی کے بارے میں کسی بھی موضوع پر کسی بھی مسئلے کے متعلق بچپن سے اب تک پیش آنے والے کسی بھی واقعے کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات بیان کرنے لگتے تھے۔ وہ بولتے جاتے تھے اور آپ زندگی کے اوراق کو پلٹتے جاتے تھے۔ ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ یادوں کے ذخیرے سے ایک ایک یاد کو کرید کرید کر نکالتے جاتے تھے اور اپنے لاشعور میں پنہاں محبت اور نفرت کے جذبوں کو محرومی اور ناآسودگی سے جنم لینے والے احساس کمتری کو ناکامیوں کے اندیشوں کو اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بے نقاب کرتے جاتے تھے اور بے ترتیب گفتگو کے دوران جان سن نوٹ کرتا جاتا تھا کہ الجھی ہوئی شخصیت میں گتھیاں کہاں کہاں ہیں غیر ارادی طور پر کسی نے کیا کہہ دیا ہے اور اس سے کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے۔

مریض کا ذہن ایک کباڑی کی دکان کی طرح ہوتا تھا اور جان سن ان کی باتوں کے ٹیپ سن کر ان کی زندگی تاریخ مرتب کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ کباڑی کی دکان میں چھپا ہوا یادوں کے پرانے ڈھیر میں دفن کہیں سے وہ چور جذبہ پکڑا جاتا تھا جو فساد کی جڑ ہوتا تھا۔

گزشتہ رات اس نے پیٹر کو مطلع کر دیا تھا کہ اس کا دوست برک ذہنی جنوں میں ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر شخص اس کے نادیدہ دشمنوں کے ساتھ اس کے قتل کی سازش میں شریک ہے اور اس کی جان لینے والے چوبیس گھنٹے سائے کی طرح ہر جگہ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ اس نے اپنے ملازم کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ کیونکہ اسے شبہ ہوگیا تھا کہ ملازم نے کھانے میں سنکھیا ڈال دیا ہے اس نے کھانا چکھا تک نہیں تھا۔ محض سونگھ کر یہ فیصلہ کرلیا تھا اور پھر پولیس کو رپورٹ کرنے اور کھانے میں

زہر کی موجودگی ثابت کرنے کے لیے کیمیائی تجزیہ کرنے کی بجائے اس نے نوکر پر الزام عائد کردیا کہ وہ دشمنوں سے مل گیا ہے اور اس نے رشوت لے کر برک کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا کہ بیس سال کی نوکری کے بعد وہ ایک بینک میں نائب صدر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اب صدر کے ریٹائر ہوجانے یا وفات پاجانے کی صورت میں صدر بننے کے خواب دیکھ رہے تھا لیکن وقت آیا تو انتظامیہ نے اسے نظر انداز کردیا اور ایک بہت جونیئر افسر کو صدر بنا دیا۔ برک کے خیال میں یہ بھی اس کے دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھا جو اس کی رسوائی پر کمربستہ تھے۔ اس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ دشمن اپنی ریشہ دوانیوں سے پولیس کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور پولیس اب اس چکر میں ہے کہ برک کو کسی قتل کے جھوٹے مقدمے میں پھانس کر یا اسے جاسوس اور ملک دشمن ثابت کر کے الیکٹرک چیئر پر بٹھا دے یا وہ بینک سے چیک کیش کرا کے نکل رہا ہو تو اسے گولی مار دے کہ وہ بینک لوٹ کر فرار ہو رہا تھا۔

عام لوگوں کے بارے میں اسے یقین تھا کہ دشمنوں کی فتنہ انگیزی اور شر پسندی کے باعث اسے ذلیل کرنے کے لیے اس پر سر راہ انگلیاں اٹھاتے ہیں فقرے کسے جاتے ہیں اور ہنستے ہیں دنیا میں اس کا دوست کوئی نہیں اور آس پاس ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے چنانچہ وہ ذہنی طور پر ان سب ''دشمنوں'' سے محتاط تھا۔

اس احساس کی بنیاد چار سال قبل پیش آنے والے ایک حادثے پر تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے چوری چوری اپنے گھر سے دو سو میل دور ساحل سمندر پر ایک ہٹ کرائے پر لے رکھی تھی جہاں وہ عموماً اپنی سیکرٹری اور کبھی کبھار کسی بھی ہم خیال عورت کو لے کر بینک کے کام کو بہانہ بنا کر چلا جاتا تھا اور ہفتے کی چھٹی کے دو دن گزار کے تھکا ماندہ لوٹ آتا تھا۔ نائب صدر ہونے کے باعث اس کی آمدنی معقول تھی اور اسے بہت سی مراعات بھی حاصل تھیں۔ ایسے ہی ایک سرکاری کام کے دوران کسی راز داں نے اسے مطلع کیا کہ حادثے میں اس کا گھر نذر آتش ہوگیا ہے اور اس کے بیوی بچے مخدوش حالت میں نکالے گئے ہیں عیش و نشاط کے سرور انگیز لمحات میں اس المناک خبر کا شدید ردعمل ہوا اس نے آدھے ادھورے کپڑے پہنے اپنی سیکرٹری کو گھسیٹ کر کار میں ڈالا اور خطرناک راستوں پر حد رفتار کی پروا کیے بغیر کار کو دوڑانے لگا۔ ابھی اس کی سیکرٹری کچھ سمجھ بھی نہ پائی تھی اور اندھیرے میں جھٹکے کھاتی اچھلتی کار کے اندر بمشکل تمام لباس پہننے میں کامیاب ہوئی تھی کہ کار حادثے کا شکار ہوگئی۔ برک ہوش میں آیا تو اسے دو جان لیوا خبریں ملیں۔ ایک اپنے خاندان سے محروم تر ہوجانے کی۔ دوسری اپنی سیکرٹری کے ہلاک ہونے کی تحقیق و تفتیش کے اعصاب شکن مرحلوں سے گزر کر وہ سزا سے تو بچ گیا لیکن زندگی اس کے لیے سب سے بڑی سزا بن گئی۔ احساس جرم و گناہ نے اس کے ذہن کو متاثر کیا۔ دن بدن یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا کہ وہ گھر پر ہوتا تو شاید کوئی حادثہ ہی پیش نہ آتا یا وہ اپنے بیوی بچوں کو ضرور بچا لیتا اس کی سیکرٹری بھی نہ ماری جاتی وہ ان سب کا قاتل ہے اور دنیا بھی سمجھتی ہے کہ اسے اپنے عہدے اور ناکافی شہادت کے باعث سزائے موت نہ ہوسکی لیکن اب دنیا تہیہ کر چکی ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں اور اسے مار دیا جائے اسے اپنی زندگی خطرے میں گھری ہوئی نظر آنے لگی کیونکہ وہ سمجھتا تھا ہر شخص اسے مار دینا چاہتا ہے۔ اس سے بعید نہ تھا کہ بے سبب کسی کو اپنی زندگی کا دشمن سمجھتے ہوئے قتل کر ڈالے کیونکہ اس کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایک چلتا پھرتا ٹائم بم تھا جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا تکلیف کی شدت کے باوجود جان سن اٹھ کر بیٹھ گیا قتل برک نے کیے ہونگے اس یقین کے ساتھ کہ وہ پہل نہ کرتا تو خود مارا جاتا۔ مائیکل کے اندر آجانے سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ اینجلو بھی تھا۔

''کیپٹن۔'' جان سن نے ان دونوں کے بیٹھتے ہی کہا ''تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد میں پھر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے قاتل کوئی پاگل یا جنونی ہے۔''

''جس نے کیرل کو غلطی سے ڈاکٹر جان سن سمجھ کے مار دیا۔ مائیکل نے زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیرل کو اس لیے مار دیا گیا کہ اس نے قاتل کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔'' جان سن نے ضبط سے کام لے کر کہا۔

''یہ اتفاق ہے کہ میں کلینک میں نہیں تھا اور قاتل یقیناً یہ سمجھتا تھا کہ کیرل اسے بعد میں شناخت کرے گی اسے قاتل کی نیت کا علم ہو گیا ہوگا۔''

''یہ سب بے بنیاد مفروضات ہیں ڈاکٹر جان سن۔'' مائیکل نے کہا۔

''مفروضات نہیں ہیں،، جان سن نے برہمی سے کہا۔ کار کا حادثہ غلطی کا نتیجہ نہیں تھا۔ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

''شٹ اپ۔'' مائیکل نے سخت لہجے میں کہا۔ ''چیخنے چلانے سے تم بے گناہ ثابت نہیں ہو جاؤ گے تم پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہو تا کہ تفتیش کا رخ بدل جائے۔ غلطی سو فیصد تمہاری تھی کہ سڑک کے پار کرتے ہوئے تم نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تم اس وقت نشے میں تھے یا.....''

''سڑک پر اس وقت کوئی کار نہیں تھی۔ جب میں نے سڑک پر قدم رکھا تھا۔ کھڑی ہوئی کاروں میں سے کوئی اچانک چل پڑی تھی۔ عملاً اس نے اپنی ہیڈ لائٹس بند رکھی تھیں اور اس کا ارادہ مجھے کچل کر ہلاک کر دینے کا تھا۔'' جان سن نے کہا۔

''پھر اس نے اپنا ارادہ بدل کیوں دیا؟'' مائیکل تلخ لہجے میں بولا۔ ''اس نے پلٹ کر تم پر سے کار کیوں نہیں گزار دی جبکہ وہاں اسے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر جان سن خود اپنے سوا تمہارے دعوے کا گواہ کون ہے؟''

جان سن نے بے بسی سے اینجلو کی طرف دیکھا۔ مائیکل کے مقابلے میں اس کا رویہ بالکل مختلف صاف نظر آتا تھا کہ اسے جان سن سے ہمدردی ہے وہ اس کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے لیکن وہ اپنی ہمدردی کا اظہار ڈاکٹر جان سن کی حمایت سے نہیں کر سکتا۔ نظام انصاف کے لیے کسی کا شجرہ نسب یا معزز پیشہ یا شریفانہ حلیہ اس کی بے گناہی کی سند نہیں ہو سکتا۔ قاتل تو ایک بے رحم غالب آ جانے والا شیطانی لمحہ ہے جو کبھی شاعر کے ہاتھوں سے قلم اور راہب کے ہاتھوں سے صلیب اور بچے سے کھلونا لے کر اسی ہاتھ میں خنجر تھما دیتا ہے جو ہابیل کو قابیل کے سر پر پتھر مارنے پر مجبور کر دیتا ہے اور آدمی کو فرشتہ نہیں بننے دیتا۔

''مائیکل۔'' جان سن نے کچھ دیر بعد کہا۔

''زیفرن کا کیا حال ہے؟''

نفرت سے مائیکل کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کے جان سن کی گود میں رکھ دیا۔ ''میں جانتا ہوں تم کو آج اچانک اس کا حال پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ خود معلوم کر لو، وہ پاگل خانے سے فرار نہیں ہوا ہے۔''

''تھینک یو۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' ایک تکیے کے نیچے سے اس نے اپنی ڈائری نکالی اور برک کا فون نمبر تلاش کیا۔ ''مائیکل! میں اپنا ایک شبہ دور کرنا چاہتا ہوں، اس نمبر پر ایک بینک کے نائب صدر مسٹر برک کی سیکرٹری کال ریسیو کرے گی۔ اس سے پوچھو کہ جس وقت میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا اور اس وقت جب کارل مارک کا اور کیرل کا قتل ہوا۔ میٹر برک کہاں تھے۔'' جان سن نے کہا۔

مائیکل نے بادل ناخواستہ نمبر ملایا۔ تقریباً دس منٹ کی گفتگو سن کے جان سن نے اندازہ کر لیا کہ اس نے غلط سوچا تھا حادثے کے وقت برک، انتظامیہ کی ایک میٹنگ میں موجود تھا۔ کیرل اور کارل مارک کی موت کے وقت وہ اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ بینک کا سارا عملہ اس کا گواہ تھا۔ یہ کلوزنگ کے دن تھے اور برک کے علاوہ بھی بہت سے لوگ چوبیس گھنٹے تک مسلسل کام کرتے رہے تھے۔ کوئی ایک منٹ کے لیے باہر نہیں نکلا تھا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' مائیکل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو ہر قاتل کا ذہن خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اور حالات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں اپنا جرم کسی بے گناہ کے سر تھوپنے کی جدوجہد کرتا ہے مگر تعلیم یافتہ مجرم آخر تک خود فریبی کا شکار رہتا ہے۔ تمہارے لیے بھی مزید خوش فہمی خودکشی کے مترادف ہوگی بہتر ہے ابھی سے کسی ماہر وکیل کی خدمات حاصل کر لو۔'' اس کے لہجے میں کسی فرض شناس پولیس افسر کا غیر جذباتی انداز نہیں تھا۔ اس کے سپاٹ اور سرد لہجے میں ایک پرانے عزم کا اعادہ تھا کہ ڈاکٹر جان سن۔ مجھے کسی نہ کسی سے تو اپنے دوست کے لہو کا یہ قرض وصول کرنا ہی تھا۔ اس لہو کے رائیگاں جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کل تمہاری عطا کردہ دیوانگی کی سند نے قاتل کو زندگی کی ضمانت فراہم کر دی تھی۔ مگر آج تمہاری فرزانگی تمہاری زندگی کی ضامن نہ بن سکے گی۔ مائیکل پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اینجلو چند سیکنڈ تذبذب

کے عالم میں کھڑا رہا۔

''سارجنٹ اینجلو۔'' ڈاکٹر جان سن نے درخواست کے انداز میں اینجلو سے کہا۔ ''تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟ خدا کی قسم میں بالکل بے گناہ ہوں میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ خطرہ تو میری اپنی زندگی کو ہے۔''

''میں..... میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر جان سن۔'' اینجلو نے آہستہ سے کہا۔ ''مگر مائیکل آپ کو قاتل ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔''

''وہ انتقام کی خواہش میں اندھا ہو رہا ہے۔'' جان سن نے کہا۔ ''کیونکہ میں نے اس کے دوست کے قاتل زیفرن کو پاگل قرار دے کر سزائے موت نہیں ہونے دی تھی۔ میں نے ایمانداری سے اپنی رائے دی تھی۔ کسی لالچ یا دباؤ کے باعث نہیں۔''

''مجھے، مجھے معلوم ہے ڈاکٹر جان سن۔'' اینجلو نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ یہ بات پولیس کمشنر کو معلوم ہو جائے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' باہر سے مائیکل کی آواز سن کر وہ تیزی سے بڑھا۔ ''پلیز ڈاکٹر اس گفتگو کا علم مائیکل کو نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ میرا بھی دشمن ہو جائے گا۔''

اس نے باہر نکلتے نکلتے کہا، جان سن نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ذہنی و جسمانی طور پر خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے مریضوں کا خیال آیا جو مطب کو بند پا کے مایوس ہو جائیں گے کیونکہ اب کیرل بھی نہیں۔ جو انہیں کچھ بتا سکے اور یہاں لیٹ کر اپنی زندگی کے بارے میں پریشان ہونے سے کچھ حاصل بھی نہ تھا۔ تفکرات سے بچنے کا مناسب ترین اور واحد حل مصروفیت ہو سکتی تھی مگر ڈاکٹر ہیرس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے دوست کو ہنسی خوشی جانے کی اجازت دے گا۔ بعید از قیاس بات تھی جان سن نے بستر سے اٹھ کر الماری کھولی، اس کے کپڑے الماری میں لٹکے ہوئے تھے چند منٹ کے اندر اندر اس نے اسپتال کا لباس اتار کے اپنا سوٹ پہن لیا جو حادثے میں خراب ضرور ہوا تھا لیکن پھٹا نہیں تھا پھر وہ کھڑکی سے باہر کود گیا۔

ٹیری برن نے عمداً دوسرے مریضوں کو پہلے ملاقات کا موقع دیا تھا اور خود آخر تک بیٹھی رہی تھی جان سن اس حرکت کا مطلب سمجھتا تھا ''ٹیری! تمہاری باری تو بہت پہلے آ گئی تھی۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''ہاں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''مگر میں ہمیشہ تخلیہ چاہتی ہوں مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ جب میں تم سے بات کرنے آؤں تو باہر دس مریض پہلو بدل بدل کر میرے نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں اور تاخیر پر مجھے کوس رہے ہوں مجھے تو تمہاری وہ سیاہ چمڑی والی سیکرٹری بھی زہر لگتی تھی۔'' وہ گدے دار بینچ پر الٹی لیٹ گئی اور کہنیوں کے بل سر اٹھا کے جان سن کو دیکھنے لگی۔

''ٹیری۔'' جان سن نے تنبیہ کے انداز میں کہا ''کیرل کی بجائے اپنے بارے میں بات کرو۔''

ٹیری برن کے غیر ضروری طور پر کشادہ گریبان سے پر شباب سرکشی پر آمادہ تھیں لیکن لباس کو ٹیری برن ہمیشہ غیر ضروری تکلف اور جسم کو قید رکھنے کی بے مصرف کوشش سمجھتی آئی تھی چنانچہ اسے احساس بھی نہیں تھا۔

''اپنے بارے میں کیا خاک بات کروں۔'' وہ دونوں پیر گھٹنوں سے موڑ کر آگے پیچھے ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم میری سنتے کہاں ہو۔''

''میں سب کی سنتا ہوں۔'' جان سن نے کہا ''لیکن میں تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکتا۔''

''آخر کیوں؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا میں تمہاری اس حبشی داشتہ سے بھی گئی گزری ہوں کیا میں عورت نہیں ہوں تم جس پہلو سے دیکھنا چاہو جس طرح آزمانا چاہو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''مگر مجھے تمہاری اس گفتگو پر سخت اعتراض ہے۔'' جان سن نے کہا۔ ''یہ بے شرمی تمہیں زیب نہیں دیتی۔''

''ڈارلنگ تم بھی کیسی مزے کی باتیں کرتے ہو بھلا شرم کیا چیز ہوتی ہے۔ عورت اور مرد کا رشتہ ازل سے ابدی ہے جسم کی ایک ضرورت ہے جیسے پیٹ بھرنا یا سونا۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ مثلاً شادی سب سے بڑی خود فریبی ہے۔ جس میں بے وفائی کی جرأت ہی نہ ہو اس کے لیے وفاداری مجبوری بن جاتی ہے۔'' وہ بے اختیار ہنسی۔

''یہ صرف تمہارے بیمار ذہن اور تمہارے حالات کا قصور ہے۔'' جان سن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ٹیری برن دھوکا صرف تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ جو کہ خود تم اپنے ساتھ کر رہی ہو اور تم سمجھتی ہو۔ دنیا میں سب ایک

دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں۔'' جان سن نے کہا ''اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے مطمئن ہیں اور قناعت کی پر سکون ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں ناجائز تعلقات استوار کرنے کے مواقع حاصل نہیں۔''

''شٹ اپ۔'' ٹیری نے ہاتھ بڑھا کے جان سن کے لبوں سے سگریٹ اچک لی۔

''آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔'' وہ سگریٹ کا ایک کش لے کر دھواں جان سن پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''مثلاً میرا شوہر نامرد ہے اس میں خود کو دھوکا دینے والی کون سی بات ہے اور یہ بات مجھے شادی سے قبل بھی معلوم تھی میں نے خود کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔''

''اور ان کے باوجود تم نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔'' جان سن نے دوسری سگریٹ سلگائی۔ ''کبھی تم نے غور کیا ہے ٹیری کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمہاری جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو یہ شادی کبھی نہ کرتی مگر تمہیں اپنی ہوس پرست فطرت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک لائسنس کی ضرورت تھی۔ جو عورت شادی کے بغیر یہ لائسنس لے وہ طوائف کہلاتی ہے مگر تم نے شوہر کی معذوری کو جواز بنا لیا اور خود ہی اس بات کو مشتہر کیا تاکہ تمہاری آوارگی کا ذمہ دار تمہارا شوہر کہلائے۔''

''اپنی یہ بکواس بند کرو۔'' ٹیری نے سگریٹ کو دونوں انگلیوں کے درمیان مسل دیا۔

''میں عام عورت نہ کبھی تھی نہ اب ہوں۔ کیونکہ وہ گھر جہاں میں نے پرورش پائی عام گھر نہیں تھا۔ وہاں میری ماں بھی جو گھر کا خرچ چلانے کے لیے کبھی کبھی رات کو گھر سے باہر بھی رہ جاتی تھی اور صبح میرا انگھٹو باپ اس سے نظریں ملائے بغیر پوچھتا تھا۔ خیریت تو تھی ڈارلنگ رات تم گھر نہیں آئیں اور میری ماں مشتعل ہوئے بغیر جواب دیتی تھی ہاں مجھے فلاں سہیلی نے روک لیا تھا کہ اتنی رات گئے اکیلی گھر جاؤ گی ان کی تو کار خراب تھی پھر وہ میرے باپ کو دس بیس ڈالر پکڑا دیتی تھی اور وہ چپکے سے سٹک جاتا تھا جب کبھی ایسا موقع آتا تھا تو میں دیکھتی رہتی تھی کہ میرا باپ اپنی بیوی کی واپسی کا کتنی بے چینی سے منتظر ہے کیونکہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ کمانے کا یہ فن میری ماں سے میری بڑی بہن نے سیکھا۔ وہ بڑی فراخ دل لڑکی تھی۔ میری ماں کے مقابلے میں زیادہ کما کے لاتی تھی مگر کبھی احسان نہیں جتاتی تھی۔ میں اس کے رنگ برنگے بیش قیمت کپڑے اس کا سامان آرائش اس کے ہینڈ بیگ جوتے اور ہیئر اسٹائل دیکھ دیکھ کر جلتی رہتی تھی۔ ایک مدت تک وہ میری ہر خواہش پوری کرتی رہی پھر ایک دن اس نے مجھے بڑی محبت سے اور بڑے خلوص سے سمجھایا کہ ٹیری ہمیشہ کسی کا دست نگر رہنا اچھی بات نہیں۔ اب تم اپنی ضروریات خود پوری کر سکتی ہو میں اس کے مشورے پر حیران رہ گئی کیونکہ یہ خیال مجھے واقعی کبھی نہیں آیا تھا اس روز میں نے غسل کے دوران اور بعد میں سج دھج کے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میری عمر صرف تیرہ سال ہے۔ جب میں باہر جانے لگی تو میری بڑی بہن نے عقل و دانش پر مبنی اصول تجارت کا ایک اور سنہری مشورہ دیا۔ اس نے کہا تمیری دنیا بڑی تنگ دل لالچی اور بے ایمان ہے کاغذ کے نوٹ بچاتی ہے اور الفاظ کے خوب صورت خزانے لٹا کے محبت کا چکر چلا کے اور حسن کے قصیدے پڑھ کے اپنا کام نکالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن خوب صورت الفاظ اور محبت کے وعدے اور حسن کے قصیدے سے پیٹ نہیں بھرتے۔ کام وہی کاغذ کے نوٹ آتے ہیں۔ ورنہ دکان میں جھاڑو پھر جاتی ہے۔ میں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی اور اپنے حسن و شباب کے دروازے قبل از وقت کھول دیے لیکن ٹکٹ بلیک میں بیچتی رہی۔ تم نے تو دیکھا ہی ہوگا کہ ہر اچھی چیز بلیک میں دگنے تین گنے داموں بھی بک جاتی ہے۔ میں بھی بڑی اچھی چیز تھی چنانچہ میں نے اپنی استاد اور استاد کی استاد ماں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ ایکسٹرا بھی نہ بن سکیں۔ میں اتنی بڑی فلمسٹار بن گئی مگر لائٹ مین اور کیمرہ مین سے پروڈیوسر ڈائریکٹر تک بڑی لمبی مسافت تھی جو میں نے بدن کو زاد راہ بنا کے طے کی کیا میں نے کوئی گھاٹے کا سودا کیا؟''

''نہیں۔'' جان سن نے سر ہلا کے کہا۔ ''گھاٹے کا سودا تم نے اس منزل پر پہنچ کے کیا آخر کیوں ٹیری؟''

''اگر میں سچ بولوں گی تو تم مجھے بے شرم کہو گے شوق سے کہو ٹیری نے اسکرٹ کو آخر تک اٹھا کے اپنی ایک ران کو کھجایا۔ ''دنیا نے تو ننگ آ کے مجھے بے شرم کہنا بھی چھوڑ دیا

ہے حقیقت یہ ہے ڈارلنگ کہ میں کبھی آسودہ نہیں ہوئی صحرا کو عبور کرنے والے مسافر کی طرح میری بھی پیاس نہیں بجھتی۔ دن رات، ہر لمحہ میرا دن العطش العطش پکارتا ہے۔ ایک بار میں ایک یونانی کروڑ پتی کی داشتہ کی حیثیت سے اس کے پرائیویٹ بحری جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ اس کے تین بھائی تھے جو بڑے بھائی کے مال پر رال ٹپکایا کرتے تھے اور مجھے دور دور سے ندیدوں کی طرح تکتے رہتے تھے۔ میں ان بیچاروں کی مجبوری سمجھتی تھی۔ ایک روز مجھے موقع مل گیا اور اس کروڑ پتی کے بیدار ہونے سے قبل ہی تینوں کے دل کی مراد پوری کر دی۔ کیا کسی کے دل کی مراد پوری کرنا گناہ ہوتا ہے۔ مثلاً بھوکے کو روٹی کھلانا یا پیاسے کو پانی پلانا۔ جہاز کا کپتان بڑا خبیث تھا۔ نہ جانے کیسے اسے معلوم ہو گیا اور وہ مجھے بلیک میل کرنے پر اتر آیا میں نے کہا۔ کمینے یہ تو بہتی گنگا ہے ہاتھ دھونے ہیں تو دھولے دل کیوں میلا کرتا ہے۔ گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہاتھ سب کے گندے تھے چنانچہ بڑا زبردست اسکینڈل بنا اور کروڑ پتی کی اجارہ داری سخت مجروح ہوئی۔ اس نے مجھے بیک بینی و دو گوش نکال دیا۔ مگر اس وقت تک میں ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ نقد اور اتنی ہی رقم کے تحائف وصول کر چکی تھی۔ بدنامی میرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ چار سال بعد میں نے شادی کر لی اس الو کے پٹھے سے جو اب میرا شوہر بنا پھرتا ہے مجھے اس میں ایک بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ وہ غیرت کے نام سے ناآشنا تھا بعض نامرد بھی غیرت مند ہوتے ہیں لیکن فریڈ میں یہ بات نہیں حال ہی میں تم نے اخبارات میں ایک اور اسکینڈل دیکھا ہوگا میری سالگرہ کی تقریب کے بارے میں۔''

''تم نے اس خبر کو بے بنیاد لغو اور بدنام کرنے والوں کی سازش قرار دیا تھا۔'' جان سن نے کہا۔

ٹیری قہقہہ مار کر ہنسی۔ ''ہاں مگر وہ خبر غلط نہیں تھی۔ میں نے اپنی پچیسویں سالگرہ چھٹی بار منائی تھی۔ چوبیسویں پانچ دفعہ منائی تھی۔ تیئیسویں چار مرتبہ۔ بیسویں سے قبل حساب میں کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ میں نے اب کوئی نہیں جانتا کہ میری عمر اصل چالیس سال ہے مگر کیا میں چالیس کی لگتی ہوں؟ میرے جسم میں اور پچیس برس کی عورت کے جسم میں کوئی فرق نہیں مگر تمہیں تو ایک بار بھی تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں پوچھتی ہوں کہیں تم بھی فریڈ تو نہیں ہو؟'' وہ نیچے اتر آئی۔ ''میں تصدیق کرنا چاہتی ہوں اجازت ہے؟''

''میں نے تمہیں پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ تم حد سے بڑھو گی تو مریض اور معالج کا رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔'' جان سن نے کہا۔

''اچھا بابا ناراض کیوں ہوتے ہو۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولی۔ ''ایک سگریٹ تو دے دو گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔''

وہ سگریٹ لے کر پھر لیٹ گئی۔ ''فریڈ اچھا آدمی ہے مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے اس نے میری سالگرہ کا زبردست اہتمام کیا تھا۔ روشنی کے لیے پچیس قد آدم موم بتیاں تھیں۔ شراب کے دس فوارے تھے سو پونڈ کا کیک تھا اور دو سو مہمانوں کی دعوت کا انتظام تھا۔ ایک بینڈ تھا جس میں دس افراد تھے میں نے تو صرف بینڈ ماسٹر کو مدعو کیا تھا۔ معلوم ہے کیوں؟ اس کی صورت تم سے بہت ملتی تھی بیوٹی فل مین۔ بعد میں وہی بحری جہاز والا مسئلہ بن گیا۔ دراصل ان سب میں زبردست اتفاق تھا اور اتفاق میں برکت ہے۔ میں تو ان کے ڈسپلن کی بھی قائل ہو گئی۔ خیر مجھ پر تو جو بیتی سو بیت گئی۔ یہ بتاؤ کہ فریڈ کیا دیکھتا رہا؟ میرا حوصلہ؟ میں تو سارے مہمانوں کی تواضع کر سکتی تھی۔''

''ٹیری۔'' جان سن نے اکتا کر کہا۔ ''مجھے بتاؤ یہ سب تم کیوں کرتی ہو؟''

''یہ میں بتاؤں؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ماہر نفسیات میں ہوں یا تم ہو؟ بس میرا دل چاہتا ہے کہ ہر وقت یہی باتیں کرتی رہوں۔ اس سے بھی زیادہ گندی خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ مجھ پر چوبیس گھنٹے جنس سوار رہتی ہے اور میرے اختیار میں ہو تو میں مگر چھوڑو، تم کبھی یقین نہیں کرو گے کہ جس مٹی سے میرا بدن بنا ہے۔ اس پر بادل رکے بنا متواتر مسلسل رستے رہیں تب بھی اس کی پیاس نہیں بجھے گی۔ شاید دنیا میں اپنی نوعیت کی میں ایک ہی عورت ہوں۔''

جان سن تلخی سے مسکرایا۔ ''یہ تمہارا خیال ہے ٹیری ایک بیمار ذہن کا بیمار خیال تم میں اور ایک عام عورت میں کوئی فرق نہیں۔ نہ جسمانی ضروریات کے اعتبار سے بات

صرف ایسا سمجھنے کی ہے ورنہ تم دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔ تمہاری بیماری کی یہ نوعیت بھی منفرد نہیں۔ تم جیسی ان گنت عورتیں یہی سمجھتی ہیں مگر دوسری جنگ عظیم میں وہ طوائفیں جن کی عمر یہی پیشہ کرتے گزر گئی تھی۔ نازی فوجیوں کی ایک بٹالین کے حملے سے رات بھر میں مر گئیں۔ ایک رجمنٹ یا بریگیڈ یا ڈویژن نہیں صرف ایک بٹالین، تمہارا دعویٰ سن کر مجھے ہنسی آتی ہے۔''

ٹیری بجلی کی طرح اٹھی۔ ''تم..... تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو۔'' خفت اور احساس ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ''کمینے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چینی کا ایک گلدان اٹھالیا۔ ''میں طوائف ہوں۔'' اس نے گلدان جان سن پر کھینچ مارا گلدان دیوار سے لگا اور پاش پاش ہوگیا۔ ٹیری نے اپنا بیگ اٹھایا اور تیر کی طرح دروازے کی طرف گئی۔

''گلدان کے دو سو ڈالر تمہارے بل میں شامل ہوں گے ٹیری برن۔'' جان سن نے سکون سے کہا۔

ٹیری نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا اور لپک کر باہر نکلنا چاہا اندر آنے والی عورت ٹیری سے ٹکرا گئی اور اس کا گلدستہ نیچے گر گیا۔ ٹیری نے پھولوں کو ایڑی سے مسل دیا اور نو وارد عورت کو ہکا بکا چھوڑ کر بھاگ گئی۔

''یہ..... یہ کون تھی.....؟'' وہ ٹیری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جواب لفٹ میں غائب ہو چکی تھی۔

جان سن نے آگے بڑھ کے زخم خوردہ پھولوں کو اٹھایا۔ ''تم تو جانتی ہو میرے پاس قسم قسم کے لوگ آتے ہیں الزبتھ۔'' الزبتھ مسکرائی برگ گلاب جیسے شگفتہ و شاداب رخساروں کے درمیان ایک ننھا سا گڑھا پڑ گیا اس کے موتیوں جیسے دانت جھلملائے اور اس کی سدا اداس نظر آنے والی سیاہ آنکھوں میں پل بھر کے لیے ستارے روشن ہوگئے۔ یہ دنیا کی واحد عورت تھی جس کے عشق سے انکار جان سن کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

''میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ تم حادثے میں زخمی ہوگئے ہو۔'' الزبتھ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کے کہا۔ اس کی حیا آلودہ نظریں جان سن کو تباہ ہوجانے والے گلدستے کو بڑے اہتمام سے میز پر سجاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ''میں اسپتال گئی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم اسپتال سے فرار ہو چکے ہو۔''

''تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اخبار والے کتنا سچ بولتے ہیں۔'' جان سن نے مسکرا کے کہا ''لیکن تم کھڑی کیوں ہو؟''

''میں..... میں اب چلتی ہوں۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح اچانک نروس ہوتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری یہ پھول خراب ہوگئے۔''

''خلوص کا رنگ اور محبت کی خوشبو ہو تو پھول کبھی خراب نہیں ہوتے۔'' جان سن نے کہا۔ ''تھینک یو ویری مچ اگر چند منٹ بیٹھ بھی جاؤ تو کیا ہے۔'' ٹیری باد سموم کی طرح آئی تھی اس کے مقابلے میں الزبتھ کا آنا نسیم بہار کی طرح تھا جان سن چاہتا تھا اگر وہ بیٹھ جائے تو اس سے بہت سی باتیں کرے مگر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تو اس کے جمال لب و رخسار کی دید کے سوا ذہن سے ہر بات فراموش ہوگئی۔

وہ پاس آئے تو موضوع گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

''مجھے جمعہ کو آنا تھا۔'' الزبتھ نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پہلو بدلا شاید اس کے بعد میں نہ آسکوں۔''

دل کا وہ آئینہ جس میں تصویر یار تھی ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ ''کیوں؟'' جان سن نے اپنی محویت سے چونک کر کہا۔

''میں اپنے شوہر کے ساتھ جارہی ہوں۔'' الزبتھ نے کہا ''لیکن میں جمعہ کو ضرور آؤں گی۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''میں انتظار کروں گا۔'' جان سن نے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھال کر کہا۔ الزبتھ نے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھیں اٹھا کے اس سے ان گنت سوال کیے کہ جان سن انتظار کیوں۔ انتظار کس لیے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں جسے اپنے شوہر سے محبت ہے میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں اور مطمئن ہوں۔ کیا تمہیں احساس نہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف مریض اور ڈاکٹر کا رشتہ ہے اور کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ ہم دونوں ہی شوریدہ سر جذبات کی عمر سے آگے نکل چکے ہیں۔ ہمارے لیے عشق کا ناٹک رچانا غلط ہی نہیں خطرناک بھی ہے اس سے میری ازدواجی زندگی بھی تباہ ہوسکتی ہے اور

تمہاری پریکٹس اور شہرت بھی لیکن یہ سب ایسے سوال تھے جو خود جان سن نے بھی الزبتھ کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ اپنے آپ سے کیے تھے اور یہی ان کی بے بسی تھی کہ آج تک وہ کسی سوال کا جواب تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی الزبتھ کی چاہت عمر کے اور عقل کے اور مصلحت کے تقاضوں کے خلاف ہے اس سے پیشہ ورانہ احساس فرض کا تقدس مجروح ہوتا ہے اپنی ذات پر اعتماد کو شکست ہونے لگتی ہے وہ اس عشق پر مجبور تھا اور اب اس مجبوری کو تسلیم کر چکا تھا الزبتھ اس کے لیے دنیا کی سب سے حسین عورت تھی مگر الزبتھ کی شخصیت جتنی دلفریب تھی اتنی ہی پراسرار بھی تھی ایک تو اس نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا شوہر چارلس کا کاروبار کیا ہے۔

الزبتھ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ سگریٹ سلگائے اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ آج تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ چھ مہینے پہلے الزبتھ اس کے پاس کیوں آئی تھی۔ مگر ان چھ مہینوں میں جان سن نے ایک بات سمجھ لی تھی۔ الزبتھ بالکل نارمل تھی۔ وہ کسی ذہنی الجھن یا پریشانی کا شکار نہیں تھی۔ اس نے چھ ماہ میں کم سے کم بارہ مرتبہ جان سن سے وقت لیا تھا پہلی بار کے سوا جب وہ آدھے گھنٹے بعد رخصت ہوگئی تھی جان سن نے اس سے ہر بار ایک گھنٹے تک ہر طرح کے سیکڑوں سوال کیے تھے جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ جان سن کے جذبات کو سرد کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اسے شبہ ہونے لگا تھا کہ الزبتھ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شوہر اسے دیوانہ وار چاہتا ہے۔ اسے ذہنی و جسمانی آسودگی حاصل ہے۔ سیر و تفریح کے مواقع میسر ہیں۔ اس کا گھر پانچ ایکڑ کے ایک فارم کے درمیان پرانی وضع کا عظیم الشان محل ہے جس کے ایک مخروطی مینار پر پیتل کا مرغ بادنما لگا ہوا ہے اور یہ گھر شوہر نے محض اس کی خوشنودی کے لیے خریدا ہے چارلس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں چارلس اس کے کہیں آنے جانے پر معترض نہیں ہوتا اور کسی کو مدعو کرنے یا کسی کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے جانے پر حسد کا شکار نہیں ہوتا۔ الزبتھ کے بیان کے مطابق تو چارلس آدمی نہیں فرشتہ تھا۔ مجموعہ صفات اور یہی بات جان سن کو نارمل نہیں لگتی تھی۔ انسانوں کی اس دنیا میں جہاں سب خطا کار ہیں اور کسی کی ذات بے عیب نہیں الزبتھ کو یہ فرشتہ کہاں سے مل گیا؟ کہیں یہ تو نہیں کہ اس نے اپنے تصور میں ایک گھر آباد کر رکھا ہو جس میں سب کچھ اس کے خوابوں کے اور اس کی خواہشات کے عین مطابق ہو اور بغرض محال ہو کچھ الزبتھ نے بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے تو کسی ماہر نفسیات کے پاس آنا چہ معنی دارد؟ اسے یاد تھا کہ ایک بار یہی سوال اس نے الزبتھ سے کیا تھا کہ ان حالات میں وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے اور الزبتھ نے بہت سوچنے کے بعد کہا تھا کہ اس کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ وہ ذہن کی بات زبان پر نہیں لا سکتی۔ اس کے لیے وضاحت مشکل ہے کہ اس کی الجھن کیا ہے۔ جان سن کا خیال تھا کہ بعد میں وہ اس کی باتوں سے مرض کی تشخیص کے قابل ہو جائے گا لیکن یہ وقت آنے سے پہلے ہی وہ خود مریض عشق بن گیا۔ الزبتھ کو اس کے مشورے کی قطعی ضرورت نہ تھی مگر وہ اسے مشورے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا تھا اور تعجب کی بات یہ تھی کہ الزبتھ بھی بڑی پابندی سے آ رہی تھی۔ یار ہا جان سن کے منہ سے بے اختیار کوئی ایسی بات نکل گئی تھی جو اس کے دلی جذبات کی آئینہ دار تھی۔ مگر الزبتھ نے برا نہیں مانا تھا وہ اس سے کھل کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ الزبتھ میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں اور اب محض اپنی مجبوری کے تحت تمہیں بلاتا ہوں۔ وہ ڈرتا تھا کہ الزبتھ آنا ہی نہ چھوڑ دے۔ اس کے خیال میں یہ نا ممکن تھا کہ الزبتھ نے اب تک اس کی آرزو کو اس کی آنکھوں میں نہ پڑھ لیا ہو۔ دنیا کی کون سی عورت مرد کے دل کی بات کو لبوں پر آنے سے پہلے ہی نہیں سمجھ لیتی۔ اگر وہ برا مانتی یا اسے منظور نہ ہوتا تو وہ لوٹ کر نہ آتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی الزبتھ نے اپنے رویے سے کبھی اس کی حوصلہ افزائی بھی نہ کی تھی۔ چنانچہ وہ شدید الجھن میں مبتلا تھا۔ مگر اب اچانک اس کی ساری الجھنوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ الزبتھ سے آخری ملاقات باقی رہ گئی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پر وہ چونکا اتنی رات گئے اسے یہاں فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک آٹھ بجے کلینک سے اٹھ جاتا ہے۔ ''ڈاکٹر جان سن؟'' کسی مرد نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' جان سن نے کہا۔ ''فرمایئے۔'' لیکن فون بند ہو چکا تھا۔ کوئی بات کیے بغیر فون کرنے والے نے ریسیو

رکھ دیا تھا اور یہ آواز اتنی صاف سنائی دی تھی کہ جان سن کے لیے لائن کٹ جانے کا شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس نے ریسیور رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اس کے کلینک میں تو سب ہی نفسیاتی مریض آتے تھے کیا کہا جاسکتا تھا کہ یہ بے مقصد کال کس نے کی۔ اس نے اندر کے کمرے میں الماریوں کو مقفل کرنے سے پہلے عادت کے مطابق دیکھا کہ تمام فائلیں اور ٹیپ ترتیب کے مطابق رکھے ہوئے ہیں کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ اس کمرے میں پہنچا جہاں چار سال تک کیرل کی عمل داری تھی۔ اس کی خالی کرسی دیکھ کر جان سن کو پھر شدت سے اس کی کمی محسوس ہوئی۔ ان چار سالوں میں کیرل کس طرح آہستہ آہستہ اس کی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن گئی تھی۔ دفتر میں کتنے کام تھے جو خود بخود ہو جاتے تھے گھر میں کس سلیقہ شعار بیٹی کی طرح جان سن کو راحت کا ہر سامان فراہم کرنا اس نے اپنا فرض سمجھ رکھا تھا کیرل کو دیکھ کر اس کا دل کامیابی کی مسرت کے احساس سے معمور ہو جاتا تھا۔

کیرل کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آیا تھا جو خود اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ مگر یہ سب کیرل کی قوت ارادی کا کرشمہ تھا اس کی سرشت میں نیکی اور اس کے دل میں شرافت کی زندگی بسر کرنے کی آرزو نہ ہوتی تو جان سن کیا کر سکتا تھا۔

کیرل کے کمرے سے گزر کر اس نے دوسرا دروازہ بند کر دیا یہ سب دروازے ایک بار بند ہو جانے کے بعد باہر سے چابی کے بغیر نہیں کھولے جاسکتے تھے۔ ہینڈل صرف اندر کی طرف تھے۔ تیسرا کمرہ ویٹنگ روم تھا لائٹ بجھا کے اس نے آخری دروازے کو بند کیا اور کاریڈور میں چلنے لگا جو بالکل ویران پڑا تھا۔ لفٹ کے سامنے رک کر اس نے بٹن دبایا اور اوپر دیکھا۔ دروازے کے اوپر لکھے ہوئے اعداد روشن نہیں ہو رہے تھے لفٹ بند تھی اس نے بالکل ساتھ والی لفٹ کا بٹن دبایا۔ لفٹ کے روانہ ہوتے ہی باری باری روشن ہو کے بجھ جانے والے ہند سے بدستور تاریک رہے۔ ہر لفٹ خود کار تھی اور یہ بڑا غیر معمولی اتفاق تھا کہ بیک وقت دونوں خراب ہو گئی تھیں۔

وہ زینے کی طرف چل پڑا۔ اسی وقت تاریکی نے اس پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آس پاس کے علاقے میں ہر عمارت روشن تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ بجلی صرف اسی عمارت سے غائب ہوئی تھی اس نے جھنجلا کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن نہ جانے کیسے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اس کے کمرے میں ہی رہ گئے تھے پہلے ٹیری اور پھر الزبتھ نے اس کے خیالات کو پریشان کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ بھول تھی اب اس نے واپس جا کے ہر مقفل دروازے کو کھولنے کی بجائے احتیاط سے اندھیرے زینے کے راستے نیچے اترنا بہتر سمجھا بہت نیچے پہلی منزل پر اسے روشنی کی دو متحرک لکیریں سی نظر آئیں جو اوپر کی سمت سفر کر رہی تھیں۔

''چوکیدار۔'' جان سن نے چلا کر پوچھا۔ اس کی آواز کی گونج خالی عمارت میں سنائی دی مگر جواب میں چوکیدار کی جانی پہچانی۔ ''یس ڈاکٹر۔'' کی صدا نہیں آئی۔

''چوکیدار۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''بہرے ہو گئے ہو کیا؟ چوکیدار۔'' لیکن ٹارچ کی وہ بھٹکتی ہوئی جائزہ لیتی ہوئی آگے کی طرف پھیلتی ہوئی روشنی مکمل خاموشی سے اس کی طرف بڑھتی رہی یکلخت اس کی چھٹی حس خطرے کی خبر دینے لگی۔ ہر سو ویرانی اور تاریکی خطرے کا اعلان کرنے لگی بیک وقت خراب ہو جانے والی لفٹ کے بند دروازے چلانے لگے۔ خطرہ..... خطرہ بے سبب اسے ٹیلی فون کال کرنے والے نے کہا۔ ڈاکٹر جان سن بم خطرے میں گھر گئے ہو۔ خطرے کا احساس کسی خوشبو کی طرح پھیل گیا۔ خطرے کا وجود نا قابل تردید حقیقت بن گیا۔

وہ پلٹ کر بھاگا اندھیرے ہی میں اس نے باہر کے دروازے میں ایک چابی لگائی مگر یہ باہر کی چابی نہیں تھی۔ اس نے دوسری چابی لگائی اور پلٹ کر دیکھا۔ روشنی کے ساتھ قدموں کی چاپ بہت نزدیک آ گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر تھا اور بند دروازہ پھر مقفل ہو گیا تھا۔ وہ دوسرے دروازے کی طرف لپکا۔ کیرل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے وقتی طور پر خود کو محفوظ سمجھا کیونکہ اب وہ دو مقفل دروازوں کے پیچھے تھا۔ تیسرا دروازہ اس کے اپنے کمرے کا تھا وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے ہلکا سا کھٹکا سنا۔ کوئی باہر کے پہلے دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے خوف اور گھبراہٹ نے آلیا۔

قاتل اس بار مکمل انتظام اور عزم مصمم کے ساتھ آئے تھے۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بھی بند کردیا۔ اب وہی اندر آسکتا تھا جو دروازے توڑ دے یا جس کے پاس باہر سے قفل کھولنے کی چابیاں ہوں۔

چابیوں ایک سیٹ اس کے پاس رہتا تھا اور دوسرا کیرل کے پاس۔ دوسرا سیٹ اب پولیس لے جاچکی تھی۔

ایک آواز پر اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بھر کے لیے بند ہوگئی۔ باہر کا پہلا دروازہ کھل گیا تھا خوف ڈاکٹر جان سن پر غالب آچکا تھا۔ اس کا پورا جسم رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپ رہا تھا اور پسینے میں تر تھا۔ وہ بے اختیار ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ ''آپریٹر'' اس نے دہشت زدہ سرگوشی میں کہا۔ ''میں کیپٹن..... نہیں..... سارجنٹ فرینک اینجلو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فوراً پولیس ہیڈ کوارٹرز۔''

''میں کون؟'' آپریٹر نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

اندر آجانے والے اب ویٹنگ روم میں تھے۔

''میں ڈاکٹر جان سن ہوں۔'' اس نے ایک فوری خیال کے تحت اونچی آواز میں کہا۔ ''میری آواز نہیں پہچانی تم نے؟''

''اوہ..... سوری ڈاکٹر۔'' آپریٹر نے کہا ''اس وقت ذہن آپ کی طرف گیا ہی نہیں پہلے کبھی آپ۔''

''وقت ضائع مت کرو۔'' جان نے درشت آواز میں کہا۔ ''یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' وہ اب کیرل کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پولیس اسٹیشن پر مسلسل بج رہی تھی۔

''یس؟'' کسی نے ریسیور اٹھا کے کہا ''پولیس ہیڈ کوارٹرز۔''

''میں..... میں سارجنٹ فرینک اینجلو سے بات کروں گا۔'' جان سن نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔

''سوری سارجنٹ اینجلو موجود نہیں ہیں میں مائیکل ہوں۔''

''مائیکل۔'' جان سن نے جلدی سے کہا۔ ''میں ڈاکٹر جان سن ہوں۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔ دو آدمی مجھے قتل کرنے آئے ہیں۔''

''اچھا؟'' مائیکل نے چند سیکنڈ بعد کہا۔

''کیا تم پولیس تک نہیں آسکتے؟''

''نہیں میں اپنے آفس میں ہوں، جان سن نے سرگوشی کی وہ باہر کے دو دروازے کھول چکے ہیں۔ صرف آخری کمرے کا دروازہ مقفل رہ گیا ہے۔ انہوں نے مین سوئچ سے بجلی بھی بند کردی ہے۔''

''آل رائٹ۔'' مائیکل نے کہا۔ ''میں آرہا ہوں۔''

دس منٹ کے اندر اندر۔''

''دس منٹ؟'' جان سن نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر فون بند ہوچکا تھا اور قاتل اب ساتھ والے کمرے میں تھے۔

جان سن نے اِدھر اُدھر دیکھا..... نہیں..... گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ کرنا ہے وہ خود مجھے کرنا ہے۔ دس منٹ بعد جب پولیس آئے گی تو انہیں میری لاش ملے گی۔ اس کی نظر ٹیپ ریکارڈر پر گئی۔ اس نے لائٹر جلایا اور ایک بٹن دبادیا۔

''بجلی ابھی آجائے گی برک۔'' اس نے پرسکون صاف آواز میں کہا۔ ''تم اپنی بات کہتے رہو۔''

لیکن ٹیپ خاموش رہا۔ ٹیپ ریکارڈ بجلی کے بغیر لاش کی طرح بے جان پڑا تھا مائی گارڈ جان سن نے گھبراہٹ اور مایوسی کی شدید یلغار سے بچنے کی کوشش کی۔ وہ اب جان سن کے کمرے کا قفل کھولنے والے تھے مگر غالباً اس کی آواز سن کر رک گئے تھے۔ جان سن کی نظر ٹیپ ریکارڈ کے ایک بٹن پر گئی مدھم سی روشنی میں نے ایک طرف ''اے سی'' اور دوسری طرف ''بیٹری'' کے حروف پڑھے بٹن کو بیٹری کی طرف کرتے ہی ٹیپ چلنے لگا۔

''تم سمجھتے ہو میں وہم کا مریض ہوں میرا دماغ خراب ہے۔ کیا تم بھی ان سب کے ساتھ مل گئے ہو جو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

جان سن نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا کہ جواب میں اس نے کیا کہا تھا۔ ''آخر کسی کو کیا ضرورت ہے تمہیں قتل کرنے کی برک۔''

''پولیس.....؟'' ٹیپ سے برک نے چیخ کر کہا ''پولیس خود مجھے شوٹ کردینے کے لیے بہانہ تلاش کررہی ہے۔ میرے دشمن پولیس کو خرید چکے ہیں۔ میں بینک کے سامنے سے بھی گزرا تو وہ مجھے گولی ماردیں گے کہ میں ڈاکا ڈال کر نکلا تھا اور بینک کے نشان زدہ نوٹ میری جیب سے

برآمد کر کے دکھادیں گے تم سن رہے ہو یا نہیں؟''

''میں سن رہا ہوں ٹیپ پر ہی جان سن کی آواز آئی جان سن کا ہاتھ بجلی کی طرح آگے بڑھا اسے یاد آ گیا تھا کہ اگلا جملہ کیا ہے ''میں ٹیپ بھی کر رہا ہوں۔'' جملہ بروقت کٹ گیا اور جان سن نے اپنی آواز میں کہا۔ ''تم کہتے جاؤ۔''

دروازے کا قفل کھولنے والے اب خاموش کھڑے تھے۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ اندر جان سن کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

''اور وہ میرا نوکر نمک حرام جانتے ہو اس نے کیا کیا؟ اس نے میرے کھانے میں زہر ملا دیا لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں، ڈاکٹر جتنا نظر آتا ہوں میں تاڑ گیا مار مار کے میں نے اس کی ہڈیاں توڑ دیں، حرامزادہ۔''

قدموں کی چاپ واضح طور پر دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی پھر کیرل کے کمرے سے ان کے اندھیرے میں ٹھوکر کھانے کی آواز آئی۔ ویٹنگ روم میں کوئی سنٹر ٹیبل سے ٹکرایا۔ جان سن سانس روکے گوش برآواز رہا۔ بھاری قدم کاریڈور میں سنائی دیے اور مکمل سناٹے میں یہ آواز بھی کم ہوتے ہوئے ڈاکٹر کے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز میں دب گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور کرسی پر گر پڑا۔ اسی وقت کمرہ وال لائٹ سے روشن ہو گیا اور باہر سے مائیکل نے کہا ڈاکٹر جان سن تم اندر ہو ابھی تک؟''

''باسٹرڈ'' اس نے چلتے چلتے زور سے کہا۔ قریب سے گزرنے والے ایک بوڑھے نے چونک کر اسے دیکھا اور مخاطب خود کو نہ پا کر آگے نکل گیا جان سن نے خفت سے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی اور خدا کا شکر یہ ادا کیا کہ یہ گالی کسی اور نے نہیں سنی تھی جو اس نے مائیکل کو دی تھی اور گالی دیتے وقت بھول گیا تھا کہ سڑک پر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شدید اعصابی کشیدگی کے باعث مٹھیاں سختی سے بند کیے ہوئے ہے اس کے چہرے کے خطوط کھنچ گئے ہیں اور تیز تیز چلنے سے اس کا سانس پھول گیا ہے۔ خداوند اس نے اپنے آپ سے کہا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں کیا مائیکل ٹھیک کہتا ہے کہ ذہنی امراض کا علاج کرتے کرتے میں بھی ذہنی مریض ہو گیا ہوں، نہیں یہ تو ممکن ہے کہ بجلی فیوز اڑ جانے سے چلی گئی ہو لیکن جو کچھ اس کے بعد ہوا وہ میرے وہم کا کرشمہ نہیں تھا لفٹ بجلی جانے سے قبل ہی بند ہو چکی تھی اور اندھیرے میں ٹارچ کی وہ روشنی، سردی کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ مائیکل صرف اس لیے یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ دروازے توڑے نہیں گئے تھے ان کے تالے کھولے گئے تھے اور یہ کام چابی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا اگر کسی نے تیسری چابی بنوائی ہوئی تو تالے کے سوراخ میں پیرافین کے آثار ضرور ملتے۔ ''ڈاکٹر جان سن'' مائیکل نے کہا تھا۔ ''تم دوسرے برک بن گئے ہو جسے ہر طرف قاتل دکھائی دیتے ہیں لیکن اس طرح تم بچ نہیں سکو گے میں اس بے سروپا بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اتنے اہتمام کے بعد آخری دروازے تک رسائی حاصل کرنے والے ایک ٹیپ کی آواز سن کر بھاگ گئے۔''

''یہ پاگل پن کی بات نہیں۔'' اس نے کامل اعتماد کے ساتھ کہا۔

مائیکل کی مخاصمت ہے جو حقیقت کو بھی میرا وہم ثابت کرنے پر کمر بستہ ہے اس سے مدد کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ اپنی زندگی کی حفاظت خود مجھے کرنی ہوگی اور بشرط زندگی خود ہی معلوم کرنا پڑے گا کہ بے سبب اس کی جان کا دشمن ہو جانے والا کون ہے؟ لیکن وہ اس چکر میں پڑ گیا تو ان سب کا کیا بنے گا جو اس کی مدد کے محتاج ہیں؟ پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ کسی سراغ رساں کی خدمات حاصل کر لے۔ ٹیلی ویژن پر اور فلموں میں اور جاسوسی ناولوں میں اس نے پرائیویٹ سراغ رسانوں کو بڑے بڑے پیچیدہ جرائم کا سراغ لگاتے دیکھا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پرائیویٹ سراغ رساں کا کردار محض افسانوی ہے یا حقیقت میں کوئی وجود رکھتا ہے۔ یہ بات اسے مضحکہ خیز حد تک ڈرامائی بھی لگتی تھی کہ وہ کسی پیشہ ور سراغ رساں سے اپنے نادیدہ قاتلوں کو گرفتار کرانے کے لیے کہے۔ لیکن ڈرامہ یقیناً ہو رہا تھا بے حد پراسرار قسم کا خونی ڈرامہ اور ٹریجیڈی یہ تھی کہ پولیس اس وقت تک کچھ ماننے کے لیے تیار نہ تھی جب تک جان سن سچ مچ قتل نہ ہو جائے ایسی کی تیسی دنیا کی اگر مجھے یقین ہے کہ خطرے کا احساس میرا وہم نہیں ہے تو مجھے اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کرنے کا حق حاصل ہے اس نے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ میں گھس کر زرد صفحات میں پرائیویٹ سراغ رساں اداروں کے

نام دیکھنے شروع کیے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس میں متعدد نام پتے اور فون نمبر موجود ہیں اسے بالکل علم نہ تھا کہ ان میں سے کون قابل اعتماد ہوسکتا ہے اور کس کی شہرت زیادہ ہے محض وقت بچانے کے لیے اس نے قریب ترین ایجنسی کا پتا نوٹ کیا نارمن موڈی۔

چند منٹ بعد اس نے سڑک عبور کی اور ایک عمارت کی تیسری منزل پر جا پہنچا ایک دروازے پر نارمن موڈی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے نہایت فضول سی بات لکھی تھی ''عدم اطمینان کی صورت میں فیس واپسی کی ضمانت دی جاتی ہے۔'' دروازے کی دوسری جانب اس سے بھی زیادہ فضول نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔ گھنٹی یا دروازہ بجانے کی ضرورت نہیں اندر تشریف لے آیئے۔'' نارمن واقعی موڈی آدمی لگتا تھا اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

دفتر کی خستہ حالی اور بے سروسامانی دیکھ کر جان سن کو احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گیا۔ ماحول آدمی کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ شاید یہی انتشار اور بے ترتیبی اس کے خیالات میں بھی ہوگی۔ اس نے پرانے قالین اور گرد آلودہ فرنیچر، ہر طرف بکھرے ہوئے پرانے اخباروں اور کتابوں کے ڈھیر اور خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار کو افسوس ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

ایک وسیع و عریض میز کے پیچھے جس پر زمانے بھر کا کباڑ جمع تھا نارمن کی بے پناہ شخصیت براجمان تھی۔ اس کا طول و عرض ایک جیسا تھا مختصر قد مشکل سے ساڑھے پانچ فٹ ہوگا چنانچہ اسے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ دونوں بازوؤں کے درمیان فٹ کیسے ہوا اور اب اس شکنجے میں سے اس کے نکلنے کی صورت کیا ہوگی۔ اس کا گول مٹول چہرہ کسی بچے کے چہرے کی طرح تھا۔ معصوم اور مسکراتا ہوا جو کسی مجرم کے لیے ذرا بھی ضرر رساں نہ لگتا تھا۔ اس کی گول آنکھیں پلک جھپکنے بغیر جان سن کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں، میں ڈاکٹر جان سن ہوں۔'' جان سن نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ مصافحے کے لیے اسے آگے جھک کر نارمن کا ہاتھ تھامنا پڑا نارمن کا چہرہ اس تعارف کے بعد بھی نارمل رہا جان سن کو اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی خالی نظر نہ آئی۔

''ڈاکٹر جان سن؟'' نارمن نے کہا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں علاج وغیرہ کرتے ہیں یا دوسری قسم کے ڈاکٹر ہیں پی ایچ ڈی وغیرہ۔''

جان سن کو اس شخص کی کم علمی پر افسوس ہوا ہفتہ بھر سے اس کا نام اخبارات کی سرخیوں میں شامل تھا اور اس کی تصویر ہر خبر کے ساتھ شائع ہو رہی تھی۔ ''میں ماہر نفسیات ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا۔ ''مجھے آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔''

''مشورے کی فیس ہے پچاس ڈالر۔'' نارمن نے بیئر کی ایک بوتل سے منہ لگا کے دو گھونٹ لیے۔ ''ایڈوانس۔''

جان سن نے جیب سے پچاس ڈالر نکالے اور میز پر ڈال دیے۔ ''کیا اب میں بیٹھ سکتا ہوں۔'' جان سن نے ناگواری سے کہا۔

''یس۔'' نارمن نے کہا ''اس کرسی پر سے تمام سامان فرش پر گرا دیجیے یا اسی سامان پر بیٹھ جایئے جیسی آپ کی مرضی ہو۔'' جان سن نے کرسی پر سے سنسنی خیز تصویروں والے رسالے نیچے گرائے اور بیٹھ گیا اپنے مسئلے کو اس نے کم سے کم الفاظ میں پیش کیا۔ نارمن سنتا رہا اور وقفے وقفے سے بیئر کے گھونٹ لیتا رہا۔

''آپ کے مسئلے کے دو اہم پہلو ہیں۔'' نارمن موڈی نے اپنے تین سو پونڈ وزن کے جسم کو حیرت انگیز آسانی کے ساتھ کرسی سے نکال لیا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر لڑھکنے کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ ''ایک یہ کہ کیا واقعی کوئی آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے دوسرا یہ کہ کیوں آپ کے کہنے کے مطابق وجہ کوئی نہیں لیکن بغیر وجہ کے دنیا میں کوئی بات نہیں ہوتی۔'' وہ ایک گھونٹ لینے کے لیے رکا۔ ''کوئی نامعلوم شخص ہے جو آپ کو مارنے پر تلا ہوا ہے چنانچہ پہلے اس بات کا یقین کر لینا ضروری ہے کہ یہ آپ کا وہم نہیں۔ کار ہے آپ کے پاس؟ اور ہے تو چل پھر لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے لمبے سفر کا برا تو نہیں مانتی؟''

اس غیر متوقع غیر سنجیدہ سوال نے جان سن کو حیران کر دیا۔

''میرے پاس بالکل نئی مرسیڈیز ہے۔''

''گڈ۔'' نارمن نے کہا ''اب آپ ٹمبکٹو چلے جایئے۔ یا کٹھمنڈو جہاں آپ کا دل چاہے کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک۔''

''میں اس مذاق کا مطلب نہیں سمجھ سکا مسٹر نارمن۔''
جان سن نے برہمی سے کہا۔ ''آپ کے نزدیک مسئلے کا یہ حل ہے کہ میں فرار ہو جاؤں تو مجھے اپنے پچاس ڈالر ضائع ہونے کا افسوس ہے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''لیکن نارمن نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پھر بٹھا دیا۔ اس کے پہاڑ جیسے جسم کو زلزلے کی زد میں دیکھ کر جان سن کو پتا چلا کہ وہ ہنس رہا ہے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم سچ مچ چلے جاؤ، بس ایک پروگرام بنا ڈالو، تمام متعلقہ اور غیر متعلقہ افراد کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دو، یہ بھی بتا دو کہ تم کب اور کس وقت جا رہے ہو، سفر ہوائی جہاز سے کرو گے یا بحری جہاز سے پھر ہم دیکھیں گے کہ اس جہاز سے اور کون ٹمبکٹو یا ٹمنڈو روانہ ہوتا ہے۔ ہم سے میرا مطلب ہے ہم دونوں۔'' نارمن نے کہا۔

وہ تاثر جو دفتر کی زیبوں حالی اور نارمن کی مضحکہ خیز شخصیت نے قائم کیا تھا جان سن کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ وہ نارمن کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔

''رائٹ'' جان سن نے کہا ''اب فوری طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اب یہاں سے نکل کے تم سیدھے سروس اسٹیشن چلے جاؤ، جہاں سے تم ہمیشہ اپنی کار کی سروس کراتے ہو، وہاں اعلان کرو کہ تمہیں صبح ایک طویل سفر پر جانا ہے۔ چنانچہ گاڑی کو رات بھر میں اچھی طرح چیک کر لیا جائے تاکہ راستے میں تمہیں کوئی دشواری نہ ہو، پھر اپنے گھر سے سارے مریضوں کو فون پر مطلع کرو کہ تمہیں ایک مجبوری کے باعث اچانک باہر جانا پڑ رہا ہے اور تم ہفتہ بھر بعد مل سکو گے یہی خبر اپنے دوست احباب کو دو اور آخری بات یہ کہ پچاس ڈالر یومیہ تم مجھے ادا کرو گے۔ دو سو ڈالر اضافی اخراجات کے لیے دو گے مثلاً مجھے تمہارا تعاقب کرنے والوں کے تعاقب میں اپنا ایک آدمی لگانا پڑے گا۔'' نارمن نے فٹ بال کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ جان سن نے طے کیا کہ اگر اس الجھن اور پریشانی سے نجات پانے اور مائیکل کے انتقام سے اور ہوائی سے بچنے اور کیرل کے قاتلوں کا پتا چلانے کے لیے اسے دو ہزار ڈالر بھی خرچ کرنے پڑیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔

حسب ہدایات اس نے کار کو سروس اسٹیشن پر چھوڑا اور گھر پہنچ کے اپنی ڈائری سے نمبر دیکھ کر فون کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس کام سے فارغ ہوا تو اسے پولیس کا خیال آیا مائیکل اس کے اچانک چلے جانے کو فرار سمجھے گا اور عین ممکن ہے اس کے لیے وارنٹ جاری کرا دے کہ وہ جہاں ملے گرفتار کر کے واپس لایا جائے اس نے پولیس آفس کا نمبر ملایا۔ ''سارجنٹ اینجلو پلیز۔'' اس نے ریسیور اٹھانے والے سے کہا۔

''سوری سر، وہ بیمار ہیں۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''تھینک یو مجھے ایک پرائیویٹ کام تھا۔'' جان سن نے کہا اگر ان کے گھر کا نمبر مل جائے۔''

سارجنٹ اینجلو کی آواز نزلے سے بھاری ہو رہی تھی۔

''ڈاکٹر جان سن؟'' اس نے کہا اور ایک چھینک ماری۔ ''سوری کل سے مجھے زکام چمٹا ہوا ہے۔''

''میں تمہیں ڈسٹرب نہ کرتا۔'' جان سن نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے ایک اطلاع دینی تھی۔ جو میں نے مائیکل کی بجائے تمہیں دینا بہتر سمجھا میں صبح ایک ہفتہ کے لیے جا رہا ہوں۔ نہیں مقصد کوئی نہیں بس کچھ مصروفیت اور کچھ مسلسل پیش آنے والے حادثات نے میرے اعصاب کو متاثر کیا ہے۔ تھوڑے سے آرام سے اور تفریح سے فائدہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اینجلو نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔ ''میں مائیکل سے بات کر لوں گا لیکن مناسب ہوگا کہ ان حالات میں تم اپنا پتا چھوڑ جاؤ تاکہ ضرورت پڑے تو تم سے رابطہ قائم ہو سکے۔ گو امکان تو نہیں لیکن احتیاط بہتر ہے۔''

جان سن نے سب کو اپنی منزل ساحل سمندر کی ایک تفریح گاہ بتائی تھی جہاں وہ پہلے بارہا جا چکا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کس ہوٹل میں قیام کرے گا۔ ''ڈاکٹر جان سن۔'' اینجلو نے پتا نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ ''ذرا محتاط رہنا دشمنوں سے۔''

''تھینکس اینجلو۔'' جان سن نے کہا اسے ان الفاظ نے بڑا سہارا دیا تھا کم سے کم ایک شخص تو تھا جو سمجھتا تھا کہ

خطرہ اس کا وہم نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ نارمن موڈی سے مل کر اس کے تفکرات کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔ رات وہ بڑے سکون سے سویا صبح اس نے اپنے چند کپڑے اور ضرورت کا کچھ سامان ایک سوٹ کیس میں ڈالا اور ناشتے سے فارغ ہوکے نکلا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ نیچے پارکنگ ایریا میں اس کی کار عمارت کے دوسرے مکینوں کی کاروں کے ساتھ قطار کے آخر میں تیار کھڑی تھی۔ سروس اسٹیشن والوں نے بڑی پابندی وقت کے ساتھ رات بھر میں اپنا کام ختم کرلیا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کو پیچھے والی سیٹ پر ڈالا اور کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابیاں سوئچ میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ بڑھا کر انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے کسی نے ایک انگلی سے شیشے کو بجایا اور اس نے چونک کر دیکھا۔ نارمن موڈی کا مسکراتا ہوا گول چہرہ کھڑکی سے چپکا ہوا تھا۔

جان سن نے شیشہ نیچے کیا۔

''گڈ مارننگ مسٹر نارمن۔'' جان سن نے شگفتگی سے کہا۔ ''آپ اتنی صبح یہاں؟''

''میں خدا حافظ کہنے آیا تھا۔'' نارمن نے کہا۔ ''ابھی چند سیکنڈ میں آپ سفر آخرت پر روانہ ہونے والے تھے۔

اس نے جان سن کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور انجن کا بونٹ کھولا جان سن کی حیرت زدہ نگاہوں نے جانے پہچانے انجن میں ایک تبدیلی کو فوراً نوٹ کرلیا اسٹارٹنگ سوئچ سے دو پتلے پتلے تار ڈسٹری بیوٹر تک پہنچ رہے تھے۔ جہاں تین ڈائنامیٹ اسٹک لپٹی ہوئی رکھی تھیں اگر جان سن چابی گھما دیتا تو انجن اسٹارٹ کرنے کی بجائے چنگاری بارود کے اس ڈھیر کو اڑا دیتی۔ سروس اسٹیشن والے آزمودہ اور قابل اعتماد لوگ تھے لیکن وہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا اور کام میں مصروف درجن بھر میکانک اپنے جیسے حلیے کے کسی اجنبی کو شناخت نہیں کرسکتے تھے جو انہی کی طرح کسی کار کے اٹھے ہوئے بونٹ میں سر چھپائے اپنا کام کرنے میں لگا ہوا ہو لیکن کار کو سروس کے بعد اسٹارٹ کر کے چیک کیا گیا ہوگا اور یہاں تک چلا کے لایا گیا ہوگا اس نے نارمن موڈی کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے بدستور مسکرا رہا تھا۔

''آپ یہاں کس وقت پہنچے تھے؟'' جان سن نے مشتبہ لہجے میں سوال کیا۔

''ابھی کوئی آدھے گھنٹے پہلے۔'' نارمن نے کہا۔

''لیکن میں نے یہاں کسی کو بھی نہیں دیکھا جس پر میں شبہ کرسکتا۔''

''مسٹر نارمن۔'' جان سن نے پرسکون رہتے ہوئے کہا ''کسی نے یہ کار روائی گاڑی کے سروس اسٹیشن سے آجانے کے بعد کی ہے رات تک کار میرے پاس تھی اور رات کو کسی وقت سروس اسٹیشن کا کوئی آدمی اسے چلا کر ہی یہاں لایا ہوگا۔''

''یس۔'' نارمن نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ انجن میں ڈال دیا اور جھٹکے سے ایک تار الگ کردیا۔ ''مگر یہ اس کی حرکت نہیں ہوسکتی۔ اسے معلوم ہوگا کہ تفتیش شروع ہوئی تو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ ڈاکٹر کی کار چھوڑنے کون گیا تھا۔'' اس نے دوسرے تار کو بھی جدا کیا اور ڈائنامیٹ کے بنڈل کو جیب میں رکھ لیا۔

''بہتر ہوتا اگر ہم کسی چیز کو نہ چھیڑتے۔'' جان سن نے کہا۔ ''مائیکل خود دیکھ لیتا۔''

نارمن ہنسا اور اس کے بدن کا سارا گوشت تھرتھرانے لگا وہ یقیناً بہت خوش ہوتا اس منظر سے مگر وہ تم سے یہ ضرور سوال کرتا کہ ڈاکٹر جان سن یہ سامان آتش بازی آپ نے کہاں سے خریدا؟ تم اس سوال کا کیا جواب دیتے؟''

اس سوال کا جواب ڈاکٹر جان سن کے فرشتے بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن یہ سوال ناگزیر تھا کیونکہ مائیکل ذہنی طور پر جان سن کے معاملے میں ہر سیدھی بات کا الٹا مطلب نکالنے پر مجبور تھا۔ ویری گڈ جان سن شبہ تمہیں کسی پر نہیں دیکھا کسی نے کسی کو نہیں کیسا خوب صورت اتفاق ہے کہ رات کو گاڑی سروس ہو کر آئی اور صبح عظیم ماہر نفسیات نے سراغ رسانی کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ذات پر قاتلانہ حملے کا ایک اور ثبوت فراہم کردیا۔ اچانک تفریح کا پروگرام بنا لینا گویا اس سنسنی خیز افسانے کا حرف آغاز تھا۔

جان سن نے بڑی بددلی کے ساتھ سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر سے اٹھا لیا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ یہ سب نارمن کا ڈرامہ تو نہیں تھا خود ڈائنامیٹ لگانا اور خود سازش کا انکشاف کر کے ایک طرف اپنی سراغ

رسائی کی صلاحیت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کردیا اور دوسری طرف جان سن کا اعتماد حاصل کر کے اسے کسی مناسب موقع پر ٹھکانے لگادینا۔ آخر اتنی صبح وہ یہاں کیوں آیا؟ کیا رات کو اس پر وحی نازل ہوئی تھی کہ فلاں جگہ فلاں کار میں کسی نے انجن میں ڈائنامائیٹ لگادیا ہے اس نے اپنا سر تھام لیا۔ آخر یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ کل تک میں نارمن یا کسی بھی پرائیویٹ سراغ رساں کے نام سے ناآشنا تھا میں نے از خود اس کا نام ڈائریکٹری میں سے تلاش کیا تھا یہ بات ابھی تک کسی کے علم میں بھی نہ تھی پھر یہ سوچنا کہ نارمن جس نے اسے تحفظ فراہم کرنے کی فیس وصول کی ہے وہی اس کی جان کا دشمن ہے دیوانگی نہیں تو کیا ہے میں برک کے نقش قدم پر چل رہا ہوں اور یہ راستہ سیدھا پاگل خانے لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر جان سن ماہر نفسیات لیکن وہم کا مریض شیزوفرنک پیرونیک جسے اپنے پرائے سب دشمن جاں لگتے ہیں۔

”ڈاکٹر جان سن۔“ نارمن نے کار کی سائیڈ کا سہارا لے کر جیب سے ایک سگار برآمد کیا وہ کار جس نے تمہیں کچلنے کی کوشش کی تھی ایک اور شخص نے بھی دیکھی تھی۔ مسٹر بین سن نے وہ اپنے بہنوئی کے لیے دوا لینے گیا تھا اور دوا پہنچا کے اپنے گھر جانے کے لیے زینے سے اتر رہا تھا کہ اس نے کار کو ٹکر مارتے دیکھا وہ تمہاری مدد کے لیے دوڑا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اچانک آجانے سے تمہاری زندگی بچ گئی ورنہ کار تمہیں کچلنے کے لیے واپس ہو رہی تھی بین سن کو دیکھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے میں بین سن سے ملا تو اس نے حرف بحرف تمہارے بیان کی تائید کی۔“ جان سن نے سر سے ایک بہت بڑے بوجھ کو ہلکا ہوتے محسوس کیا بات اب اس کے وہم کی نہیں رہی تھی۔ وہ مائیکل کے سامنے ایک چشم دید گواہ پیش کرسکتا تھا۔ جس نے اپنے حوصلہ شکن رویے سے جان سن کی خود اعتمادی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

”ایک بات ابھی بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ نارمن موڈی نے دھوئیں کا بادل پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر دو افراد تمہیں قتل کرنے کی نیت سے عمارت کا فیوز اڑا کے لفٹ کو ناکارہ بنا کے اور دو دروازوں کے تالے کھول کر اندر پہنچ گئے تھے تو انہوں نے تیسرا تالہ کیوں نہیں کھولا؟ اگر

naeyufaq.com
آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل
ماہنامہ
حجاب کراچی
محبت نفرت کی آمیزش سے مزین ناقابل فراموش کہانیاں
عشق دی بازی
خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے
ریحانہ آفتاب کے نوک قلم نکلی ایک خوب صورت تحریر
عشق نگر کے مسافر
ایک حادثے نے اسے عشق نگر کا مسافر بنادیا
ندا حسنین کی دلکش اور مدتوں یاد رہ جانے والی کہانی
آنگن کی چڑیا
قارئین کے تعارف پر مبنی سلسلہ
عالم میں انتخاب
ہر ماہ ایک شاعر کا انتخاب
اس کے علاوہ
بزم سخن، کچن کارنر، دوست کا پیغام آئے، منتخب اشعار، غزلیں، اقتباسات اور دیگر قارئین کی دلچسپی کے مدنظر مستقل سلسلے
Info@naeyufaq.com
(021)35620771/2
0300-8264242

قاتل اکیلا ہوتا تو دو افراد کو مصروف گفتگو پا کے واپس جا سکتا تھا لیکن تمہارا اصرار ہے کہ حملہ آور دو تھے ان کے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی وہ ایک کی جگہ دو قتل کر سکتے تھے۔ انہیں دیکھنے والا کون تھا۔'' کچھ دیر وہ دونوں خاموشی سے اپنے اپنے خیالات میں گم کھڑے رہے پھر نارمن نے کہا۔

''ڈاکٹر جان سن اگر قاتل ایک فرد نہیں تھا تو یہ بھی ممکن ہے کہ دو نہ ہوں تین ہوں یا اس سے بھی زیادہ مگر جو تمہارے دروازے تک پہنچے وہ صرف دو تھے باقی دیگر انتظامات میں شریک رہے یا پہنچے انتظار کرتے رہے۔''

جان سن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''مسٹر نارمن پیشہ ور بدمعاشوں اور غنڈوں کے گروہ کا مجھ سے کیا تعلق۔''

''تم نے اپنے مجرمانہ ذہن رکھنے والے مریضوں کے کسی بھی غلط فہمی یا دیوانگی پر مبنی خیال کے باعث دشمن ہو جانے کے امکانات کا جائزہ لیا ہے؟'' نارمن نے کہا۔

جان سن نے اسے مختصر برک اور ٹیری برن کے علاقہ زیفرن کیس کے بارے میں بتا دیا۔ ''ان کے علاوہ بہت پرانے کیس دو ہیں۔'' جان سن نے کہا ایک مریض کو یقین تھا تھا کہ خدا نے اسے دنیا میں بدی کا خاتمہ کرنے کا مشن سونپا ہے اور بدی کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بدکار کو ختم کر دیا جائے اس نے میرے سامنے متعدد افراد کے قتل کا اعتراف کیا لیکن اس کا کہنا تھا کہ جو کچھ اس نے کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہ فیصلہ خدا کا تھا جسے تسلیم نہ کرنے کا اختیار اسے نہیں تھا اس کے پاس خدا کے یہ احکامات ایک فرشتے کے ذریعے پہنچے تھے جو اسے خواب میں نظر آتا تھا۔ مثلاً اس نے ایک فلم دیکھی بقول اس کے ہیرو اور ہیروئن نے سب تماشہ دیکھنے والوں کے سامنے سرعام فحاشی کا مظاہرہ کیا کہ بدکار ٹھہرے فیصلہ اس کے اپنے ذہن کا تھا مگر اس نے کہا کہ خدا نے رات کو فرشتے کی معرفت ان دونوں بدی پھیلانے والوں کو ختم کر دینے کا حکم پہنچایا اور اس نے تعمیل کی دو ماہ کے اندر اندر اس نے دونوں کو تلاش کیا اور موقع ملتے ہی مار دیا۔ وہ چھ افراد کو خدا کے حکم پر قتل کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کے اعتراف جرم کے بعد میں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا وہ ذہنی مریض ہونے کے باعث سزائے موت سے بچ گیا لیکن اب تمام عمر اس کے جیل خانے سے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے دوسرا کیس ایک عورت کا ہے جس کے ساتھ بچپن سے عہد شباب تک حادثات کا ایک سلسلہ رہا اور اب وہ سمجھتی ہے کہ دنیا کا ہر مرد بنیادی طور پر وحشی درندہ ہے۔ جس کے لیے عورت اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کے ایک ذریعے کے سوا کچھ نہیں۔ جسے وہ زرخرید غلام یا طوائف سے زیادہ نہیں سمجھتا چنانچہ سب مرد بلا استثنیٰ گولی مار دینے کے قابل ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے اس عزم کے زبانی اظہار سے آگے آج تک کچھ نہیں کیا۔''

''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارے مریضوں میں سے کسی کا دوست یا عزیز یا کوئی خاندان کا فرد تمہارا مخالف ہو گیا ہو؟''

''اول تو یہ ممکن نہیں اور ایسی کوئی بات ہو تو اس کا علم مجھے کیسے ہو سکتا ہے۔'' جان سن نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ اب تک پارکنگ ایریا میں کار کے پاس کھڑے تھے۔ نارمن نے کہا۔ ''مجھے ایک کپ کافی کا پلاؤ میرا خیال ہے کہ تمہارے پیچھے ایک فرد نہیں ایک گروہ پڑ گیا ہے واردات کا ہر انداز اور مجرموں کا اعتماد یہی ظاہر کرتا ہے۔ گو وجہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ کل شام تک تفتیش کا نتیجہ سامنے آ جائے گا۔'' جان سن کو اس دعوے میں ضرورت سے زائد کسی حد تک مبالغہ آمیز اعتماد محسوس ہوا جس کا مقصد صرف جان سن کو مطمئن کرنا تھا کہ اس نے فیس ضائع نہیں کی۔

.....☆❁☆.....

پہلی بار فون خود اینجلو نے اٹھایا۔ جان سن نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اس کی کار میں ڈائنامیٹ لگا کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر نارمن موڈی نے اپنی ذہانت سے بروقت اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' اینجلو نے پوری توجہ سے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ ''تم نارمن موڈی کو پہلے سے جانتے ہو۔''

''نہیں۔'' جان سن نے کہا ''اس سے پہلے تو میں نے پرائیویٹ سراغ رساں کو ہمیشہ افسانوی کردار سمجھا تھا اس کا پتا میں نے ڈائریکٹری سے لیا تھا۔''

''میرا خیال ہے ڈاکٹر تم نے انتخاب سے قبل مجھ سے مشورہ کر لیا ہوتا تو میں تمہیں کسی ایسے شخص کا پتا بتا سکتا تھا جو

نارمن موڈی کی طرح عقل سے پیدل نہ ہوتا۔'' اینجلو نے کہا'' پرائیویٹ سراغ رساں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا ہے کوئی یہ نہیں کرتا کہ پولیس کو بتائے بغیر جرم کا سراغ تک مٹا دے۔ اسے کیا ضرورت تھی ڈائنامائیٹ نکال کر لے جانے کی؟''

''لیکن اس کا فائدہ بھی کیا تھا؟'' جان سن نے بوکھلا کر کہا۔

''تمہارے سوا اس پر یقین کون کرتا مائیکل تو الزام مجھے ہی دیتا۔''

''مائیکل کو گولی مارو۔'' اینجلو نے کہا۔ ''مجھے طریقہ واردات سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ سب تو نہیں مگر پیشہ ور مجرم اپنے انداز جرم سے ہی شناخت ہوجاتے ہیں۔ مثلاً کچھ قتل کے لیے خنجر استعمال کرتے ہیں تو کچھ ریوالور خنجر کے استعمال میں بھی زخم سے قاتل کے ماہر یا اناڑی ہونے کا پتا چل جاتا ہے اور خنجر کی ساخت معلوم ہوجاتی ہے۔ ریوالور ہو تو ریکارڈ سے دیکھا جاسکتا ہے کہ کسی مخصوص ریوالور کا استعمال کہاں کہاں ہوا تھا۔ پھر گولی مارنے والے نے دل کو نشانہ بنایا ہے یا سر کو اور ایک ہی گولی سے کام تمام کردیا ہے یا کئی بار فائر کیا ہے۔ ہم ہر مجرم کی عادت کو پہچانتے ہیں اس کے علاوہ کہیں نہ کہیں سے انگلیوں کے نشانات مل جاتے ہیں اور فنگر پرنٹ بیورو کا کمپیوٹر چند سیکنڈ میں بتا دیتا ہے کہ ریکارڈ پر یہ نشانات ہیں تو کس مجرم کے ہیں۔ ڈائنامائیٹ استعمال کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ عام آدمی کو خنجر یا ریوالور ہی مل سکتا ہے یا کچھ نہ ملے تو ڈنڈا۔ سریا پتھر وغیرہ اور ایش ٹرے گلدان جو ہاتھ میں آ جائے ڈائنامائیٹ کا استعمال بھی ہر شخص نہیں جانتا۔ ریکارڈ سے دیکھا جاسکتا تھا کہ سابقہ جرائم میں ڈائنامائیٹ کس کس نے استعمال کیا تھا۔ مجرم بننے سے قبل وہ لوگ کیا تھے۔ شاید ان میں سے کسی کا تم سے کوئی تعلق نکل آتا۔''

جان سن بے وقوفوں کی طرح سنتا رہا۔ ''آئی ایم سوری اینجلو اگر مجھے یہ سب معلوم ہوتا۔''

''بات تمہاری نہیں۔'' اینجلو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہارے منتخب کردہ پرائیویٹ سراغ رساں پر شبہ ہے اس نے جانتے بوجھتے یہ حرکت کی۔ صرف تمہیں بے وقوف بنا کر تمہارا اعتماد حاصل کرنے کے لیے۔''

جان سن بھونچکا رہ گیا یہی خیال اس کے ذہن میں بھی آیا تھا مگر اس نے اپنا وہم سمجھ کے جھٹک دیا تھا۔ لیکن اینجلو، نارمن کو کیا پڑی تھی مجھے بے وقوف بنانے کی اعتماد تو مجھے تھا اس پر ورنہ میں اسے فیس کیوں دیتا؟''

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی نے اس کو تم سے دس گنی فیس دے دی ہو؟'' اینجلو نے طنز سے کہا ''فیس لے کر کام چلانے والے پیسے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ تم نے اسے دو ہزار ڈالر دیے تھے اور مشرق کی طرف جانے کو کہا تھا تمہارے دشمن نے بیس ہزار دے دیے اور اس کا رخ مغرب کی طرف کردیا پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

''لیکن کسی کو کیا معلوم اینجلو کہ میں نے نارمن موڈی سے معاہدہ کیا ہے۔'' جان سن نے کہا ''سوائے تمہارے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔''

اینجلو ہنسا۔ ''ڈاکٹر جرائم کی دنیا میں تم اسپیشلسٹ نہیں ہو میں ہوں لوگ جو کسی کی جان کے درپے ہوتے ہیں اس کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھتے ہیں۔ کسی نے تمہیں نارمن موڈی کے پاس جاتے دیکھ لیا ہو اور بعد میں خود جا پہنچا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علم غیب کسی کے پاس نہیں ہوتا پھر نارمن کو کیسے معلوم ہوگیا کہ تمہاری کار میں کسی نے یوں ڈائنامائیٹ فٹ کردیا ہے۔ کیارات کو اس پر وحی نازل ہوئی تھی جو وہ صبح صبح پہنچ گیا اور کھٹ سے ڈائنامائیٹ نکال لیا کار میں ایک سو ایک مقامات پر ڈائنامائیٹ لگایا جاسکتا ہے اور ایسے نہیں کہ انجن کا بونٹ کھولا اور نظر آ گیا۔ نارمن موڈی نے صرف تمہیں متاثر کرنے کے لیے ایک بچکانہ ڈرامہ کھیلا ہے جس کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔''

''کیا؟'' جان سن نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا اس کے اپنے اندیشے تھے جن کا اظہار اینجلو کی زبان کر رہی تھی۔

''اب تم اس کی صلاحیت سے مرعوب ہوگئے ہو اور اسے یقین ہے کہ تم وہی کرو گے جو وہ کہے گا۔'' اینجلو نے کہا۔ ''وہ تم سے کہے گا کہ آدھی رات کو سر کے بل قطب شمالی پر آؤ تو تم جاؤ گے اور وہیں تمہارا کام تمام میری مانو تو ذرا محتاط رہو، نارمن موڈی سے تنہا مت ملو اور وہ کسی غیر آباد مقام پر بلائے تو ہرگز مت جاؤ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا

آگے تمہاری مرضی۔''

''تھینک یو اینجلو۔'' جان سن نے کہا ''میں یہ بات یاد رکھوں گا۔'' اور ریسیور رکھ دیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک سیدھی سادی بے خطر زندگی گزاری تھی جس میں اس کا کام لوگوں کی مدد کرنا تھا اور وہ اس کام سے ذہنی و مالی طور پر مطمئن تھا۔ لوگ اس کے پاس اپنے اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور وہ پوری ہمدردی کے ساتھ ان کی داستان حیات کا المیہ سنتا تھا اور کوشش کرتا تھا انہیں وہ راہ دکھاتا تھا جس پر چل کے وہ یقیہ زندگی ہنسی خوشی گزار سکیں۔ کامیابی اسے مسرت دیتی تھی اور ناکامی چیلنج فیس کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہتی تھی لیکن یکلخت اس کی پر سکون زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ اس جیسے بے ضرر شخص کا وجود بھی کسی کی نگاہ میں کھٹکنے لگا تو وہ آلہ قتل ہو جاتا ہے وہ اب تک سب کو دوست بناتا اور دوست سمجھتا آیا تھا۔ مگر اب اس کا واسطہ نارمن موڈی جیسے لوگوں سے پڑ گیا تھا۔ جو دوست بن کے دغا دیتے تھے اور قتل بھی کرتے تھے تو پورے اعتماد کے ساتھ ہمدرد بن کے محافظت کا یقین دلا کے اینجلو کی بات کو عقل تسلیم کرتی تھی مگر نہ جانے کیوں اس کا دل تذبذب کا شکار تھا۔ اسے نارمن موڈی ایسا آدمی نہیں لگتا تھا جو صرف پیسے کی خاطر اسے دشمنوں سے بچانے کا وعدہ بھول جائے اور صف دشمناں میں شامل ہو جائے اس کا علم نفسیات آدمی کو پہنچاننے میں اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا تھا کہ اسے تمیز رہبر و راہزن نہ ہو اس کی نظر قاتل کو نہ شناخت کر سکے قاتل کا تو چہرہ گواہی دیتا ہے کہ اس کی فطرت خوں آشام ہے اور نارمن کا چہرہ کسی بچے کی طرح معصوم تھا شاید یہی فریب نگاہ کی بات تھی کہ کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ بازی گر کھلا دھوکا دیتے ہیں اور بھیڑ کے لباس میں بھیڑیے گھومتے ہیں۔

دوپہر سے شام تک وہ مریضوں میں الجھا رہا۔ وہی زندگی کے مسائل، فریب آرزو اور فریب خیال کی باتیں محرومیوں کی داستاں رقابتوں کے سلسلے، نفرتوں کا خوف اور ناکامیوں کے اندیشے غم جاناں غم دوراں، ازل سے ابد تک آدمی کو مقدر پر اختیار نہ ہونے کا شکوہ رہے گا۔ گلہ رہے گا کہ دست قدرت نے پھول اور کانٹے دکھ سکھ دھوپ چھاؤں اور نشیب و فراز کا تناسب ہر جگہ سب کے لیے یکساں کیوں نہیں رکھا۔ سب سے آخر میں رخصت ہونے والی ٹیری برن تھی جیسے یہ صدمہ روگ بن کر چمٹ گیا تھا کہ سارے دنیا کے مرد بھی اس کے لیے ناکافی ہیں خواہ وہ دیوار چین سے بھی طویل تر قطار بنائے منتظر ساعت وصل ہوں، کاش وہ آخری وقت میں آ کے اس کے تھکے ہوئے خالی ذہن کو اپنے ذہن کی غلاظت سے بھرنا چھوڑ دے اسے جو بکنا ہو شروع میں آ کے بک جایا کرے جب وہ تازہ دم ہوتا ہے اور سب کچھ سننے کا تحمل ہو سکتا ہے۔ آخری وقت میں الزبتھ کے حسن بے مثال کی دید اور اس کے قرب کے احساس کی لذت اس کی موجودگی میں ملنے والی پر سکون راحت، ادھر خواہش اظہار تمنا ادھر خیال ترک مدارات کا ڈر، مگر اس کے برعکس ملتی ہے ٹیری جو زبردستی جان سن کو آبروریزی پر کمربستہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کے وحشت ترین زبان میں مردوں کے لشکر جرار کو جنسی شکست دینے کے قصے سنانے آتی ہے کیسا زمین و آسمان کا فرق ہے ان دونوں عورتوں میں ایک صبح بہار کی پہلی خوشبو ہے۔ دوسری کٹر سے البتی غلاظت کی بو اک ہتھیلی کی حنا ہے دوسری دست قاتل کا لہو، جان سن کی قوت برداشت اب جواب دینے لگی تھی۔ ٹیری کینسر کی طرح تھی جس کا کوئی علاج نہ تھا اس نے طے کیا کہ وہ ٹیری کو آئندہ کے لیے سختی سے پھر نہ آنے کی تاکید کر دے گا اپنے مطلب کا کوئی ڈاکٹر ملتا ہے تو اس کے پاس جائے اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''جان سن۔'' لوزا کی آواز آئی۔ ''لہجے سے یہ تاثر کیوں دینا چاہتے ہو کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔''

جان سن ہنس پڑا۔ ''لوزا، میں بالکل ٹھیک ہوں بس ایسے ہی کچھ بیزار بیٹھا تھا۔''

''اس بیزاری کا علاج تو تمہارے بہت سے مریضوں کے پاس ہوگا۔'' لوزا نے شرارت سے کہا۔

''یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو۔'' جان سن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ابھی ابھی ٹیری میرا علاج کرنے آئی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ''لوزا تم تو فلمی معلومات کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا ہو یہ بتاؤ اتنی کامیاب اداکارہ نے یکلخت اداکاری کو خیر باد کیوں کہہ دیا

تھا۔ جب اس کی شہرت وعزت اپنے عروج پر تھی۔''

جواب میں لوزا کی شوخ ہنسی سنائی دی۔ ''تم مجھے الو بنانا چاہتے ہو یا خود کو الو ثابت کرنا چاہتے ہو، یہ بات کون نہیں جانتا۔''

''خدا کی قسم لوزا۔'' جان سن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم اس نے مجھے نہیں بتایا آج تک۔''

''اچھا۔'' لوزا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''وہ جلا وطنی پر مجبور ہوگئی تھی اس پر قتل کا الزام تھا۔''

جان سن حیرت سے سن رہ گیا، ''قتل کس کا قتل؟''

''اس نے تمہیں بتایا ہے کہ اس کا چھٹا شوہر ایک مد تھا۔'' لوزا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''نہیں تمہارا مغلطب ہے باقی پانچ نہیں باقی چھ یہ تو ساتویں شادی ہوئی نا اس کی؟'' جان سن نے گڑبڑا کر کہا۔

''ہاں۔'' لوزا بولی۔ ''وہ ہیری کی طرح نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹیری کو قتل کرتا ٹیری نے اسے قتل کر دیا۔ مگر اس معاملے کو دبا دیا گیا کیونکہ ٹیری قانون کی گرفت میں آجاتی تو ان سب فلموں کا کیا بنتا جو زیر تکمیل تھیں اور جن میں بڑے بڑے فلمسازوں کے کروڑوں ڈالر پھنسے ہوئے تھے ٹیری ان سب کی ہیروئن تھی۔ ٹیری کو بچالیا گیا مگر اسے نئے معاہدے ملنے بند ہوگئے۔ سب ڈرتے تھے کہ کل کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس سے وہ مصیبت میں پڑ جائیں زیر تکمیل فلمیں بھی بڑی عجلت میں مکمل کی گئیں، اور ٹیری کو ہالی ووڈ سے روم بھیج دیا گیا اور روم سے نہ جانے کس گمنام جگہ کیونکہ ٹیری کے مخالف حریف اور حاسد اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔''

''تمہیں اتنی تفصیلات کا علم کیسے ہوا؟'' جان سن نے حیرانی سے کہا۔

لوزا پھر ہنسی ''یہ تو بڑا زبردست اسکینڈل تھا ڈیئر اخبارات متضاد خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے مگر تم تو دنیا سے بے خبر ہو۔''

''واقعی، جان سن نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا میں ہی بے خبر ہوں اور دنیا میری بے خبری سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ٹیری نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا مگر وہ راز نہ بتایا جو کسی کے لیے راز نہ تھا۔ اس نے ہر جرم کا اعتراف کیا سوائے سب سے بڑے جرم کے مائیکل بھی مجھے سچ بولنے کی سزا دینے پر تلا بیٹھا ہے اور نارمن موڈی مجھے یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ اندھے اعتماد کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے وہ انھنے ہی کو تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

''ڈاکٹر۔'' نارمن موڈی نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ ''یاد ہے کل میں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''ہاں۔'' جان سن نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا۔ ''کوئی کامیابی ہوئی۔''

''نارمن موڈی نے آج تک کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا جو پورا نہ ہو سکے۔'' نارمن نے فخر آمیز غرور سے کہا۔ ''میں نے معلوم کر لیا ہے کہ تم پر سارے قاتلانہ حملے کس کے اشارے پر ہوئے ہیں۔''

''کیا؟'' جان سن شدت اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ ''کون ہے وہ کیا نام ہے اس کا۔''

نارمن ہنسا فون پر ساری بات نہیں بتائی جا سکتی۔ تم اسی وقت مجھ سے ملو مگر بالکل تنہا۔''

''کہاں؟'' جان سن نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔

''تمہارے دفتر میں؟''

''نہیں۔'' نارمن نے کہا فائر اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی دیکھی ہے تم نے، نہیں؟ خیر سنو ٹونٹی تھرڈ اسٹریٹ سے مغرب کی طرف چلو، دریائے ہڈسن کو عبور کرو آگے فیکٹریوں کے گودام ہیں پرانی کاروں اور مشینوں کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچوں کے ڈھیر ہیں جو احاطوں کی چار دیواری میں نظر آتے ہیں گڈز ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے اڈے ہیں مگر اس وقت وہاں صرف ٹرک ہوں گے۔ دفتر بند ہو چکے ہیں دائیں جانب پہلی گلی میں، قدم پیدل چلو گے تو یہ کمپنی ہے۔'' جان سن کے کان اس آواز کو بھی سن رہے تھے اور اینجلو کی آواز کو بھی وہ تم سے کہے گا کہ آدھی رات کو سر کے بل قطب شمالی پر آؤ تو تم جاؤ گے اور وہیں تمہارا کام تمام اینجلو کی پیشن گوئی کے عین مطابق نارمن اسے تنہائی میں ایک ویران مقام پر بلا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' نارمن نے شاید جان سن کی خاموشی سے اس کے تذبذب کا اندازہ کر لیا تھا۔

''میں کچھ نہیں۔'' جان سن نے کہا ''نارمن تمہیں یقین ہے کہ قاتل پر تمہارا شبہ درست ہے تم تو بتا دو اس کا؟''

''میرا شبہ کبھی غلط نہیں ہوتا ڈون ویننٹن کا نام سنا ہے کبھی نہیں سنا تو دیر مت کرو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں تمہیں سب بتادوں گا۔'' نارمن نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جان سن بدستور ریسیور کو کان سے لگائے کھڑا رہا جیسے اب بھی کھس کر اڑ جانے والے ریکارڈ کی طرح اس میں سے ایک ہی صدا بار بار آ رہی ہے ڈون ویننٹن..... ڈون ویننٹن دیر مت کرو خبردار..... خبردار وہ کسی غیر آباد مقام پر بلائے تو ہرگز نہ جانا ہرگز نہ جانا دیر مت کرو دیر مت کرو ڈون ویننٹن..... ڈون ویننٹن خبردار..... خبردار۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے اینجلو کا نمبر ملایا۔

''اینجلو۔'' اس نے بہ مشکل تمام کہا۔ ''تمہارا خیال درست تھا۔ نارمن موڈی نے مجھے اسی وقت بلایا ہے ایک بالکل غیر آباد علاقے میں اور تنہا وہ کہتا ہے اس نے قاتل کا پتا چلا لیا ہے لیکن وہ فون پر کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟'' اینجلو نے چلا کے کہا۔ ''میرا مطلب ہے فون پر ڈرنے کی کون سی بات ہے کون ہے قاتل۔''

''ڈون ویننٹن۔'' جان سن نے حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔ ''تم اس نام کے کسی مجرم سے واقف ہو؟''

''نہیں۔'' اینجلو نے کہا ''تم خدا کے لیے اکیلے مت چل پڑنا میں مائیکل کے ساتھ پہنچتا ہوں۔''

''مائیکل کے بغیر نہیں آ سکتے تم؟'' جان سن نے کہا لیکن اینجلو اس سے قبل ہی فون بند کر چکا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جان سن نے ہڈسن کو عبور کیا تو آسمان پر جمع ہو جانے والے گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی چمکی اور اس نے اندھیرے میں لمحہ بھر کے لیے پھیل جانے والی اس روشنی میں پل پر سے آگے کا سارا منظر دیکھ لیا۔ شکستہ احاطوں کے اندر جو پرانی کاروں کے قبرستان کہلاتے تھے سیکڑوں ٹوٹی پھوٹی کاریں ایک دوسرے کے اوپر لاشوں کی طرح ڈھیر ہوئی پڑی تھیں۔ ان کی زندگی ختم ہو چکی تھی کیونکہ وہ قوت جو انہیں متحرک اور رواں دواں رکھتی تھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے روح آدمی کے جسم کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے تو وہ لاش کہلاتا ہے گرج کی آواز کے ساتھ ہی بارش کا ریلا آیا اور سڑک پر ہیڈ لائٹس کی روشنی دھندلا گئی۔ دونوں جانب قطاروں میں کھڑے خاموش ٹرک اپنی اندھی آنکھوں سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور ہر آفس کے باہر روشن واحد بلب کی مدھم زرد روشنی اندھیرے سے اور بارش کی یلغار کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی بلبلے سڑک پر ایک وحشیانہ رقص کر رہے تھے اور جان سن کی کار کے ونڈ اسکرین پر وائپر بڑی یکسانیت کے ساتھ حرکت میں تھے یوں جیسے کوئی انگلی کے اشارے سے اسے منع کر رہا ہے نہیں، نہیں آگے نہیں۔

جان سن کے پیچھے سوگز کے فاصلے سے دوسری کار آ رہی تھی جس کی دو روشن آنکھیں جان سن کو بیک ویو مرر میں نظر آ رہی تھیں کار یا اس میں بیٹھے ہوئے سارجنٹ اینجلو اور لیفٹیننٹ مائیکل کو اتنے فاصلے سے دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

جان سن نے کار کی رفتار کم کی اور اسے دائیں ہاتھ پر سڑک کے کنارے روک لیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی دوسری کار بھی آ پہنچی۔ ''کم آن۔'' مائیکل نے غرا کر کہا۔ ''اس سہانے موسم میں تمہارا یہ ڈرامہ بھی دیکھ لیں۔'' جان سن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کوٹ کے کالر اونچے کیے ہیٹ کو آگے جھکائے سر دہوا اور پانی کی بوچھاڑ کا مقابلہ کرتے ہوئے ان تینوں نے دائیں ہاتھ کی پہلی گلی میں چلنا شروع کیا جان سن ان دونوں کے پیچھے صرف ٹارچ لیے ہوئے تھا۔ اینجلو اور مائیکل کے ہاتھ اپنے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ریوالور تھامے ہوئے تھے۔ جان سن کے دل میں اب نارمن کی نیت کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کوئی ہوش مند آدمی صرف راز داری کے لیے اس ویرانے کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ راز کی بات تو کسی گلی کے موڑ پر کسی گمنام سے کافی ہاؤس میں یا اس نائٹ کلب میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جہاں شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی ہو۔ یہ ویرانہ اس شب کی تاریکی میں صرف قتل جیسے سنگین جرم کی پردہ داری کے لیے ٹھیک تھا ایک قد آدم دیوار پر تاروں سے لٹکا ہوا بورڈ جھول رہا تھا اور دیوار سے مسلسل ٹکرا رہا تھا۔ نیلے رنگ کے بورڈ پر سفید حروف دھل کر واضح ہو گئے تھے۔ ''فائیو اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی'' جان سن نے کہا لوہے کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور دو بیرک جیسی ڈھلوان چھت والی عمارات اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں انہوں نے مختصر سے احاطے کو طے کیا تین زینے چڑھے اور اس چبوترہ نما برآمدے پر چلنے لگے جو عمارت کے گرد پھیلا ہوا تھا۔ پہلا دروازہ لمبائی کے رخ وسط میں تھا اور مقفل تھا لوہے کا شٹر والا یہ دروازہ

چھ فٹ کے قریب چوڑا تھا بارش کا پانی اب تینوں کے کپڑوں سے گزر کر جسم تک پہنچ چکا تھا اور ان کے بدن سردی سے سن ہو رہے تھے پہلی عمارت کا چوڑائی کے رخ والا دروازہ بھی بند تھا۔ مائیکل نے ایک قہر آلود نگاہ جان سن پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ چکر مکمل کرنے کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ اندر جانے کا کوئی بھی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

''اب۔'' مائیکل نے تلخی سے کہا۔

''نارمن۔'' جان سن نے چلا کر آواز دی۔ ''نارمن موڈی۔'' وہ کچھ دیر بعد پھر چلایا۔ اس کی آواز بارش کے شور میں گم ہو گئی۔ ''میرا خیال ہے یہاں کوئی تہہ خانہ بھی ہونا چاہیے۔'' جان سن نے کہا اس کی حالت اس بچے کی طرح ہو رہی تھی جس نے جھوٹ بولنے کی بھرپور کوشش کی ہو مگر اس کی توقع کیخلاف سچ کا پتا چل گیا ہو چنانچہ مائیکل نے تائید میں سر ہلایا تو اسے تعجب ہوا۔ ''یہاں گوشت کو ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔'' مائیکل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ان کے سرد خانے زیر زمین ہی ہوں گے۔''

دوسری بار انہوں نے برآمدے سے نیچے اتر کے چکر لگایا اور وہ راستہ دیکھ لیا جو ڈھلوان کی طرح نیچے جا رہا تھا جہاں سے یہ راستہ شروع ہوتا تھا وہاں ایک پلیٹ فارم تھا جان سن نے اندازہ لگایا کہ گوشت لانے اور لے جانے ٹرک اسی پلیٹ فارم سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوں گے۔ نیچے جانے والے سیمنٹ کے چھ فٹ چوڑے راستے کے سامنے ہونے کے باعث اسی پلیٹ فارم نے بارش کے پانی کو نشیب میں جانے سے روک رکھا تھا۔ راستے پر دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ وہ بیلٹ تھی جو گوشت کو نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے لے جانے کے لیے چلتی تھی۔ آخر میں ایک دروازہ تھا مگر یہ دروازہ بند نہیں تھا۔ جان سن نے دروازے میں رک کر ٹارچ کی روشنی اس اندھیرے غار میں ڈالی۔ سرنگ جیسے کمرے میں تین ہی دروازے دائیں جانب تھے اور تین بائیں جانب مائیکل نے ریوالور نکال لیا۔ ''دروازہ کھولو۔'' اس نے جان سن کو پہلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جان سن نے دروازہ کھولا ٹارچ کی روشنی میں اسے چھت میں نصب لمبے لمبے آہنی کنڈوں کے ساتھ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے معلق نظر آئے۔ اس نے سوئچ تلاش کیا اور لائٹ جلائی اندر کی دیواروں پر بھی برف جمی ہوئی تھی اور ہر طرف دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ ''کیا ان میں سے کوئی تمہارا پرائیویٹ سراغ رساں نارمن موڈی ہے؟'' مائیکل نے طنز سے کہا۔

جان سن نے لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر دیا۔ ''اس نے مجھے یہی جگہ بتائی تھی اگر وہ یہاں نہیں ہے تو میں کیا کروں؟''

''دوسرا کمرہ دیکھو۔'' اینجلو نے مشورہ دیا۔ جان سن نے کسی ارادے کے بغیر تعمیل کی دوسرے کمرے میں بغیر سر کے کھال اترے ہوئے سالم سور الٹے لٹکے ہوئے تھے ان میں سے کسی کا وزن تین سو پونڈ سے کم نہیں تھا اور انہی سوروں کے درمیان ایک کنڈے سے نارمن موڈی کی بے لباس لاش بھی الٹی لٹکی ہوئی تھی اس کا وزن بھی تین سو پونڈ سے کم نہیں تھا اور اس کا بھی سر غائب تھا گردن سے ٹپکنے والا لہو نیچے برف کی سفیدی پر جم گیا تھا۔

......☆❁☆......

جان سن نے ایک بار پھر کیلنڈر کی طرف اور ہاتھ کی گھڑی کی میں دیکھ کر خود کو یقین دلایا کہ آج جمعہ ہی ہے۔ اپنے اضطراب وانتظار کی اس کیفیت پر اسے ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ جب اس کی عمر موجودہ عمر سے آدھی تھی تو اس نے دل کی دھڑکن اور خون کی گردش اور سانس کی رفتار تیز کر دینے والے بہت سے عشق کیے تھے جن میں سے ہر ایک جان لیوا اور آخری محسوس ہوتا تھا اور وقتی طور پر کسی ایک لڑکی کے بغیر زندہ رہنا ناممکن لگتا تھا مگر ایسے بہت سے عشق زکام سے زیادہ ناپائیدار ثابت ہوئے اور ان لڑکیوں کے بغیر کاروبار حیات اسی طرح چلتا رہا جیسے سورج نہ نکلے تب بھی زمین گردش کرتی رہتی ہے لیکن اب اس عمر میں جب وہ ایک معزز باوقار اور سنجیدہ شخص اور ایک نامور ماہر نفسیات تھا اس کا ایک عام عورت کے عشق میں عہد شباب کے آغاز کی سنسنی خیزی محسوس کرنا اور ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی شدید خواہش کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرنا اور تمام خطرات کے احساس کے باوجود عقل کے مقابلے میں جذبات سے مغلوب ہونا ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آئندہ زندگی میں اسے کوئی عورت پسند آئے گی تو اس کی بنیاد سو فیصد جنس کے حیوانی جذبے پر ہوگی۔ اس

کے لیے خیالات کی ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت کے ساتھ کسی عورت کے حسن صورت و حسن سیرت سے متاثر ہونا اور شادی کر لینا بعید از قیاس بات نہ تھی مگر یہ صورت حال تو قطعی مختلف تھی۔ شادی کا تو خیر سوال ہی نہ تھا۔ اسے الزبتھ کا دیوانہ بنانے والا صرف اس کا بے پناہ حسن تھا ایک مکمل عورت کا بھرپور بدن تھا اور اس بدن کی قوت تسخیر تھی وہ جنسی کشش جس کے سامنے مزاحمت کی ہر کوشش بے سود تھی۔

اسے اب آ جانا چاہیے۔ جان سن نے گھڑی کی طرف دیکھ کر سوچا اس نے نظر اٹھائی تو وہ تصویر دلربائی دروازے کے فریم میں موجود تھی۔

''الزبتھ۔'' جان سن نے سانس روک کر کہا۔ یوں جیسے اس کے سامنے جیتی جاگتی عورت نہیں ہے اس کے تصور نے ایک پیکر رعنائی تراش لیا ہے اور یہ خواب ہے یا سراب ہے جو پل بھر میں مٹ جائے گا۔ الزبتھ کے لبوں کی خفیف سی مسکراہٹ کا اجالا اس کی آنکھوں میں بھی اتر آیا اس کے صحت مند رخساروں پر شفق پھوٹنے لگی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی جان سن کے انہماک خود فراموشی اور گستاخ نگاہی کا برا مانے بغیر اس کے عین مقابل آ کے بیٹھ گئی۔

''میں..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' جان سن نے چند سیکنڈ کے سکوت اور خاموشی کے بعد کہا الزبتھ نے پلکوں کی چلمن اٹھا کے اسے دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں اداسی کا رنگ آج کچھ گہرا تھا۔

''یہ تم سے آخری ملاقات ہے میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا تھا۔'' اس نے تھرماس کھولا اور اس میں کافی کے دو مگ بھرے ایک مگ الزبتھ نے اٹھا لیا۔

پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ دونوں کافی پیتے رہے۔ جان سن دل کی بات زبان پر لانے کے لیے مناسب الفاظ کی جستجو کرتا رہا اور یہ بات کہہ دینے کے لیے ہمت کو مجتمع کرتا رہا اور الزبتھ کو دیکھتا رہا اور الزبتھ اس کی آنکھوں میں دل کی بات پڑھتی رہی ناکام کوشش کرتی رہی کہ جان سن کو دل کی یہ بات زبان پر لانے سے روک سکے اور میز کے نیچے اپنے پیروں کو دیکھتی رہی جو جان سن کے پیروں سے چند انچ دور تھے۔

''بات یہ ہے الزبتھ۔'' جان سن نے بالآخر مگ رکھ کے سکون سے کہا۔ ''آج تک میں نے جتنی بار بھی تمہیں مشورے کے لیے وقت دیا ہے اپنی مجبوری کے باعث دیا ہے ورنہ تمہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں تھی میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' الزبتھ نے نظر اٹھا کے آہستہ سے کہا ''تمہاری طرح میں بھی تو مجبور تھی۔''

''ہاں۔'' جان سن نے کہا ''مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تم میرے دلی جذبات سے بے خبر نہیں ہو مجھے اپنی اور تمہاری پوزیشن کا علم تھا اور میں جانتا تھا کہ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ لیکن ایک حقیقت کا اعتراف کرنے میں تو کوئی خطرہ نہیں۔''

''زندگی میں بہت سے خطرات سے مفر اپنے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔'' الزبتھ نے کہا یکلخت اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور نروس ہو کے کھڑی ہو گئی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ اسی خوف کے باعث میں تم سے وہ بات کہنے کی ہمت نہ کر سکی جس کے لیے تمہارے پاس آئی تھی۔ میں اب اپنے شوہر کے ساتھ شکاگو جا رہی ہوں۔ شاید میں پھر نہ آؤں۔''

''تم اس وقت بھی وہ بات کہہ سکتی ہو۔'' جان سن نے کہا ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔''

الزبتھ نے نفی میں سر ہلایا وقت گزر چکا ہے اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' جان سن نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور الزبتھ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا۔''

''جان۔'' الزبتھ نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا ''میں تمہاری سلامتی کے لیے صرف دعا کر سکتی ہوں وعدہ کرو تم اپنا خیال رکھو گے۔''

''یہ دعا میرے لیے بہت ہے لزا۔'' جان سن نے کہا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے جلتے لبوں کا بوسہ ثبت کر دیا۔

الزبتھ نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پلٹ کر دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ اس کی ہائی ہیل کے جوتوں کی آواز کو کاریڈور کے فرش پر دور ہوتے سنتا رہا۔ پھر یہ آواز بھی نہ رہی جب اس نے دیکھا تو الزبتھ کی بجائے لیفٹیننٹ مائیکل اس کے سامنے کھڑا اسے بڑی معنی خیز نظروں سے

دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے ڈاکٹر جان سن مجھے دیکھ کر تمہارے ہوش گم ہو گئے ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تمہاری شخصیت اتنی مسحور کن ہے۔'' جان سن نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یا تم ڈریکولا ہو۔''

''مجھ سے زیادہ خوش فہمی کا شکار تم ہو۔'' مائیکل نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہ تم ایک نامور ماہر نفسیات اور ڈاکٹر ہو، میری نگاہ میں تمہاری حیثیت صرف ایک عیار قاتل کی ہے تم دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو مجھے نہیں۔''

''پھر انتظار کس بات کا ہے۔'' جان سن نے تڑپ کر کہا۔ ''گرفتاری کا وارنٹ کیوں نہیں لے آتے۔''

''وارنٹ میرے ایک اشارے پر نکل سکتا ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''لیکن میں اپنے شکار پر اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب تک اس کے لیے فرار کے تمام راستے بند نہ کردوں اور مجرم جتنا چالاک ہو اس کے لیے قانون کی گرفت بھی اتنی ہی مضبوط رکھنی پڑتی ہے میں اب تک صرف یہ طے نہیں کر سکا ہوں کہ اس خونریزی کا مقصد کیا ہے یہ ڈرامے؟''

''ڈرامے؟'' جان سن میز پر مکا مار زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آتے تھے جب وہ مشتعل ہوتا تھا لیکن مائیکل کے رویے کو برداشت کرنا اب اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا وہ آپا بھی ایسے وقت میں تھا جب الزبتھ سے جدائی کے زخم سے لہو رس رہا تھا اور درحقیقت یہ مایوسی اور دل شکنی کے درد کا ردعمل ہی تھا۔ جو بے بسی کے باعث اشتعال کی کیفیت میں ڈھل گیا تھا۔

''ہاں ڈرامے۔'' مائیکل نے جواب میں میز پر مکا مارا۔ ''ہو سکتا ہے وہ آدمی تمہارا ہی ہو جو بعد میں کار کے حادثے کا چشم دید گواہ بن کے نمودار ہو گیا۔ تمہارے کمرے میں دو قاتلوں کا تالے کھول کر آنا اور لوٹ جانا دوسرا بے سروپا جھوٹ تھا۔ تمہارے اپنے کہنے کے مطابق چابیوں کے دو سیٹ تھے ایک پولیس کے پاس تھا۔ نہ اس پر فرانسین کے آثار ملے نہ تالے کے سوراخ میں کیا اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ کسی نے بھی چابیوں کا تیسرا سیٹ نہیں بنایا اور یہ تالے خود تم نے کھولے تھے بات یہ ہے ڈاکٹر کہ ذاتی طور پر میں نے تمہاری شہرت اور عزت کو مدنظر رکھتے ہوئے تسلیم کر لیا تھا کہ کارل مارک کا پہلا قتل اور کیرل کا دوسرا قتل کسی جنونی کی حرکت تھا میرے یقین کو تقویت پہنچانے کے لیے تم نے یہ مفروضہ پیش کیا کہ ہدف تمہاری ذات تھی اور تم قاتل نہیں ہو بلکہ مقتول ہو سکتے ہو خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے تم نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہیں پولیس پر اعتماد نہیں اور یکلنٹ اور عظیم سراغ رساں نے تمہاری کار میں سے ڈائنامائیٹ بھی برآمد کر لیا جو صرف دو افراد نے دیکھا ہے چنانچہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ ڈائنامائیٹ کا افسانہ کس کے ذہن کی تخلیق تھا۔ رہ جاتے ہو صرف تم تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ وہ ایٹم بم تھا تم نے اس سراغ رساں کو بھی اس لیے ٹھکانے لگا دیا کہ اپنے غائبانہ دشمنوں کے وجود کو ثبوت فراہم کر سکو کہ وہ تمہارے ہی نہیں اس کے بھی پیچھے پڑ گئے تھے کیونکہ اس نے حیرت انگیز صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے قاتل کا نام معلوم کر لیا تھا صرف چوبیس گھنٹے میں۔''

''کیا یہ غلط ہے۔'' جان سن نے پٹے ہوئے مہرے کی طرح کہا اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟'' مائیکل نے گرج کر کہا تم نے وہ نام ایجاد کیا تھا جس کا وجود ہی نہیں۔ اٹھاؤ یہ ٹیلی فون ڈائریکٹری اور اس میں سے ایک بھی ڈان ویسٹن نکال دو۔ میں نے لاس اینجلز، شکاگو، نیویارک، نیو اورلینز کے ریکارڈ چیک کرانے کے بعد ایف بی آئی کے مرکزی بیورو میں پورے امریکا اور انٹرپول کے مجرموں کا ریکارڈ چیک کرایا لیکن ڈان ویسٹن نام کا کوئی مجرم نہیں۔ یہ کسی مجرم کی عرفیت نہیں کسی کا فرضی نام نہیں ایک درجن مختلف ناموں سے وارداتوں میں شریک ہونے والے کسی مجرم نے وقتی طور پر بھی یہ نام استعمال نہیں کیا مس تمہاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر جان سن کھڑا ہوا اور اینجلو کی طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔ اینجلو نے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی اور چند سیکنڈ دروازے کی طرف دیکھتا رہا بھاری قدموں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ مائیکل اکیلا ہی واپس جا رہا ہے۔

''آئی ایم سوری ڈاکٹر۔'' اینجلو نے کہا ''حالات و

واقعات کی شہادت نے مائیکل کا حوصلہ بلند کر دیا ہے۔''

''اینجلو۔'' جان سن نے کہا۔ ''میرے حوصلے کو بھی شکست نہیں ہوئی ہے میرا یقین برقرار ہے کہ ڈون وینٹن کا نام نارمن موڈی کے ذہن کی اختراع نہیں تھا اور مجھے بالکل شبہ نہیں کہ وہ بدستور میری جان کا دشمن ہے باقی لوگ صرف میری وجہ سے مارے گئے۔ کارل مارک میرے دھوکے میں کیرل کو اس لیے مارا گیا کہ وہ ایک ٹیپ یا کوئی دستاویزی ثبوت دینے پر تیار نہیں تھی جو قاتلوں کے خیال میں ان کے لیے خطرے کا باعث تھا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ میں نے ان کے خلاف شہادت کو محفوظ کر لیا ہے کہ میں مارا جاؤں تو پولیس انہیں فوراً پکڑ لے ایسا کوئی ٹیپ تھا کہاں جو کیرل انہیں دیتی۔ چنانچہ انہوں نے کیرل پر تشدد کیا وہ کیرل کے بارے میں یہ نہیں جانتے تھے کہ فی الحقیقت کوئی ایسا ٹیپ موجود ہوتا تب بھی وہ اپنی جان دے دیتی مگر وہ ٹیپ نہ دیتی نارمن موڈی کے قتل کا سبب واضح ہے اس نے ڈوب وینٹن کو شناخت کر لیا تھا۔''

بے یقینی کے آثار اینجلو کی صورت سے عیاں تھے لیکن اس نے کہا۔ ''اگر فیصلہ میرا ہوتا تو میں کبھی یہ نہ سمجھتا کہ تمہارا خیال غلط ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن میں مائیکل کا ماتحت ہوں اور پولیس کمشنر کہتا ہے کہ تمہیں مائیکل پر اعتماد نہیں تو نوکری چھوڑ دو وہ تمہارا افسر ہے تمہارے کہنے سے میں نہیں مان سکتا کہ وہ ڈاکٹر جان سن کے خلاف انتقامی جذبہ رکھتا ہے۔''

''تھینکس اینجلو۔'' جان سن نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے میں ایک ایسے نظام کی سازش کا شکار ہو رہا ہوں جسے بدلنا تمہارے اختیار میں نہیں لیکن تمہاری ہمدردی بھی غنیمت ہے دنیا میں کوئی تو ہے جو مجھے بے گناہ اور مجبور سمجھتا ہے۔''

اینجلو کے رخصت ہوتے ہی جان سن نے دروازوں اور الماریوں کو مقفل کیا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یکلخت کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا اس کی کہنی کا خم جان سن کی گردن پر شکنجے کی طرح آ گیا اور اس کے گھٹنے نے جان سن کو بند دروازے سے لگا دیا۔ ''باسٹرڈ۔'' کسی نے دوسرے ہاتھ سے اس کی پسلیوں پر مکے رسید کرتے ہوئے کہا وہ غیر معمولی جسمانی قوت کا مالک تھا اور قد و قامت میں بھی جان سن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً کیرل والے کمرے میں بہت پہلے سے چھپا ہوا اینجلو کے رخصت ہونے کا انتظار کر رہا تھا جان سن کا سانس رکنے لگا اور ضرب کی شدت سے اس کی پسلیاں چٹخنے لگیں اس نے زندہ رہنے کی جدوجہد میں اپنے جسم کی ساری قوت کو داؤ پر لگا دیا اور ایک ٹانگ موڑ کر پیچھے کی طرف وار کیا۔ جوتے کی ایڑی حملہ آور کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی اور وہ کراہا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور جان سن نے اس کے پیٹ میں کہنی ماری آزاد ہوتے ہی اس نے اپنے مقابل ایک ایسے شخص کو دیکھا جو قد میں اس سے چھ انچ زیادہ تھا اس کا کسرتی بدن کسی اسپورٹ مین کی طرح متناسب تھا گو اس کشمکش میں ٹائی کی گرہ کھسک گئی تھی اور بال پریشان ہو گئے تھے لیکن جان سن دیکھ رہا تھا کہ اس نے بڑا قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے اور وہ ہینڈسم ہی نہیں خوب صورت ہے اس کا مہذب متین اور شریفانہ چہرہ کسی مجرم کا چہرہ نہیں تھا۔

جان سن کے سنبھلنے سے پہلے اس نے پھر جان سن کو اپنی پھرتی سے مغلوب کر لیا اس کے دونوں ہاتھوں نے سامنے سے جان سن کی گردن پکڑ لی ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ اس نے جان سن کا سر دروازے پر دے مارا۔ پل بھر کے لیے جان سن کی نظروں نے چھت سے معلق بلب کو جلتے بجھتے اور پنڈولم کی طرح ہلتے محسوس کیا۔ پھر جان سن کا سر دوسری بار دروازے سے لگا اور اس کے گرد اندھیرا محیط ہو گیا۔ ایک منٹ بعد اسے ہوش آیا تو وہ فرش پر پڑا تھا اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک بوٹ کی ٹھوکر اس کے سر پر فٹ بال کی کک بن کر پڑی وہ الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ اس کے کانوں میں ایک اور غلیظ گالی کی آواز آئی۔

''پلیز۔'' جان سن کراہا اور اس نے جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کا سہارا لے کر بیٹھنا چاہا مگر دوسری کک اس کے پیٹ پر لگی اور وہ چت ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد آہستہ آہستہ درد کا احساس جاگا پھر اس کے کانوں میں کسی کے سسکیاں لے کر رونے کی آواز آئی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں کمرے میں جیسے ہر چیز دھوئیں میں لپٹی ہوئی مبہم اور غیر واضح تھی اور صورت بدل رہی تھی۔ ڈول رہی تھی اور بار بار جھلک دکھا کے اوجھل ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دھواں غائب ہو گیا اور روشنی پھیلتی گئی متحرک چیزیں

ساکت ہوگئیں اور اس کی آنکھیں اپنے کمرے کے مانوس ماحول کو شناخت کرنے لگیں۔ اس نے رونے والے کو دیکھا وہ چھ فٹ کا لمبا چوڑا خوب صورت مرد اس کا اجنبی قاتل میز پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اپنی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا اور بے اختیار اس کے ہاتھوں نے اس لوہے کی سلاخ تک رسائی حاصل کرلی جو آتشدان کے قریب رکھی تھی اور آگ کریدنے کے کام آتی تھی تکلیف کے باوجود بجلی کی طرح اٹھا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آیا اور وہ اس شخص نے اس کا ہاتھ تھام لیا سلاخ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آیا اور وہ اس شخص کے مقابل دوسری کرسی پر گر پڑا میرے خدایہ میں کیا کرنے والا تھا۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے اس گناہ سے بچالیا۔ یہ شخص اگر ذہنی مریض ہے تو کیا میں تو پاگل نہیں ہوں میں ڈاکٹر ہوں میرا کام جان بچانا ہے۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس شخص کے کندھے پر رکھا۔

''کون کون ہو تم اور مجھ سے تمہیں کیا گلہ تھا مجھ سے جو تم میری جان لینے پر تل گئے تھے؟'' اس نے بمشکل تمام کہا۔

اس شخص نے سر اٹھایا۔ ''تم..... تم قاتل ہو تم نے کارل مارک کا خون کیا ہے۔''

جان سن نے انکار میں سر ہلایا۔

''اسے..... اسے میں نے نہیں مارا تمہارا کیا رشتہ تھا اس سے۔''

''وہ میرا دوست تھا۔'' اس شخص نے روتے روتے کہا اس کا جارحانہ انداز بالکل باقی نہ رہا تھا وہ کسی بچے کی طرح رو رہا تھا جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔ ''وہ میری زندگی تھا تین سال تک وہ میرے لیے سب کچھ تھا۔''

ساری بات جان سن پر روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ ''تم بانڈ ہو چارلس بانڈ کارل مارک تمہارے ساتھ رہتا تھا؟''

''ہاں۔'' وہ بولا ''مگر تم اور تمہارے جیسے اخلاق و کردار کے ٹھیکیدار ہماری مسرتوں کے دشمن تھے میں پوچھتا ہوں یہ حق کس نے دیا ہے تمہیں کہ نیکی بدی گناہ و ثواب اور جائز و ناجائز کے معیار بناؤ اور ہر شخص پر مسلط کردو اگر ہم گناہ گار تھے تو سزا کا اختیار خدا کو تھا۔ اگر ہم بدکار تھے تو اپنے لیے اور ہم پارسائی کا دعویٰ بھی نہیں کرتے تھے۔ تم جیسے لوگوں نے اسے احساس جرم و ندامت میں مبتلا کیا۔ ضمیر کی خلش دی اور اسے مریض بنا کے اس کا علاج کرتے رہے تھے۔ کیا نتیجہ نکلا اس کا تین سال بعد وہ مارا گیا۔ وہ میرے ساتھ تھا تو خوش تھا اور زندہ تھا تم نے اس کی خوشی اور اس کی زندگی دونوں چھین لیں۔ مجھے معلوم ہے وہ میرے پاس ہوتا تو وہ آج بھی خوش ہوتا اور زندہ ہوتا مجھے بتاؤ کیا تم اس کے قاتل نہیں ہو اب اس کے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔''

جان سن نے اس کے شانے پر محبت سے تھپکی دی۔

''نہیں چارلس تم زندہ رہو گے میں تمہیں جینا سکھاؤں گا اور میں تمہاری زندگی کی ہر خوشی لوٹا دوں گا کہ مسرتوں کے خزانے کہاں ہیں۔''

''اچھا۔'' اس نے بچوں کی طرح حیرت اور مسرت آمیز تجسس کے ساتھ کہا۔ ''وہ کیسے؟''

''کل صبح میرے پاس آؤ۔'' جان سن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک دس بجے اور اب چلو مجھے گھر تک چھوڑ کے آؤ میں ڈرائیونگ کے قابل نہیں رہا۔''

چارلس نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ اب نادم تھا اس عمارت کے سامنے جس میں ڈاکٹر کا فلیٹ تھا اپنی کار روکنے کے بعد وہ ڈاکٹر کو فلیٹ تک چھوڑ کر آنے پر مصر تھا۔ مگر جان سن نے کہا کہ اب وہ لفٹ کے ذریعے اوپر چلا جائے گا۔

''ڈاکٹر۔'' چارلس نے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔'' اور کار آگے بڑھادی۔

جان سن مسکرایا اور اندر داخل ہوگیا۔ خلاف معمول چوکیدار موجود نہیں تھا۔ دو افراد دائیں بائیں جانب سے اس کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھے جان سن ٹھٹک گیا جارحانہ عزائم کا اظہار ان کی صورتوں سے اور ان کے انداز و اطوار سے ہوتا تھا۔

وہ دونوں طویل قامت تھے ان دونوں نے ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے دونوں کے فلیٹ ہیٹ سر پر آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے اور وہ دونوں سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھے جان سن نے ان دونوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ لفٹ میں جانے کا خیال ترک کر کے

زینے کی طرف بڑھا ان میں سے ایک جان سن کی راہ میں حائل ہوگیا۔

''لفٹ کے ہوتے ہوئے زینے کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ بولا دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔

''لیکن یہ میری مرضی کی بات ہے۔'' جان سن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا بیک وقت ان دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہمارا خیال ہے کہ یہ ہماری مرضی کی بات ہے۔'' دوسرے شخص نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ریوالور دکھا کے واپس جیب میں ڈال لیا جان سن ان دونوں کا کسی صورت مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اگر وہ خالی ہاتھ ہوتے تب بھی نہیں۔ اس کا چیخنا چلانا بے سود تھا کسی کے جاگنے اور باہر آنے سے قبل ہی وہ جان سن کو گولی مار کے جاسکتے تھے اگر اس وقت کوئی آجائے جان سن نے لفٹ کی طرف چلتے ہوئے آخری دعا کی یکلخت بہت قریب سے عورتوں اور مردوں کی ملی جلی ہنسی سنائی دی۔ ان دونوں نے جان سن کو دھکیلا جان سن لفٹ کے دروازے پر رک گیا دو عورتیں اور دو مرد اندر آگئے۔

''ایک منٹ۔'' مرد نے چلا کے کہا۔

اس وقت تک جان سن اور ان کے دونوں اجنبی قاتل لفٹ میں داخل ہوچکے تھے اور ایک ہاتھ لفٹ کا بٹن دبانے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ مگر جان سن نے دیکھ لیا تھا کہ وہ دونوں سامنے ہونے کے باعث ان چاروں کی نگاہ میں آچکے ہیں اب وہ لفٹ لے کر فرار نہیں ہوسکتے تھے ان چاروں گواہوں میں سے دو یقیناً بعد میں پوری تفصیل کے ساتھ پولیس کو قاتلوں کا حلیہ لکھوا سکتے تھے۔

''نمبر ٹین پلیز۔'' ایک مرد نے کہا جان سن نے دن کے بعد پانچ پر انگلی رکھ دی۔ نمبر روشن ہوتے گئے جان سن کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ پانچ کا عدد روشن ہوا اور دروازہ کھل گیا مگر وہ کھڑا رہا۔

''پانچواں فلور۔'' دونوں میں سے ایک نے اسے یاد دلایا جان سن چونکا یوں جیسے وہ اپنے خیالات میں گم تھا اور یہ بات بھول گیا تھا۔ چند سیکنڈ کی تاخیر اسے بچا سکتی تھی۔ جب وہ لپک کر نکلا تو دروازہ تقریباً بند ہوچکا تھا پیچھے کھڑے ہوئے دونوں قاتلوں کو آگے آنے کی مہلت نہیں ملی تھی اور لفٹ اوپر چل پڑی تھی۔

جان سن بے تحاشا بھاگا اور زینے سے نیچے اترنے لگا چارلس نے اسے ڈرائیونگ کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ نہ جانے کیسے دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگ گیا اور محفوظ رہا۔ تیسری منزل تک پہنچنے میں اسے چند سیکنڈ لگے اس نے چابی لگا کے تالا کھولا مگر وہ اندر داخل ہونے بھی نہ پایا تھا کہ کوئی اس سے پہلے گزر گیا اس کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔

''ٹیری۔'' جان سن نے جیسے رو کر کہا جواب میں ٹیری برن کی بے شرم ہنسی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''پلیز..... پلیز ٹیری مجھے سنبھال لو۔'' جان سن نے کہا۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے اپنے بے لباس جسم کو باتھ روم کے گرم پانی کے ٹب میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا راحت کے احساس سے اور تحفظ کے خیال سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں، ٹیری کے ہاتھوں نے بڑی نرمی اور بڑی محبت سے اس کے جسم کو خشک کیا۔ جب ٹیری کافی لے کر آئی تو اس نے کوڈین کی دوا اور اسپرین کی دو گولیاں نگل لیں غنودگی کی کیفیت میں اسے ٹیری کو اپنے جسم کی حرارت اس کے جسم میں منتقل کرتے محسوس کیا اور اس نے بے اختیار ٹیری کی آغوش میں پناہ لے لی رات نہ جانے کب ختم ہوگئی۔ وہ وقت کے احساس سے بے خبر اپنی پناہ گاہ میں لیٹا رہا آہستہ آہستہ تھکن خوف اور درد کی شدت مٹنے لگی۔

''ٹیری۔'' اس نے آنکھیں پوری کھول کر کہا۔ ''تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم نے ایک قتل کیا تھا۔''

''بتانے سے کیا ہوتا ہے ڈارلنگ۔'' ٹیری نے برا مانے بغیر کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ قتل میں نے نہیں کیا تو دنیا نے نہیں مانا تھا۔ اب انکار یا اقرار سب برابر ہیں جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔''

''ہاں۔'' جان سن نے کہا ''جو ہونے والی بات ہے وہ ضرور ہوتی ہے کوئی کچھ بھی کرے۔''

.....☆❁☆.....

اس کی آنکھ ایک فائر سے کھلی۔ ''ٹیری۔'' وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا لیکن ٹیری کی جگہ خالی تھی۔ اس کی جگہ ایک پرچہ رکھا تھا۔ جس پر خوش سی بات لکھی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ وہ پوری رات اور ایک پورا دن سوتا رہا تھا فائر کی

آواز بالکل واضح تھی مگر کچھ دبی دبی سی محسوس ہوئی تھی جیسے ریوالور پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ پلک جھپکتے میں وہ بستر سے اتر گیا اور دروازہ کے سوراخ سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا یا میں نے خواب دیکھا تھا۔ جان سن نے سکون کا گہرا سانس لیا لیکن سانس اس کے حلق میں اٹک گیا سب سے باہر والے کمرے میں دو افراد گفتگو کررہے تھے۔

''وہ اندر ہی ہے۔'' کسی نے اعتماد سے کہا۔

جان سن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کمرے کا سامان دروازے کے سامنے ڈھیر کرنے لگا۔ مسہری کو دروازے کے ساتھ لگا کے اس نے میز کو اس طرح رکھا کہ دروازے سے دیوار تک ساری جگہ بھر گئی۔ فائر سے تالہ توڑ کر اندر آنے والے اب بڑے اطمینان سے باتیں کررہے تھے۔

''اوہ نو۔'' ان میں سے ایک ہنسا۔ ''اور نہ مرا تو ہم سے پہلے لوگ اسے اسپتال لے جائیں گے۔''

اسپتال جان سن کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور ایک نمبر ملانے لگا۔

''ہلو..... ایمرجنسی؟'' اس نے ریسیو اٹھانے والے سے کہا۔ ''یہاں ایک شخص نے خودکشی کرلی ہے نہیں، نہیں وہ ابھی زندہ ہے میں اس کا پڑوسی بول رہا ہوں پتا لکھو اور دیر مت کرنا ورنہ وہ مرجائے گا۔'' باہر سے دوسرا فائر سنائی دیا۔ جان سن نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے اور قاتلوں کے درمیان اب بھی دو کمروں کے مقفل دروازے حائل تھے ضرورت کے وقت آخری پناہ گاہ باتھ روم ہوسکتی تھی۔ اس نے مسہری پر مزید سامان رکھنا شروع کیا۔ پھر اس نے تمام نقد رقم جیب میں ڈالی۔

''یہاں بھی کوئی نہیں۔'' پہلی آواز نے کہا مگر اس کے لہجے میں مایوسی یا گھبراہٹ بالکل نہیں تھی۔

''باسٹرڈ۔'' دوسرے نے کہا۔ ''زہتا بڑے شاہانہ طریقے سے ہے۔''

''کچھ لوگ واقعی پاگل ہوتے ہیں۔'' پہلے والے نے انکشاف کیا۔ ''کچھ خود کو پاگل سمجھنے پر مصر ہوتے ہیں۔''

''اور دونوں اسے فیس دیتے رہتے ہیں۔'' پہلا ہنسا۔ ''دماغ دونوں کا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔''

ان کا اطمینان قابل رشک تھا وہ جانتے تھے کہ ان کا شکار محصور ہے اور اس کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ آخری کمرے کا تالہ تیسرے فائر سے ٹوٹا اور وہ ساتھ والے کمرے میں آگئے۔

''کل قسمت نے اسے بچالیا۔''

''قسمت اسے ہمیشہ بچاتی آئی ہے۔'' دوسرے نے کہا وہ کچھ فلسفیانہ گفتگو کا عادی تھا۔

''وہ اس کمرے کے علاوہ کہیں نہیں ہوسکتا۔'' پہلے نے کہا جان سن نے تولیہ سے چہرے کا پسینہ خشک کیا اس کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور کانپ رہا تھا۔ قسمت کہیں نہ کہیں دغا ضرور دے جاتی ہے۔ اس وقت جب آدمی اپنی خوش نصیبی پہ بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ اسے اچانک معلوم ہوتا ہے کہ اگلے موڑ پر بدنصیبی اور موت کی اندھی خلیج ہے اور پیچھے جانے کے راستے مسدود ہیں۔ اپنے ماضی کی طرف یوں بھی کون لوٹ سکتا ہے۔ حال کا کوئی لمحہ اچانک ختم ہوجائے تو موت آلیتی ہے۔

''ایک منٹ۔'' پہلے شخص نے کہا۔ ''یہ ٹی وی دیکھا تم نے؟ یہ ایمرجنسی والے نظر آرہے ہیں مجھے۔''

''ہاں مگر اس عمارت میں سیکڑوں لوگ رہتے ہیں۔'' دوسرا بولا۔ ''نہ جانے کون بیمار ہے۔''

''انہیں گزر جانے دو۔'' پہلے نے کہا اگر کوئی زخمی ہوا ہے یا قتل وغیرہ کا چکر ہے تو پولیس بھی ہوگی اور نہیں ہوگی تو آجائے گی۔'' ڈاکٹر نے تالے کے سوراخ سے جھانکا۔ وہ دونوں کلوز سرکٹ ٹی وی کو دیکھ رہے تھے جس پر نیچے کے ہال کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ایمرجنسی والے آپہنچے تھے دو ڈاکٹر دو نرسیں اسٹریچر اٹھانے والے دو آدمی۔

گھڑی کی سوئیاں سست رفتاری سے آگے بڑھتی رہیں۔ پانچ..... دس..... پندرہ..... بیس سیکنڈ۔ قاتل اور مقتول ایک بند دروازے کے پیچھے کھڑے اس وقت کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہے۔ وقت گزر جائے تو کوئی دروازہ کوئی دیوار کوئی تدبیر فرشتہ اجل کی راہ نہیں روک سکتی۔ آدمی کے ارادے کے آگے پہاڑ کچھ نہیں۔ پچیس سیکنڈ تیس سیکنڈ۔

''مریض زندہ ہے؟'' کسی نے دروازے کے عین سامنے پہنچ کر زور سے کہا لفٹ آدھے منٹ میں اوپر آگئی تھی۔

''مریض۔'' ساتھ والے کمرے سے دو افراد نے بیک وقت حیرت سے سوال کیا جان سن نے اپنی نوٹ بک بھی جیب میں رکھ لی تھی۔

''انہیں کچھ نہیں معلوم۔'' سوال کرنے والے نے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی جان سن نے مسہری کو گھسیٹ کر ایک طرف کیا قالین پر اس کے گھسٹنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی دستک دوبارہ سنائی دی۔

''دروازہ توڑ دو۔'' پہلے شخص نے حکم دیا۔ دروازے پر ایک دھکا لگا وہ مسہری پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دوسرے دھکے میں دروازہ ہل گیا وہ انتظار کرتا رہا پھر ایک دھماکا ہوا اور دروازہ میز پر گرا بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ چار مضبوط ہاتھوں نے اسے مسہری پر سے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا وہ مردے کی طرح پڑا رہا۔

''فکر کی بات نہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے کہا۔ ''نبض ٹھیک ہے کم آن۔''

اسٹریچر اٹھا لیا گیا باہر کے کمرے سے گزرتے ہوئے جان سن نے ایک آنکھ کھول کے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح کھڑے تھے۔ آخری لمحے میں قسمت نے ان کے اعتماد کو شکست دے دی تھی اور جان سن بچ کر نکل گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جان سن بے ہوش نہیں ہے لیکن وہ بے بس تھے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی اسپتال ان کی دسترس سے دور نہیں تھا۔

ایمبولینس جان سن کے اندازے کے مطابق پندرہ منٹ بعد رک گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے اسٹریچر پر لیٹا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ قاتل اگر تعاقب میں ہوں گے تو ساتھ ساتھ پہنچے ہوں گے کسی کمرے میں پہنچنے تک وہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر ہیری کو سب کچھ بتا سکتا تھا اور اینجلو سے فون پر بات کر سکتا تھا۔

''ادھر۔ اس کمرے میں۔'' ایمبولینس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے کہا۔ جان سن کو ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔

''جان سن۔'' اس نے ڈاکٹر ہیری کی پرتشویش آواز سنی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں موجود ایک نرس اور ایک ڈاکٹر نے جو ایمبولینس کے ساتھ آئے تھے۔ چونک کر جان سن کی طرف دیکھا حیرت اور صدمے سے ان کا برا حال ہو گیا تھا۔

''ہیرس۔'' جان سن نے چٹکی بجا کے کہا۔ ''مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔'' دوسرے ڈاکٹر نے ماتھے پر بل ڈال کر نرس کی طرف دیکھا اور احتجاج کے انداز میں واک آؤٹ کر گیا۔ نرس نے اجازت طلب نظروں سے ڈاکٹر ہیری کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

''بات مجھے تم سے کرنی ہے۔'' ہیرس نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ ساتھ پولیس کا ایک لیفٹیننٹ مائیکل یہاں پہنچا ہے۔''

''اوہ۔'' جان سن نے کہا۔ ''اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔''

''وہ تمہارے گھر پہنچا تھا۔'' ہیرس نے کہا۔ ''اسے معلوم ہوا کہ تمہیں ایمبولینس لے گئی ہے۔''

''اچھا دیکھو، تم اسے کچھ دیر روکے رکھو۔'' جان سن نے کہا۔

''میں ایک فون کر لوں۔،، ہیرس نے سر ہلایا لیکن وہ جان سن کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے جان سن کے رویے نے یا مائیکل کی کسی بات نے شبہے میں ڈال دیا تھا۔ وہ پلٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ جان سن نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کے بند کیا اور کھڑکی کھول کر باہر کود گیا۔ چند منٹ بعد اس نے سڑک پر ٹیکسی روکی۔ ائرپورٹ اس نے کسی ارادے کے بغیر کہہ دیا جانا اسے کہیں نہیں تھا لیکن ائرپورٹ اس کے لیے بہت بڑی پناہ گاہ تھی۔ جہاں وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ہو سکتا تھا اور وقت ضرورت ٹکٹ لے کر کسی ہوائی جہاز میں بھی بیٹھ سکتا تھا۔ ائرپورٹ پہنچ کے اس نے ڈائری نکالی اور باری باری تمام مریضوں کو فون کرنے لگا۔ ان سب سے اس نے ایک ہی بات کہی، ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہ سردست کسی سے نہیں مل سکتا اور سب کو دو ہفتے بعد آج ہی کے دن آنا ہوگا محویت میں وہ بالکل بھول گیا کہ الزبتھ اپنے شوہر کے ساتھ شکاگو جا چکی ہے اس نے صفحہ پلٹا تو الزبتھ کا پتا اور ٹیلی فون نمبر سامنے آ گیا نمبر ڈائل کرتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اتنی دیر میں کسی نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ ''یس۔'' ایک عورت نے کہا۔ ''کس سے بات کرنی ہے آپ کو۔''

''میں مجھے مسز چارلس۔'' الزبتھ چارلس سے۔ جان

سن نے کہا۔ ''اگر وہ شکا گو.....''

''رانگ نمبر پلیز۔'' عورت نے کہا فون بند ہو گیا۔

جان سن حیران کھڑا رہا کیونکہ اس نے بڑی احتیاط سے ہر نمبر ملایا تھا محض آزمانے کے لیے اس نے دیکھ دیکھ کر وہی نمبر پھر ملایا۔ اسی عورت کی آواز پھر سنائی دی جان سن کا تجسس بیدار ہو گیا۔

''معاف کیجیے گا۔'' جان سن نے شائستگی سے کہا۔ ''میں ڈاکٹر جان سن ہوں مسز چارلس میری مریض تھیں۔''

''ڈاکٹر جان سن۔'' عورت نے کہا۔ ''یہاں کبھی الزبتھ چارلس نام کی کوئی خاتون گزشتہ دس برس میں نہیں رہیں یہ ڈیوڈ ایشلے کا گھر ہے اگر آپ کو بیس بال سے دلچسپی ہے تو آپ اس نام سے ضرور واقف ہوں گے غالباً آپ نے غلط نمبر لکھ لیا ہے۔ پلیز انکوائری سے معلوم کیجیے۔''

فون پھر بند ہو گیا۔

غلطی کا امکان ضرور تھا مگر بہت کم کیونکہ نام پتا اور فون نمبر خود الزبتھ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اتفاق کچھ ایسا ہوا تھا کہ ہر بار خود الزبتھ ہی نے اسے فون کیا تھا۔ اسے ایک بار بھی اس نمبر پر بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا تو قطار میں لگے ہوئے درجن بھر افراد نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔ ''کوئی نمبر رہ گیا ہے تو دیکھ لو۔'' ایک بڑھیا نے طنز سے کہا جان سن ڈائری جیب میں رکھ کے باہر آ گیا اس کے بالکل سامنے کار ہائر ایجنسی کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

''ہم خدمت کا اعلیٰ ترین معیار قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں ہمیں اس کا موقع دیجیے۔'' جان سن نے انہیں موقع دینے کا فیصلہ کیا دس منٹ بعد منیجر نے اسے بڑے اخلاق کے ساتھ ایک بالکل نئی کار کی چابی پکڑا دی۔

ٹیلی فون نمبر غلط ہو جانے کے بعد جان سن کے پرانے شبہات پھر سر اٹھا رہے تھے اگر الزبتھ نے عمداً ایسا کیا تو کیوں کسی وجہ کے بغیر وہ اس کے پاس کیوں آئی تھی اور اچانک رخصت کیوں ہو گئی تھی؟ وہ سڑکوں کے موڑ کاٹتا گیا اور نمبر دیکھتا گیا گنجان آبادی ختم ہو گئی تھی فارم ہاؤس شروع ہو گئے بڑے بڑے احاطے ان میں سے بعض کے گرد پختہ دیوار تھی باقی خاردار تاروں سے گھرے ہوئے تھے الزبتھ نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کا مکان پانچ ایکڑ کے فارم کے درمیان ہے پرانی وضع کا عالی شان محل جس کے ایک مخروطی برج پر پیتل کا بنا ہوا ہوا کا رخ بتانے والا آلہ لگا ہوا ہے۔

مرغ بادنما نمبر بالکل ٹھیک چل رہے تھے اپنے اندازے کے مطابق اس نے کار بالکل صحیح جگہ کھڑی کی اور باہر نکل آیا اس کے سامنے پانچ ایکڑ کا ایک احاطہ ضرور تھا لیکن ان میں کسی عمارت کا وجود نہ تھا۔ احاطے میں درختوں کے سائے میں خودرو گھاس لہرا رہی تھی ایک خانہ بدوش عورت نے اسے غور سے دیکھا۔

''ہلو۔'' جان سن نے کہا۔ ''یہ..... یہ نمبر سکس ایٹ سیون ہے؟ عورت نے اقرار میں سر ہلایا۔ جان سن چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا اور پھر کار میں آ بیٹھا۔ اس کا شبہ اب یقین میں بدل چکا تھا۔ ٹیلی فون غلط ہو سکتا تھا پتا بھی غلط ہو سکتا تھا۔ غیر ارادی طور پر سکس ایٹ کی جگہ کوئی بھی ایٹ سکس لکھ سکتا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ بیک وقت فون نمبر اور گھر کا پتا دونوں غلط ہوں۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ عالی شان محل اس کافر فرشتہ صفت شوہر، دولت اور آسودگی کی زندگی سب الزبتھ نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور واپس چل پڑا۔ آخر کیا ضرورت تھی الزبتھ کو یہ عارضی تعلق پیدا کرنے کی بظاہر اس کا آنا اور جانا بے مقصد ہی تھا لیکن الزبتھ ذہنی مریض نہیں تھی۔

پھر جیسے اس کے سارے سوالات کا جواب ذہن میں ایک خوفناک انکشاف بن کر ابھرنے لگا الزبتھ کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ اسے کسی نے بھیجا تھا وہ اس کے معمولات کا اس جگہ کا جہاں وہ اپنا بیشتر وقت گزارتا ہے۔ اس کی عادات و اطوار اور ان اوقات کا مشاہدہ کرنے آئی تھی۔ جب وہ اکیلا مل سکتا تھا اس کے دشمنوں نے ایک مشن الزبتھ کے سپرد کیا تھا اور الزبتھ جو اپنے حسن کی قوت تسخیر سے آشنا تھی اپنا کام کر گئی سن اے غارت گر جنس و فا سن شکست شیشہ دل کی صدا کیا۔ مگر توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا۔ اس میں تیرے ہی عکس کی جلوہ گری تھی تیرے ہی خیال کی روشنی تھی۔

ایجنسی کو واپس کرنے کی بجائے اس نے کار کو انٹرنیشنل لاؤنج کے سامنے پارکنگ ایریا میں کھڑا کیا اور پیدل چل کے دو فرلانگ دور اندرون ملک پروازوں کے اس حصے میں جا پہنچا جہاں سے مسافر روانہ ہوتے تھے پان امریکن

کے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کے اس نے کہا۔

''میں ڈاکٹر جان سن ہوں مجھے اپنے ایک مریض کے بارے میں معلوم کرنا ہے وہ شکاگو گئی ہیں۔''

''ان کا نام اور فلائٹ نمبر پلیز۔'' لڑکی نے کاروباری شائستگی سے کہا۔

''نام ہے مسز الزبتھ چارلس۔'' جان سن نے تامل کے ساتھ کہا۔ ''لیکن فلائٹ نمبر میں نہیں بتا سکتا۔ بلکہ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ وہ پان امریکن کے جہاز میں گئی ہوں گی۔ یا وہ آج ہی روانہ ہوئی۔

لڑکی نے اسے تعجب سے دیکھا اور اس کی ساری شائستگی ختم ہوگئی۔'' ہمارے پاس مذاق کے لیے وقت نہیں ہوتا سر دوسرے مسافروں کو آگے آنے دیجیے پلیز۔''

جان سن کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لائن سے نکل آیا اس کے پیچھے نوجوان پادریوں کی ایک جماعت روم جانے کے لیے صف بستہ تھی۔ جان سن کو اپنے احمقانہ سوال پر لڑکی کا برا ماننا برحق لگا۔ ائر پورٹ سے دن بھر میں ہزاروں مسافر روانہ ہوتے ہیں درجنوں فضائی کمپنیوں کی سیکڑوں پروازیں شکاگو جاتی ہیں اور پھر یہ اس نے کیسے فرض کرلیا کہ وہ ہوائی جہاز سے گئی ہوگی وہ کار میں بھی جا سکتے ہیں۔

اسے اپنے پیچھے کاؤنٹر پر دو مختلف زبانوں میں گفتگو سنائی دی وہی لڑکی سخت پریشانی کے عالم میں پادری کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ مگر زبان یار من ترکی کہ من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔ پادری انگریزی نہیں سمجھتا تھا اور لڑکی اطالوی سے ناآشنا تھی۔

''آپ میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں سمجھتا فادر۔'' لڑکی نے عاجز آ کے کہا۔

''ڈون وینٹن ...... ڈون وینٹن۔'' قطار میں سے کسی نے چلا کے کہا۔ یہ دو الفاظ بم کی طرح تھے جان سن کا وجود پل بھر کے لیے دھماکے سے مفلوج ہوگیا۔ پھر وہ اس شخص کی طرف لپکا جس نے ڈون وینٹن کا نام لیا تھا۔

''تم ...... تم ڈون وینٹن ہو؟'' جان سن نے ہکلا کر کہا۔ ''یا تم جانتے ہو ڈون وینٹن کون ہے۔''

اس شخص نے اپنا بازو چھڑالیا۔ باقی پادری بھی جان سن کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''ابھی تم نے کہا تھا ڈون وینٹن۔''

''ڈون وینٹن۔'' اس پادری نے ناگواری سے ایک طویل قامت پادری کی طرف اشارہ کیا۔ طویل قامت شخص آگے بڑھا اور شفقت سے مسکرایا۔ جان سن کو احساس ہوا کہ اس نے پریشانی میں فادر کسی کو نہیں کہا تھا۔

''یس مائی سن۔'' طویل قامت پادری نے کہا۔ ''میں کارڈینل جوزف ہوں یہ لوگ مجھے ڈون وینٹن کہتے ہیں۔''

''ہولی فادر۔'' جان سن نے اس کے ہاتھ کو عقیدت سے تھاما۔

''ڈون وینٹن آپ کا اصل نام تو نہیں ہے۔''

کارڈینل جوزف مسکرایا۔ ''او نو، اس کا مطلب ہے بڑا آدمی دی بگ مین۔''

''تھینکس، تھینکس یو فادر۔'' جان سن نے کہا اور اس کا ہاتھ چوم کر بے تحاشا بھاگا بہت سی نگاہوں نے اسے مخبوط الحواس جان کے اس کا تعاقب کیا مگر وہ ایک ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا۔ اس کے کانپتے ہاتھوں نے ایک نمبر ملایا۔

''سارجنٹ اینجلو میں ڈاکٹر جان سن بول رہا ہوں۔''

''جان سن۔'' اینجلو کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔

''مائیکل تمہارے وارنٹ لیے گھوم رہا ہے اس نے تمہیں مفرور مجرم قرار دے دیا ہے ہر پولیس اسٹیشن کو اور ہر پولیس کار کو تمہارا حلیہ اور تمہارا فوٹو پہنچا دیا گیا ہے۔''

''اینجلو۔'' جان سن نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے معلوم کرلیا ہے ڈون وینٹن کون ہے؟''

''کیا؟'' اینجلو نے تقریباً چلا کے کہا ''کون ہے ڈون وینٹن؟''

''اینجلو۔ یہ کوئی نام نہیں ہے۔'' جان سن نے کہا۔

''یہ اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ بڑا آدمی، دی بگ مین نارمن ٹھیک کہتا تھا کہ کوئی گروہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے ڈائمنڈ کنگ جمی براؤن۔'' جان سن نے بے اختیار کہا۔ ''سنو جان سن۔'' اینجلو نے تشویش سے کہا۔

''تم نے یہ بات کسی کو بتائی تو نہیں ہے ابھی تک۔''

''نہیں۔'' جان سن نے کہا۔ ''جیسے ہی مجھ پر انکشاف ہوا میں نے تمہیں فون کر دیا میں ائر پورٹ سے بول رہا ہوں۔''

''آل رائٹ۔'' اینجلو نے کہا۔ ''اب تم وہیں رہو باہر بالکل مت نکلنا میں آ رہا ہوں۔''

''میں تمہیں ایک پرائیویٹ کار میں ملوں گا۔'' جان سن نے کہا۔

''انٹرنیشنل ونگ کے سامنے کار کا نمبر نوٹ کرو۔''

''نہیں۔'' اینجلو نے کہا۔

''اس کار کو وہیں رہنے دو ممکن ہے کسی دشمن نے یا پولیس نے اس کار کو دیکھ لیا ہو میں پولیس کار لے آؤں گا لیکن اس پر پولیس کا نشان کوئی نہیں ہوگا۔ یہ ایف بی آئی کی کار ہوگی۔''

جان سن نے آدھا گھنٹہ اضطراب کے عالم میں گھڑی دیکھتے گزارا۔ اس دوران وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑا آنے جانے والوں کا جائزہ لیتا رہا یہاں وہ کسی کی گولی کا براہ راست نشانہ نہیں بن سکتا تھا۔ جب تک کہ مارنے والا سامنے نہ آ جائے اور ضرورت پڑنے پر اوپر بھاگ سکتا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اوپر کیا ہے لیکن کسی نہ کسی کمرے میں کار پیڈور یا دوسرے زینے کے راستے فرار ہو کے جان بچائی جا سکتی تھی۔ جب اس نے نیلے رنگ کی ایک شاندار پلائی ماؤتھ کو اس میں سے اینجلو کو برآمد ہوتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

خدا کا شکر ہے کہ تم ابھی تک تو زندہ ہو۔'' اینجلو نے مسکرا کے کہا۔ ''اگر تم نے کسی اور سے یہ بات کہہ دی ہوتی مارے گئے تھے۔'' جان سن مسکرایا اور کار کا اگلا دروازہ کھول کے اینجلو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کار کی کھڑکیوں میں پولرائزڈ شیشے لگے ہوئے تھے ان میں سے باہر منظر دیکھا جا سکتا تھا لیکن باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

''پولیس کے مقابلے میں ایف بی آئی کے پاس بہت جاندار کاریں ہیں۔'' جان سن نے کار کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

''ان کا کام بھی تو ہمارے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔'' اینجلو نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''حفاظتی اقدامات ایسے ہی ہوتے ہیں کبھی کبھی تو سربراہان مملکت کو بھی چھپا کے لے جانا پڑتا ہے۔'' اینجلو کی نگاہ سڑک پر تھی لیکن جان سن دیکھ رہا تھا کہ کار کے اندر کوئی ہینڈل نہیں ہے۔ نہ دروازہ کھولنے کے لیے نہ شیشہ اتارنے کے لیے اس نے سوالیہ نظروں سے اینجلو کی طرف دیکھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز نے کہا۔

''پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ڈاکٹر جان سن۔''

جان سن نے گھوم کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر وہی دونوں بیٹھے تھے جن کی نظروں کے سامنے سے وہ دو بار دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک بار لفٹ میں سے اور دوسری بار اسٹریچر پر لیٹ کر وہ دونوں جڑواں بھائی لگتے تھے۔ یہ انکشاف کہ وہ خود اتنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا ہے اور اینجلو جس کو اس نے ہمیشہ دوست سمجھا تھا۔ اس کا اصل دشمن ہے اتنے غیر متوقع طور پر اچانک ہوا تھا کہ جان سن کو صدمے نے مفلوج کر دیا۔

''صرف اپنی نظر باہر کے منظر پر رکھو ڈاکٹر جان سن۔'' ایک نے ریوالور کی آہنی انگلی سے اشارہ کیا۔ ''باہر نکلنے کا خیال چھوڑ دو۔''

''کتنی پر لطف بات ہے کہ تم بھرے بازار میں سے گزر رہے ہو مگر کسی کو معلوم نہیں۔'' دوسرا ہنسا۔

''اور تم کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔''

جان سن نے کسی سے کچھ نہیں کہا اس نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا ایک موہوم سی امید پر کہ شاید اس بار بھی بچانے والا ہاتھ جو مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے اسے پھر بچا لے اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہ تھا۔ کار شہر کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر کر مضافات میں پہنچ گئی اور شاہراہ کو چھوڑ کر ایک نسبتاً تنگ سڑک پر مڑ گئی اس کے بعد کار اتنی مرتبہ دائیں بائیں ہوئی کہ جان سن کے لیے راستہ یاد رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اینجلو عمداً سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اسے چکر دے رہا تھا۔ ایک ویران سڑک پر چلتے چلتے کار اچانک مڑ کر ایک فارم ہاؤس کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ اس کا رقبہ پانچ ایکڑ کے لگ بھگ تھا۔ وسط میں ایک پرانے محل کی باوقار عمارت ایستادہ تھی جس کے ایک مخروطی برج پر پیتل کا بنا ہوا مرغ بادنما ہوا

کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

☆❁☆

پولیس کی نوکری پرخطر بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ اٹھارہ سال میں اس نے اپنی تمام صلاحیت جرائم کا سراغ لگانے کے لیے وقف کردی تھی اور تمام توانائی مجرموں سے لڑنے میں صرف کردی تھی۔ ان گنت مجرم، چور، ڈاکو، قاتل، جنسی جنونی، اسمگلر اس کوکوششوں کے طفیل کیفر کردار کو پہنچے تھے۔ بہت سے رہا ہونے کے بعد شریفانہ زندگی کا عہد نبھا رہے تھے۔ کچھ جیل خانوں میں پرانے استادوں سے تربیت پا کے نکلے تھے اور زیادہ سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے لگے تھے پہلی قسم کے لوگ وہ تھے جو حالات سے مجبور ہو کر مجرم بنے تھے یا کسی حادثے کی طرح اتفاقیہ جرم میں ملوث ہوگئے تھے۔ اپنے دفاع میں یا اشتعال کے عالم میں قتل کر بیٹھے تھے۔ دوسری قسم کے لوگ ماحول کے بگاڑے ہوئے تھے اور ان میں بدی کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی۔ اٹھارہ سال میں کچھ جیل خانوں میں مر گئے تھے۔ کچھ جیل سے باہر آ کے مائیکل کا واسطہ ایسے لوگوں سے بھی پڑا تھا جو دوسرے کے جرائم کی سزا بھگتنے پر مجبور ہوئے یا بے گناہ ہونے کے باوجود حالات و واقعات کی شہادت پر پکڑے گئے کبھی کبھی اس کی دلی ہمدردی قاتل کے ساتھ بھی ہوئی تھی اور وہ سوچا تھا کہ شاید ان حالات میں وہ خود بھی قتل ہی کرتا لیکن اس تمام عرصے میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ خود پولیس میں ایک خطرناک مجرم شامل ہوگیا تھا۔ وہ قانون کے محافظ کا لباس پہنے قانون شکن عناصر کی پشت پناہی کر رہا تھا اور غضب یہ تھا کہ مائیکل کی آنکھوں میں دھول جھونکنے پر آمادہ تھا۔ چراغ تلے اندھیرا تھا اور اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کے وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے کسی کی نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن مائیکل نے بہت پہلے تاڑ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور اس کی قیافہ و زمانہ شناس نظر نے مجرم کو شناخت کرلیا تھا۔

اس نے اپنی کار پولیس کمشنر کے دفتر کے باہر روک لی۔ کمشنر اپنے کمرے سے اپنے کمرے میں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ''آئی ایم سوری سر۔'' مائیکل نے کہا۔ ''چند سیکنڈ کے فرق سے گڑبڑ ہوگئی میں ڈاکٹر جان سن کو خبردار کرنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے اسپتال جا پہنچا تھا لیکن اسے خبر مل گئی اور وہ غلط فہمی کے باعث کھڑکی سے کود کر نکل گیا۔''

''کہیں سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں؟'' کمشنر نے مایوسی سے کہا۔

''نو سر لیکن ان کا غائب ہوجانا بعید از قیاس ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی انہیں ضرور دیکھ لے گا۔'' جان سن کے پاس کرائے کی کار ہے اس کا نمبر رنگ ماڈل سب مشتہر کردیا گیا ہے۔

کمشنر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی تھی۔''

مائیکل نے ٹوپی میز پر رکھی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ کچھ دکانداروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتا ہے اور جمی کا آدمی ہے میرے پاس گمنام ٹیلی فون آئے تھے جب میں نے متعلقہ افراد سے رابطہ قائم کیا تو ان سب نے انکار کردیا لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ خوف کے باعث انکار پر مجبور ہیں۔ بعد میں یہ شہادت درست ثابت ہوئے جب کال مارک کا قتل ہوا تو وہ میرے پاس آیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میری تعریف میرے منہ پر کرنے لگا کہ میں نے آپ کی ذہانت کا ذکر اکثر سنا ہے اس کیس میں آپ مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں تو میں بھی کچھ سیکھ لوں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دلچسپی بے سبب نہیں بہت جلد مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کا نشانہ ''ڈاکٹر جان سن کی ذات ہے۔''

''ڈاکٹر جان سن جیسے بے ضرر آدمی سے اس کی دشمنی سمجھ میں آئی۔'' کمشنر نے ٹہلتے ہوئے کہا۔

''میں یہی معلوم کرنے کے چکر میں ہوں۔'' مائیکل نے کہا۔

''میں نے شروع سے اپنا رویہ یہ رکھا تھا جیسے میں ڈاکٹر جان سن کو مجرم سمجھتا ہوں اور اسے گرفتار کرنے کے لیے بہانہ تلاش کر رہا ہوں ذاتی انتقام کے لیے۔''

''اوہ یس۔'' کمشنر نے کہا۔ ''یہ بات اس نے مجھ سے بھی کہی تھی وہ مجھے تم سے بدظن کرنا چاہتا تھا۔''

''دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ جان سن گرفتار ہو۔'' مائیکل نے کہا۔

''جیل میں جان سن کو قتل کرنا مشکل تھا ایک بار اس

نے پولیس کے مال خانے سے ڈاکٹر کے کلینک کی وہ چابیاں حاصل کرلی تھیں جو کیرل کی لاش کے ساتھ آئی تھیں کسی نے شک اس لیے نہیں کیا کہ وہ اس کیس کی تحقیقات میں میرے ساتھ شریک تھا۔ اس روز ڈاکٹر اپنی ذہانت سے بچ گیا اس روز ہی کیا محض ذہانت کے باعث کل بھی وہ بچ کر نکل گیا۔ ایک بار قاتل لفٹ میں اس کے ساتھ سوار ہوگئے مگر وہ انہیں غچہ دے گیا نارمن موڈی کی موت کا مجھے افسوس ہے۔"

"وہ اتنی جلد یہ معلوم کرنے میں کیسے کامیاب ہوگیا تھا کہ اصلی مجرم کون ہے۔" کمشنر نے کہا۔

"ایک تو وہ زمین میں تھا۔" مائیکل نے کہا۔ "دوسرے اینجلو نے پہلے ایک شخص کو منشیات کا دھندا کرنے کے الزام میں دھرلیا تھا نارمن نے اس کیس میں مجرم کی مدد کی تھی اور اسے صاف بچالیا تھا یہ ثابت ہوگیا تھا کہ اصل مجرموں کی پردہ پوشی کے لیے اسے قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا اور نارمن کی زندگی اور وقت بھی خطرے میں پڑگئی تھی لیکن وہ بچتا رہا اس نے جمی کے گروہ سے ٹکر لینے سے گریز کیا۔ اس مرتبہ اینجلو کا نام سنتے ہی اور یہ معلوم ہوتے ہی کہ ایک نامور ماہر نفسیات کو قتل کے الزام میں پھنسایا جارہا ہے اس کا ذہن فوراً جمی کے گروہ کی طرف گیا تھا۔ وہ جان سن سے ملتا تو اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کردیتا مگر جو لوگ جان سن کے پیچھے تھے وہ نارمن کے پیچھے بھی لگ چکے تھے انہوں نے نارمن کو ماردیا تاہم مرتے مرتے وہ جان سن کو ایک اشارہ دے گیا۔ ڈون ویٹنن کا۔ میں نے دوسرے ہی دن اس کا اصل مطلب معلوم کرلیا تھا اور مجھے اسی روز سے جان سن کی زندگی زیادہ خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔"

میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی پولیس کمشنر نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔

"یس۔" اس نے کہا اور ریسیور مائیکل کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہارے لیے کوئی پیغام ہے۔" مائیکل نے ریسیور لے لیا۔

"ہاں۔" مائیکل نے کہا پھر وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ "فائن نیو جرسی کو جانے والی سڑک کی مکمل ناکہ بندی کردو کوئی بھی کار تلاشی اور چیکنگ کے بغیر نکلنے کی کوشش کرے اس کا پیچھا کرو فائیو اسٹار کمپنی کی رپورٹ کیا ہے؟" وہ پھر کچھ دیر چپ رہا اور سر ہلاتا گیا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

"اینجلو اسٹیٹ کار لے گیا ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایف بی آئی میں بھی اس کا کوئی ایجنٹ ہے ایک پیٹرول کار نے اطلاع دی ہے کہ یہ کار نیو جرسی جانے والی سڑک پر سامنے سے آئی لیکن اس سے قبل کہ دوسری کار پلٹ کر اس کے پیچھے جاتی اینجلو کی کار غائب ہوگئی۔ میرا خیال تھا وہ ڈاکٹر جان سن کو بھی فائیو اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی لے جائیں گے۔ اس کا مالک ڈائمنڈ کنگ جمی براؤن ہے لیکن وہ ادھر نہیں گئے ان کی سمت مختلف ہے۔"

......☆❀☆......

کمرہ بکنگھم پیلس کے کسی کمرے سے کم نہیں تھا۔ اس کی آرائش پر جتنی دولت صرف کی گئی تھی اتنی ڈاکٹر جان سن سال بھر میں نہیں کماتا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ سامان آرائش کے انتخاب کو بھی دخل ہے مصوری کے ان نمونوں کی قیمت کا وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا جو دیواروں پر آویزاں تھے۔

کمرے میں اس سمیت پانچ افراد تھے تین اسے لے کر آئے تھے۔ چوتھا وہ خود تھا اور پانچواں صاحب خانہ جیسے دیکھتے ہی جان سن سمجھ گیا تھا کہ وہ "ڈون ویٹنن" ہے۔ دی بگ مین وہ قد وقامت ہی میں بڑا نہیں تھا۔ اس کے انداز واطوار میں وقار تھا اور سنجیدگی تھی اس کی حرکات و سکنات سے اپنی ذات پر مکمل اعتماد اور اپنے احساس برتری کا پتا چلتا تھا مگر اسے غرور نہیں کہا جاسکتا تھا اس کی گفتگو میں شائستگی تھی اور اس کا لہجہ نرم تھا۔ اس کا لباس جدید ترین فیشن کے مطابق اور قیمتی تھا اور اس کی دلکش شخصیت کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرتا تھا۔

"ڈاکٹر جان سن۔" اس نے چیکوسلواکیہ کے بلوریں جام شراب کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں تحلیل نفسی کا ماہر تو خیر نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ ماہرین نفسیات کا طریقہ علاج کیا ہے وہ مریض کو لٹا دیتے ہیں اور اس کی سنتے رہتے ہیں وہ اپنے بارے میں اپنے ماحول اپنے بچپن کے حالات اپنی زندگی کے مختلف تجربات اور اپنے اردگرد رہنے والوں کے بارے میں بتاتا

Pakistanipoint.com

رہتا ہے۔ جو کچھ اس کے دل میں ہو زبان پر آ جاتا ہے اور تم لوگ اسے ریکارڈ کرتے جاتے ہو کیا یہ غلط ہے؟''

''نہیں۔'' ڈاکٹر جان سن نے کہا۔ ''نفسیاتی الجھنوں کا پتا اسی طریقے سے چلتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔''

''حقیقت میرے لیے تمہارے ہی زبان سے نکلی ہوئی بات نہیں ہو سکتی۔'' اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ چار مہینے تک میری بیوی تم سے تخلیے میں ملتی رہی اور تمہارے کلینک میں لیٹ کر ایک ایک گھنٹے تک باتیں کرتی رہی۔ یہ باتیں کیا تھیں ان کا ریکارڈ تمہارے پاس یقیناً ہوگا انکار تو کیرل نے بھی کیا تھا مگر اس کا انجام تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔''

''مسٹر ڈان مارکو۔'' جان سن نے اس دھمکی سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے یہ بات معلوم بھی نہ تھی کہ الزبتھ تمہاری بیوی ہے۔ اس نے کبھی تمہارا نام بھی نہیں لیا تھا۔'' یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ اس نے شوہر کا نام چارلس بتایا تھا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' ڈان مارکو نے کہا۔ ''میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ میں افشائے راز کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اور میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ الزبتھ کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا ہو بیویوں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی جب الزبتھ نے تمہارے پاس جانا شروع کیا تھا تو مجھے اطلاع مل گئی تھی میرا خیال تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور تم سے نہیں کسی لیڈی ڈاکٹر سے ملنے جاتی ہے اس عمارت میں تو درجنوں کلینک ہیں لیکن تمہارا نام سن کر مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہوئی پھر مجھے الزبتھ کی اور تمہاری ملاقات کی خبریں برابر ملتی رہیں یہ کہ وہ کس دن کتنے بج کر کتنے منٹ پر تمہارے کمرے میں پہنچی اور کتنے بج کر کتنے منٹ پر برآمد ہوئی۔ میرے دوستوں کا جو کاروبار میں میرے شریک بھی ہیں۔ یہ خیال تھا کہ الزبتھ کو قتل کر دیا جائے لیکن میں نے کہا کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ الزبتھ جان سکی ہے وہ تو ڈاکٹر کی فائلوں میں اور اس کے ٹیپ پر ریکارڈ ہو چکا ہے کیرل سے ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ ایسا کوئی ٹیپ یا فائل نہیں اور وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی کیونکہ جو طریقے ہم نے آزمائے تھے وہ سچ اگلوانے کے سو فیصد کامیاب طریقے ہیں چنانچہ اب جو کچھ ہے وہ تمہارے ذہن میں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تمہیں ختم کیا جائے کارل مارک تو خیر تمہارے دھوکے میں مارا گیا کیونکہ اس نے تمہارا رین کوٹ پہن رکھا تھا اب تم یہ بتاؤ کہ چار مہینے تک الزبتھ تم سے میرے بارے میں کیا کہتی رہی۔''

''مسٹر مارکو۔'' جان سن نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ ''تمہارے اور میرے کاروبار میں بہت فرق ہے چنانچہ ایسی بہت سی باتیں ہیں جو تم نہیں سمجھ سکتے تمہارا ذہن انہیں قبول نہیں کر سکتا میری اور تمہاری پوزیشن میں بھی بہت فرق ہے۔ یہاں تمہارے ایک اشارے پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ میرے جھوٹ اور سچ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم بہرحال مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے لائے ہو اور مجھے یہاں سے زندہ بچ کر نکل جانے کی ذرا بھی امید نہیں۔ تم خود کہہ چکے ہو کہ یہ خطرہ تم مول لے ہی نہیں سکتے چنانچہ میرے لیے جان بچانے کی خاطر جھوٹ بولنا بے مقصد ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں الزبتھ نے تمہارے یا تمہارے کاروبار کے بارے میں مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ یہ بات میرے لیے بھی باعث تعجب ہے کہ اس ذکر کو وہ ہمیشہ ٹال کیوں جاتی ہے اگر کسی نے تم سے کہا ہے یا خود تم نے فرض کر لیا ہے کہ یہ چار مہینے میں نے اور الزبتھ نے عشق لڑاتے گزارے ہیں تو میں انجام کی پروا کیے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ قصور جھوٹ بولنے والے کا یا تمہارے حاسد ذہن کا ہے۔''

''ہر شوہر حاسد ہوتا ہے۔'' مسٹر جان سن خصوصاً وہ شوہر جس کی بیوی الزبتھ کی طرح حسین ہو۔'' ڈی مارکو مسکرایا۔

''انسیت کا ایک رشتہ ہر مریض اور ڈاکٹر کے درمیان ضرور قائم ہو جاتا ہے۔'' جان سن نے کہا۔

''انسیت؟'' ڈی مارکو نے مداخلت کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''مائی ڈیئر ڈاکٹر۔'' الزبتھ تمہارے عشق میں اس حد تک دیوانی ہو گئی ہے کہ اس نے میرے ساتھ جانے سے ہی نہیں میرے ساتھ رہنے سے بھی انکار کر دیا ہے کیا یہ ممکن ہے۔''

جان سن بھونچکا رہ گیا۔ اگر اس انکشاف پر وہ خوشی سے

مرجاتا تو بڑا اچھا تھا اس نے بڑے دکھ سے سوچا یا اس نے جرم الفت سے انکار نہ کیا ہوتا خود اپنی نظر میں اس عشق کو رسوا نہ کیا ہوتا جو اسے الزبتھ سے تھا اسے اپنی زندگی کی فکر نہ تھی۔ وہ صرف الزبتھ کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' جان سن نے کہا۔ ''اگر الزبتھ کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔''

''تو تم اس کی غلط فہمی رفع کر سکتے ہو۔'' ڈی مارکو نے پھر اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اس سے کہہ سکتے ہو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے ممکن ہے اس کے بعد وہ اپنا ارادہ بدل دے میرے ساتھ جانے پر اور میرے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو جائے۔''

☆❁☆.....

سال بھر پہلے وہ ہالی ووڈ پہنچی تھی۔ ان ہزاروں لڑکیوں کی طرح جو ہر سال الزبتھ ٹیلر اور صوفیہ لورین بننے کے خواب دیکھتی فلموں کی اس نگری میں وارد ہوتی ہیں اور ایکسٹرا ماڈل یا کال گرل کے پیشے میں طبع آزمائی کرنے کے بعد بھی ناکامی مقدر ہو تو اسٹریٹ گرل ضرور بن جاتی ہے۔ لیکن وہ اس روایتی طریقے سے فلم ورلڈ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ایک کزن اسکرپٹ رائٹر تھا۔ اپنی نئی فلم کے لیے اس نے الزبتھ کو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے متعارف کرایا معمولی سے امتحان کے بعد اسے اداکاری کی صلاحیت کا سرٹیفکیٹ مل گیا لیکن کنٹریکٹ ملنے کا انحصار دیگر صلاحیتوں پر تھا جو الزبتھ میں سرے سے مفقود تھیں۔ دل برداشتہ ہو کے اس نے اپنی دنیا میں لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں وہ بچوں کے ایک اسکول میں پڑھاتی تھی آخری رات اس کے اسکرپٹ رائٹر کزن نے اس کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا اس ڈنر میں وہ ڈی مارکو سے ملی اور اس کی شخصیت سے مسحور ہو گئی۔ ڈی مارکو نے کسی غرور کے بغیر اعتراف کیا کہ وہ فائیو اسٹار نام کی تمام کمپنیوں کا بلا شرکت غیرے مالک ہیں اور ان کمپنیوں کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے جن میں مختلف قسم کے کارخانے کلب اور ہوٹل ٹرانسپورٹ کے ادارے اور پبلشنگ ہاؤس شامل ہیں۔ الزبتھ کے لیے تصور کرنا محال تھا کہ ایک شخص اتنے مختلف نوعیت کے اتنے بہت سے کاروبار کیسے چلا سکتا ہے اور کیسے

اللہ تعالیٰ روزانہ نماز کی ہر رکعت میں مرد عورت سے، عالم جاہل سے، نیک غافل، پڑھا ہوا، ان پڑھ..... غرض ہر ہر بندے بندی سے ایک اعتراف کراتا ہے کہ تم یہ مانو کہ مجھے زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں آتا۔

تم یہ مانو کہ میں جاہل ہوں.....

تم یہ مانو کہ مجھے کچھ نہیں آتا.....

جب تک یہ تسلیم نہ ہو کہ مجھے کچھ نہیں آتا، کون سیکھنے کا ارادہ کرتا ہے؟ جب پہلے ہی یہ ذہن میں سمایا ہوا ہو کہ مجھے تو سب پتا ہے۔

ابابیل..... محمد شعیب

اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر کتنی دولت کا مالک ہے اور ہر روز اس میں کس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈی مارکو اس کے سوال پر بے اختیار ہنس پڑا۔ ''مس الزبتھ یہ تو میں نے آج تک نہیں سوچا مگر بلا وجہ اس چکر میں پڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے کہ ملین کے بلین ہو گئے ہیں یا بلین کے ملین یہ بینک والے اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور ساٹھ جنرل منیجر کس لیے ہیں۔'' الزبتھ کی سمجھ میں یہ نہیں آئی لیکن ڈی مارکو نے اسے شادی کا پیغام دیا تو صرف ایک رات میں ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ جو دولت عزت اور شہرت اسے فلموں میں برسوں بے آبرو ہو کے ملنا غیر یقینی تھی وہ بڑی آبرومندی کے ساتھ اس کے قدموں میں ڈال دی گئی ہے اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو الزبتھ نے اپنا مقدر جان کے قبول کر لیا۔ یہ انکشاف کہ خوش بختی کے پردے میں سیہ بختی گھات لگائے بیٹھی تھی اس پر رفتہ رفتہ ہوا۔ ڈی مارکو اچانک تفکرات کا شکار ہو جاتا تھا اور اس کی مہذب نرم رو اور دلکش شخصیت یکلخت تند مزاج وحشی اور سفاک رویہ اختیار کر لیتی تھی یا وہ صبح اٹھ کر دیکھتی تھی کہ ڈی مارکو غائب ہے کئی کئی دن اس کا پتا نہیں ملتا تھا اور اس کی غیر حاضری میں مختلف لوگ اس کے بارے میں فون کر کے بتاتے تھے کہ اگر ایف بی آئی والے سوال کرنے آئیں تو اسے کیا کہنا چاہیے پہلی بار تو وہ گھبرا گئی تھی ایف بی آئی والے وہ کیوں آئیں گے لیکن اس کیوں کے جواب میں بڑی درشتی سے کہا گیا تھا کہ یہ ڈی مارکو چاہتا ہے اس کے بارے میں کوئی

یہ سوال نہیں کرسکتا کہ کیوں چاہتا ہے چنانچہ وہ مزید ڈر گئی تھی اور جب ایف بی آئی والے واقعی آپہنچے تھے اس نے پڑھایا ہوا سبق دہرا دیا تھا۔ لیکن شہادت اور تجسس کے جذبات ختم نہیں ہوئے تھے ڈی مارکو بالکل اچانک وارد بھی ہوجاتا تھا اسی طرح ہنستا مسکراتا مطمئن اور پرسکون یوں جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا اس نے الزبتھ کو بڑی نرمی سے سمجھا دیا تھا کہ اسے پریشان ہونے یا کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے اس پابندی نے ذہنی الجھنوں کو جنم دیا تھا اور وہ مشورے کے لیے ڈاکٹر جان سن کے پاس چلی گئی تھی لیکن اس سے الجھنوں میں اضافہ ہوگیا۔ بالکل غیر متوقع طور پر وہ جان سن کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔

یہ بڑی شرم کی بات تھی ابھی ایک عشق کا سلسلہ ختم بھی نہ ہوا تھا اور اپنے اندیشوں کے اور اپنی پریشانیوں کے باوجود وہ ایک ایسے شخص کی بیوی تھی۔ جس سے اسے کوئی شکایت نہ تھی بجز اس بات کے کہ وہ اس کے کاروبار کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ مردوں کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں بے سبب پریشان ہونا بیوی کے فرائض میں تو شامل نہیں اور پھر وہ صحیح طور پر اس کاروبار کی نوعیت کو خود نہیں سمجھ پائی تھی تو جان سن کو کیا سمجھاتی۔ دوسری بار وہ زیادہ یقین کے ساتھ گئی تھی کہ آج کھل کے اپنی پریشانی کا ذکر کردے گی۔ مگر جان سن کے سامنے اس کی قوت گویائی سلب ہوگئی اور وہ پہلے سے زیادہ بے بسی اور مجبوری کے احساس کے ساتھ تیسری مرتبہ نہ جانے کا عزم لے کر لوٹی مگر تیسری مرتبہ اور پھر چوتھی مرتبہ اور اس کے بعد چار ماہ تک وہ برابر جاتی رہی اس کی ساری خود اعتمادی ختم ہوگئی اور جان سن کا خیال مکڑی کے جالے کی طرح اس کے تصورات پر پھیلتا گیا لیکن اسی دوران پر اسرار واقعات کا ایک اور سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے اس نے اخبار میں جان سن کا نام تیسری ملاقات کے بعد دیکھا کسی نے ایک مریض کو جان سن سمجھ کر قتل کردیا تھا۔ اسی روز شام کو وہ جان سن سے وقت لیے بغیر ملنے جا پہنچی اور رسمی اخلاق کے ساتھ اپنی تشویش کا اظہار کرآئی پھر جان سن کی سیکرٹری کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کردیا گیا۔ اس نے پڑھا کہ شبہے کا اظہار خود جان سن پر کیا جارہا ہے تو اسے یقین نہ آیا کہ پولیس اس حد تک بے وقوف ہوسکتی ہے اس نے پولیس کمشنر کو فون کیا اور بتایا کہ جان سن جیسے فرشتہ سیرت انسان کے بارے میں یہ سوچنا بھی دیوانگی ہے کہ وہ قتل کا مجرم ہے مگر پولیس کمشنر نے اسے ہنس کر ٹال دیا کہ محترمہ یہ ہمارا کام ہے اور ہم سمجھتے ہیں جان سن نہ سہی دنیا میں فرشتے کا بہروپ بنا کے پھرنے والے شیطانوں کی کمی نہیں۔

جس حادثے نے الزبتھ کو نروس کردیا وہ نارمن موڈی کی موت تھی اس نے اخبار میں دیکھا کہ خود جان سن نے اس پرائیویٹ سراغرسان کی خدمات حاصل کی تھیں اور جب فائیو اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی۔'' میں نارمن موڈی کی لاش دریافت ہوئی تو پولیس کے ساتھ ڈاکٹر جان سن بھی تھا۔ الزبتھ جانتی تھی کہ فائیو اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی اس کے شوہر کی ہے اس کے باوجود پولیس کا کوئی آدمی اس کے شوہر سے سوال کرنے نہیں آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ نارمن موڈی کی موت کے بعد تین دن تک ڈی مارکو گھر سے نہیں نکلا تھا اور اس نے کمپنی کے چھپے ہوئے لیٹر ہیڈ جلا دیے تھے جو اس کی میز کی دراز میں پڑے رہتے تھے ان تین دنوں میں اس کی شخصیت کا دوسرا روپ الزبتھ کے سامنے رہا تھا چنانچہ وہ کوئی سوال کرنے کی جرات نہ کرسکی تھی مگر اس کے شبہات نے تقویت حاصل کرلی تھی۔ ان تمام پر اسرار واقعات میں جو ڈاکٹر جان سن کے ساتھ پیش آئے اس کے شوہر کی ذات کسی نہ کسی صورت ملوث تھی۔

سوال یہ تھا کہ کیوں؟ اور کیوں وہ لفظ تھا جس کی حیثیت شجر ممنوعہ کی طرح تھی لیکن وہ اب طے کرچکی تھی کہ اس شجر ممنوعہ کو چکھنے کی پاداش میں اسے یہ جنت چھوڑنی پڑے تو وہ سمجھے گی کہ عذاب جہنم سے چھوٹ گئی ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ایک کار سے اینجلو کو اترتے دیکھا تھا مگر کار کے دوسرے دروازے سے جان سن برآمد ہوا تھا تو اس پر بجلی گر پڑی تھی کیونکہ اس کے بعد کار سے وہ دونوں بھائی برآمد ہوئے تھے جو صورت سے چھٹے ہوئے لوفر اور بد معاش لگتے تھے نکی اور اکی وہ ڈان مارکو سے ڈرتے تھے لیکن الزبتھ سے ایسے بات کرتے تھے جیسے وہ کوئی معزز عورت نہیں خادمہ ہے اور عجیب بات یہ تھی کہ ڈان مارکو ان کے رویے کا برا بھی نہیں مانتا تھا۔ وہ اس کے دوست بھی تھے شریک کار بھی اور ماتحت بھی اینجلو کا تعلق پولیس سے تھا

ان چاروں کے اکٹھا ہونے کا مقصد جائز کسی صورت نہیں ہوسکتا تھا اور اب وہ ڈاکٹر جان سن کو پکڑ لائے تھے اسے اپنی اور ڈان کی گزشتہ شب کی گفتگو یاد آئی اور یکلخت بات آس کی سمجھ میں آ گئی وہ بے اختیار ٹیلی فون کی طرف لپکی لیکن دروازہ کھلا اور ڈان ان کی راہ میں حائل ہوگیا اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''کوئی تم سے ملنے آیا ہے ڈیئر۔'' اس نے الزبتھ کے اڑے ہوئے رنگ کو عمداً نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

الزبتھ نے پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر جان سن دروازے میں ہٹ تھامے کھڑا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا۔

''ڈاکٹر جان سن۔'' الزبتھ نے حیرت اور مسرت کا اظہار اپنے لہجے سے کیا۔ اس کی مسکراہٹ نے چہرے کے تاثرات نے اس کا ساتھ دیا۔ شہرت کے مواقع اس نے خود گنوا دیے تھے ورنہ وہ صف اول کی اداکارہ سے کم با صلاحیت نہ تھی۔

''مسز مارکو۔'' جان سن نے کہا۔ ''میرا خیال تھا آپ جا چکی ہوں گی۔'' وہ ایک کرسی پر ڈان کے مقابل بیٹھ گیا۔

''میں نے آخری وقت میں اپنا ارادہ بدل دیا ڈاکٹر جان سن۔'' الزبتھ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا مسز مارکو۔'' جان سن نے کہا۔ ''کیا میں اس فیصلے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

الزبتھ بڑی بے تعلقی سے اس کی طرف پشت کیے ایک کاؤنٹر پر سے تین جام اور شراب کی ایک بوتل اٹھا کے ٹرے میں رکھ رہی تھی اس نے جان سن کی طرف پلٹ کر حیرانی سے دیکھا۔ ''آپ یہی پوچھنے آئے ہیں یہاں؟''

جان سن نے دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو سراہا۔ ''نہیں مسز مارکو ایک شکایت تو یہ کرنے آیا ہوں میں کہ چار ماہ میں آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ مسٹر ڈان مارکو آپ کے شوہر ہیں۔ آپ ہمیشہ اپنے شوہر کا نام چارلس بتاتی رہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے شوہر کے کاروبار کی بات کو ہمیشہ گول کر دیا آخر کیوں؟ کیا آپ کو یہ بتاتے ہوئے شرم آتی تھی کہ فائیو اسٹار گروپ کی مالک آپ خود ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ کسی بھی عورت کے لیے فخر کی بات ہے۔''

الزبتھ کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اس نے باری باری تینوں جام بھرے اور آگے بڑھا دیے۔

''یہ بات بتانے یا نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے ڈاکٹر جان سن۔ آپ کا تعلق مریض کی ذہنی حالت سے ہوتا ہے یا اس کے معاشی حالات سے؟''

''بات صرف میرے تعلق کی نہیں ہے مسز مارکو۔'' جان سن نے تلخی سے کہا۔ ''اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کا اثر آج آپ کی ازدواجی زندگی خراب نہیں کر دیتا۔ گھٹانے کی بجائے ان کی الجھنیں بڑھاتا میرے نزدیک بددیانتی ہے۔ اپنے پیشے سے بھی اور اپنے ضمیر سے بھی۔'' جان سن کو حیرت ہوئی کہ وہ اتنی موثر تقریر کیسے کر گیا۔

ڈون مارکو باری باری ان دونوں کی صورتیں دیکھ رہا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ ڈاکٹر جان سن نے اسے بیوی کے معاملے میں مطمئن کر دیا ہے اسے یقین آ گیا تھا کہ غلط فہمی الزبتھ کو ہوئی تھی یا اس نے جھوٹ بولا تھا لیکن اصل مسئلہ بالکل الگ تھا جان سن نے الزبتھ کی جان تو بچالی تھی لیکن اپنی جان بچانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ گواہ نہ ثبوت۔ اس کے لہجے کی صداقت اس کی قسمیں ان کی یقین دہانی اس کا انکار سب بے کار تھے۔ ڈان مارکو یقینی دہانی اس کا انکار سب بے کار تھے ڈان مارکو یقین تھا کہ الزبتھ نے اسے شوہر کے کاروباری راز بتا دیے ہیں جو ٹیپ پر نہ سہی جان سن کے دماغ میں تو محفوظ ہیں اس دماغ کا وجود بھی ٹیپ سے کم خطرناک نہیں تھا بلکہ اس سے زیادہ تباہ کن تھا ٹیپ کو صاف کیا جاسکتا تھا مگر ڈاکٹر جان سن جیسے شخص کے بیان کو نہیں جھٹلایا جاسکتا تھا۔ اس خطرے سے دفاع کی ایک ہی صورت تھی ڈاکٹر جان سن کا خاتمہ بے شک الزبتھ نے اسے یہ معلومات فراہم کی تھیں لیکن اس پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی اور اندیشے کی بات ہو تو اسے بھی لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹایا جاسکتا تھا۔

''مسز مارکو۔'' جان سن نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ ''اس حماقت سے کوئی فائدہ نہیں آپ کی ازدواجی زندگی قابل رشک ہے۔ آپ کو ہر وہ خوشی نصیب ہے جس کی آرزو کوئی عورت کر سکتی ہے۔ اپنے آپ سے دشمنی مت کیجیے اس گھر کو آباد رکھیے اپ کی عزت و آبرو کا تحفظ اور آپ کی زندگی کا سکون اسی سے وابستہ ہے آج

کے جذباتی اعتماد کو اس مستقبل پر اثر انداز نہ ہونے دیجیے جب سہاروں کے بغیر زندگی بسر نہیں ہوئی خدا حافظ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا وہ مطمئن تھا کہ اس نے اپنی محبت پر ہوس کا الزام نہیں آنے دیا الزبتھ کی چاہت اس کے جسم کی پکار تھی۔ محبت کا اس سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ محبت گھر نہیں اجاڑتی اور کسی کو بہار کے خزاں نہیں دیتی اور موت کا نامہ بر نہیں بنتی۔

.....☆❁☆.....

مخالف سمت سے آنے کے باوجود جان سن کی نگاہ نے اس مقام کو پہچان لیا جہاں وہ ایک شب بارش اور طوفان میں نارمن موڈی کی لاش لینے پہنچا تھا کار ''فائیو اسٹار پیکنگ کمپنی'' کے دروازے سے اندر داخل ہوگئی اندر وہی ویرانی تھی دن میں کام کرنے والے جا چکے تھے اور چوکیدار شاید ایک ضرورت کے تحت غیر ضروری سمجھا گیا تھا جہاں دن میں آدمی کا رزق بننے والی بے زبان مخلوق کے گلے کاٹے جاتے تھے۔ اس مذبح خانے کا مرتبہ رات کو بڑھ جاتا تھا کہ یہاں اشرف المخلوقات ذبح کیے جاتے تھے جان سن زندگی کے تعلقات پر پڑھ رہا ہے۔ بقول آپ کے شوہر کے ہر آپ جیسی حسین عورت کا شوہر کا حاسد ہوتا ہے۔''

''کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں حسین ہوں۔'' الزبتھ نے بے خوفی سے کہا۔ ''یا میرے شوہر کی فطرت میں حسد کا مادہ زیادہ ہے۔''

''قصور کسی کا بھی ہو مسز مارکو۔'' جان سن نے کہا ''میرا بہر حال نہیں ہے میں صرف آپ کا معالج تھا لیکن اب مجھ پر الزام آ رہا ہے کہ میرے آپ سے ناجائز مراسم تھے اور یہ الزام آپ نے مجھ پر لگایا ہے کیوں مسز مارکو؟''

''میں..... میں نے؟'' الزبتھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ وہ کیسے ڈاکٹر جان سن یہ غلط ہے۔''

''کیا یہ غلط ہے کہ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ یورپ جانے سے انکار کیا؟'' جان سن نے تیز آواز میں کہا۔ ''اور وجہ یہ بتائی کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں اور مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ آخر میری کس بات نے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا؟ میرے پاس آپ جیسی درجنوں عورتیں آتی ہیں ٹیری برن کا نام سنا ہے آپ نے؟ وہ بھی میری مریض ہے میں مریضہ کا علاج کرتا ہوں، ان سے عشق نہیں، بیوی کی موت کے اس یقین کامل کے بعد امیدوں اور اندیشوں کو یکسر فراموش کر چکا تھا اور اس بات پر مطمئن تھا کہ وہ اس ذہنی عدم توازن کا شکار نہیں جو اعصاب کے ساتھ احساس کی شکست کا نتیجہ ہوتا ہے۔''

جانے پہچانے راستے سے وہ اندر داخل ہوئے جان سن اور ڈی مارکو ساتھ ساتھ تھے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان دونوں کی حیثیت میں کیا فرق ہے ان کے اطمینان اور باوقار انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ دونوں مالک ہیں جو اپنے کارخانے کا معائنہ کرنے آئے ہیں ان کے پیچھے آنے والا سارجنٹ اینجلو ان کا باڈی گارڈ ہے اور اینجلو کے پیچھے آنے والے دونوں بھائی ماتحت اور ملازم ہیں۔

''یہ جگہ تو تم اچھی طرح دیکھ چکے ہو؟'' ڈی مارکو نے کہا۔ ''یہ سب سرد خانے میں۔'' اس نے دائیں بائیں جانب اشارہ کیا۔ رکنے کی بجائے وہ سیدھا چلتا گیا اور بالکل سامنے آجانے والے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں نے صحیح مقام پر پہنچ کر سوئچ آن کر دیے اور ایک بہت بڑا ہال روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اس میں دیوہیکل آہنی مشینیں نصب تھیں جو جان سن نے کبھی نہیں دیکھی تھیں تم نے اس خودکار پلانٹ کو کام کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔'' ڈی مارکو نے کہا۔

''یہ کوئی لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ پہلے حصے میں جیتا جاگتا جانور کھڑا کیا جاتا ہے اور آخری حصے سے اس کا صاف کیا ہوا گوشت ڈبوں میں بند نکلتا ہے ہڈیاں اور چمڑا اور تمام فاضل حصے الگ الگ چلے جاتے ہیں اور مختلف طرح سے کام میں لائے جاتے ہیں میں تمہیں عملی مظاہرہ دکھاتا ہوں۔'' اس نے پلٹ کر دونوں ہم شکل بھائیوں میں سے ایک کو چٹکی بجا کے متوجہ کیا اس نے ایک لیور دبایا۔ ایک مشین کی گونج اس خاموشی میں صاف سنائی دینے لگی جان سن جانتا تھا کہ اس مظاہرے سے وہ جان سن کو دہشت زدہ کر کے ایک انتقامی مسرت حاصل کر رہا ہے۔ اسے یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ موت سے پہلے تصور میں وہ سب دیکھ لے جو موت کے بعد ہوگا ہر روز پیک ہو کر نکلنے والے سیکڑوں ڈبوں میں چند

ایسے ڈبے بھی شامل ہو جائیں گے۔ جس میں گائے بھینس بکرے دنبے یا سور کے گوشت کی بجائے ڈاکٹر جان سن ماہر نفسیات کا گوشت بند ہوگا۔

......☆۞☆......

الزبتھ سب سمجھ گئی تھی جھوٹ اس کے لہجے میں نہیں تھا اس کی آنکھوں میں نہیں تھا اور اس کی صو
رت پر نہیں تھا مگر اس کے دل میں تھا اسے اندازہ تھا کہ جان سن کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ اس نے اپنا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھایا اور ایک نمبر ملانے لگی خودکشی کے لیے۔

بہت دور مائیکل نے نامہ بر کی صورت کو دیکھا۔ ''کون تھی وہ؟''

نامہ بر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن ایکسچینج نے بتایا ہے کہ کال اولڈ ٹپان کے قصبے سے آئی تھی۔''

''تم نے اسے بتایا کہ ہم وہاں دیکھ چکے ہیں۔'' مائیکل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اولڈ ٹپان؟''

''یس سر لیکن اس نے کہا کہ وہ ہم سے زیادہ جانتی ہے وہ ہسٹریا میں مبتلا تھی۔'' نامہ بر نے کہا۔

یکلخت مائیکل نے جست لگائی اور پولیس کمشنر کو ہکا بکا چھوڑ کے نکل گیا اس کی ٹوپی وہیں میز پر رہ گئی۔

......☆۞☆......

ڈی مارکو نے ریوالور اور پلٹ کر اینجلو پر فائر کر دیا گولی اینجلو کے دل میں اتر گئی انتہائی حیرت کا تاثر ابھی اس کی آنکھوں میں جھلکا ہی تھا کہ دوسری گولی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کے راستے اسے سرخرو کرتی دماغ میں گھس گئی۔ وہ نیچے گرا تو اس وقت جب اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی۔

''اینجلو کا کام ختم ہو گیا تھا۔'' ڈی مارکو نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ پھر اس نے دونوں ہم صورت و ہم پیشہ بھائیوں کو اشارہ کیا ایک اور لیور دبانے سے چمڑے کی تین فٹ چوڑی بیلٹ گھومتے ہوئے آہنی پہیوں پر دوڑنے لگی۔

ان دونوں نے اینجلو کو بڑی مہارت سے اس پر پھینک دیا چند سیکنڈ میں اینجلو کا جسم آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اسے ایک مشین کا آدم خور دہانہ نگل گیا۔ جان سن کو ایک چکر آیا اور متلی سی محسوس ہوئی۔ دونوں قصاب برادران باری باری دوسرے سوئچ اور لیور دباتے جا رہے تھے ڈی مارکو گھوم گیا۔

''اب اس بیلٹ کو دیکھو اس نے بڑی دلچسپی سے کہا وہ بڑے فخر سے اپنے مہمان کو خود کو پلانٹ کی خوبیاں دکھا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نہ اس قتل کا خیال تھا جو اس نے ابھی ابھی کیا تھا اور نہ اس قتل کا جو وہ کرنے والا تھا۔ چشم تصور سے جان سن نے دیکھا کہ بے حس مشینوں کے آہنی پرزے اینجلو کے جسم سے گوشت کو نوچ کر الگ کر رہے ہیں اس کی کھال اتر کر اس شعبے میں چلی گئی ہے۔ جہاں چمڑے کو جوتے بنانے کے قابل بنایا جاتا ہے اس کی ہڈیاں کسی اور طرف نکل گئی ہیں اور خون کسی پائپ سے بہہ کر کسی ٹینک میں جمع ہو گیا ہے۔ جب لیبل لگے ہوئے بند ڈبوں کی قطار اس کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس کا دماغ جواب دے گیا۔ موت کا خوف کچھ نہ رہا۔ اس وحشی درندے کی موت ایک مقدس فریضہ بن گئی جو آدمی کو آدمی کا گوشت کھلا رہا تھا پلک جھپکنے میں اس نے ڈون مارکو جیسے شخص کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور ایک جست لگا کے بیلٹ پر اس مشین کے کھلے دہانے کے قریب پھینک دیا جس نے اینجلو کو ہضم کر لیا تھا اس کی چیخ ختم ہونے سے قبل مشین اسے بھی کھا چکی تھی۔ بدحواسی میں اس کے دونوں ماتحتوں نے مشین بند کرنے کی بجائے ریوالور نکالا اور نشانہ لیے بغیر فائر جھونک دیے جان سن نے غوطہ مارا اور ایک مشین کی اوٹ میں تھا فائر پھر سنائی دیے اس کے بعد کسی نے چیخ کر اسے پکارا لیکن یہ آواز ان دونوں بھائیوں میں سے کسی کی نہ تھی۔ جان سن نے مشین کے پیچھے سے دیکھا۔ دونوں بھائی مرے پڑے تھے اور دروازے کے قریب مائیکل ریوالور لیے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چار مسلح پولیس مین اور بھی تھے جان سن باہر آ گیا بے اختیار اس کی نظر بیلٹ پر گئی۔ اس پر سے اب بند ڈبوں کی دوسری کھیپ گزر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور مشین کو بند کر دیا۔

(انتخاب بشکریہ سید انور فراز)

Pakistanipoint.com

سنہرے لوگ

محمد سلیم اختر

انسان بعض اوقات ایسے کام کرجاتا ہے جو اس کے کرنے کہ نہیں ہوتے مگر وہ انسان ہی کیا جو غلطیاں نہ کرے مگر اچھا انسان وہ ہے جو اپنی غلطیوں کو سدھرے اور اپنے انجانے میں کی گئی غلطیوں کا ازالہ کرے،

ایک ایسے انسان کا احوال جو لوگوں کی ظاہری حالت دیکھ کرانہیں پرکھتا تھا، مگر ایسا ہوتا نہیں جیسا نظر آتا ہے

دسمبر کے اوائل کی بات ہے جب محکمہ اوقاف نے زبردستی میرے تعیناتی شیخوپورے کے امیر محلے کی جامع مسجد سے ہیرا منڈی لاہور کی ایک پرانی مسجد میں کردی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے قریبی علاقے کے ایک کونسلر کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر تعریف کرنے سے انکار کردیا تھا۔ شومئی قسمت کہ وہ کونسلر محکمہ اوقاف کے ایک بڑے افسر کا بھتیجا تھا۔ نتیجتاً میں لاہور شہر کے بدنام ترین علاقے میں تعینات ہو چکا تھا۔ بے شک کہنے کو میں مسجد کا امام جارہا تھا مگر علاقے کا بدنام ہونا اپنی جگہ۔ جو سنتا تھا ہنستا تھا یا پھر اظہار افسوس کرتا تھا۔ محکمے کے ایک کلرک نے تو حد ہی کردی۔ تنخواہ کا ایک معاملہ حل کرانے اس کے پاس گیا تو میری پوسٹنگ کا سن کرایک آنکھ دبا کر بولا۔

”قبلہ مولوی صاحب، آپ کی تو گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔“ میں تو گویا زمین میں چھ فٹ نیچے گڑ گیا۔

پھر اللہ بھلا کرے میری بیوی کا جس نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ امامت ہی تو ہے۔ کسی بھی مسجد میں سہی، اور میرا کیا ہے؟ میں تو ویسے بھی گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتی۔ پردے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اور پھر ہمارے کون سے بچے ہیں کہ ان کے بگڑنے کا ڈر ہو۔

بیوی کی بات سن کر تھوڑا دل کو اطمینان ہوا اور ہم نے سامان باندھنا شروع کیا۔ بچوں کا ذکر چھڑ گیا تو یہ بتاتا چلوں کہ شادی کے بائیس سال گزرنے کے باوجود اللہ نے ہمیں اولاد جیسی نعمت سے محروم ہی رکھنا مناسب سمجھا تھا۔ خیر اب تو شکوہ شکایت بھی چھوڑ چکے تھے دونوں میاں بیوی۔ جب کسی کا بچہ دیکھ کر دل دکھتا تھا تو یاد الٰہی میں دل لگالیتا اور وہ بھلی مانس کسی کونے کھدرے میں منہ دے کر کچھ آنسو بہا لیتی تھی۔

سامان باندھ کر ہم دونوں نے اللہ کا نام لیا اور لاہور جانے کے لیے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ بادامی اڈے پر اترے اور ہیرا منڈی جانے کے لیے سواری کی تلاش شروع کی۔ ایک تانگے والے نے مجھے پتا بتانے پر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر برقع میں ملبوس عورت ساتھ دیکھ کر چالیس روپے کے عوض لے جانے کی حامی بھر لی۔ تانگہ چلا تو کوچبان نے میری ناقص معلومات میں اضافہ یہ کہہ کر کیا کہ ”میاں جی، جہاں آپ کو جانا ہے اسے ہیرا منڈی نہیں، ٹبی گلی کہتے ہیں۔“

پندرہ بیس منٹ میں ہم پہنچ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شاید بازار کھلنے کا وقت نہیں تھا۔ دیکھنے میں تو عام سا محلّہ تھا وہ ہی ٹوٹی پھوٹی گلیاں، میلے کرتوں کے غلیظ دامن سے ناک پونچھتے ننگ دھڑنگ بچے، نالیوں میں کالا پانی اور کوڑے کے ڈھیروں پر منڈلاتی بے حساب مکھیاں، سبزیوں پھلوں کے ٹھیلے والے اور ان سے بحث کرتی کھڑکیوں سے آدھی باہر لٹکتی عورتیں، فرق تھا تو صرف اتنا کہ پان سگریٹ اور پھول والوں کی دکانیں کچھ زیادہ تھیں۔ دکانیں تو بند تھیں۔ مگر ان کے پرانے بورڈ اصل کاروبار کی خبر دے رہے تھے۔

مسجد کے سامنے تانگہ کیا رکا محلے والوں کی عید ہوگئی۔

”ابے نیا مولوی ہے۔ بیوی بھی ساتھ ہے پچھلے والے سے تو بہتر ہی ہوگا۔“

”کیا پتہ لگتا ہے بہن، مرد کا کیا اعتبار؟ ہاں ہاں سہی کہتی ہے تو۔ داڑھی والا مرد تو اور بھی خطرناک۔“

عجیب طوفان بدتمیز تھا۔ مکالموں اور فقروں سے یہ معلوم پڑتا تھا کہ جیسے طوائفوں کے محلے میں مولوی نہیں، شرفاء کے محلے میں کوئی طوائف وارد ہوئی ہو۔ اس سے پہلے کے میرے

ضبط کا پیمانہ لبریز ہوتا خدا خوش رکھے غلام شبیر کو جو ''مولوی صاحب مولوی صاحب'' کرتا دوڑا آیا اور ہجوم کو وہاں سے بھگا دیا۔ پتہ چلا کہ مسجد کا خادم ہے اور عرصہ پچیس سال سے اپنے فرائض منصبی نہایت محنت اور دیانت داری سے ادا کر رہا ہے۔ بھائی طبیعت خوش ہوگئی اسے سے مل کر۔

سامان سنبھالتے اور گھر کو ٹھیک کرتے ہفتہ دس دن لگ گئے۔ گھر کیا تھا دو کمروں کا کوارٹر تھا۔ مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا باورچی خانہ، ایک اس سے بھی چھوٹا غسل خانہ اور بیت الخلا اور ایک ننھا منا سا صحن، بہرحال ہم میاں بیوی کو بڑا گھر کس لیے چاہیے تھا۔ بہت تھا ہمارے لیے بس اردگرد کی عمارتیں اونچی ہونے کی وجہ سے تاریکی بہت تھی۔ دن بارہ بجے بھی شام کا سا دھندلکا چھایا رہتا تھا۔ گھر ٹھیک کرنے میں غلام شبیر نے بہت ہاتھ بٹایا۔ صفائی کرنے سے دیواریں چونا کرنے تک۔ تھوڑا کریدنے پے پتا چلا کہ یہاں آنے والے ہر امام مسجد کے ساتھ غلام شبیر گھر کا کام بھی کرتا تھا۔ بس تنخواہ کے نام پر غریب دو وقت کا کھانا مانگتا تھا اور رات کو مسجد ہی میں سوتا تھا۔ یوں اس کو رہنے کی جگہ مل جاتی تھی اور مسجد کی حفاظت بھی ہو جاتی تھی۔

ایک بات جب سے میں آیا تھا، دماغ میں کھٹک رہی تھی۔ سو ایک دن غلام شبیر سے پوچھ ہی لیا۔ ''میاں یہ بتاؤ کہ پچھلے امام مسجد کے ساتھ کیا ماجرا گزرا'' وہ تھوڑا ہچکچایا اور پھر ایک طرف لے گیا کہ بیگم کے کان میں آواز نہ پڑے۔

''میاں جی اب کیا بتاؤں آپ کو؟ جوان آدمی تھے اور غیر شادی شدہ بھی، محلے میں بھلا حسن کی کیا کمی ہے۔ بس دل آ گیا ایک لڑکی پر، لڑکی کے دلال بھلا کہاں جانے دیتے تھے سونے کی چڑیا کو پہلے تو انہوں نے مولانا کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، پھر ڈرایا دھمکایا لیکن مولانا نہیں مانے، ایک رات لڑکی کو بھگا لے جانے کی کوشش کی، بادامی باغ اڈے پر ہی پکڑے گئے، ظالموں نے اتنا مارا پیٹا کہ مولانا جانبر سے گئے۔'' غلام شبیر نے نہایت افسوس کے ساتھ ساری کہانی سنائی۔

''پولیس وغیرہ..... قاتل پکڑے نہیں گئے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔ غلام شبیر ہنسنے لگا۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی میاں جی، پولیس بھلا ان لوگوں کے چکروں میں کہاں پڑتی ہے۔ بس اپنا ہتھ وصول کیا اور غائب۔ اور ویسے بھی کوتوال صاحب خود اس لڑکی کے عاشقوں میں شامل تھے۔''

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ..... کہاں اس جہنم میں پھنس گئے۔'' میں یہ سب سن کر سخت پریشان ہوا۔

''آپ کیوں فکر کرتے ہیں میاں جی؟ بس چپ کر کے نماز پڑھیں اور پڑھائیں، دن کے وقت کچھ بچے آ جایا کریں گے۔ ان کو قرآن پڑھا دیں۔ باقی بس اپنے کام سے کام رکھیں گے تو کوئی تنگ نہیں کرتا یہاں۔ بلکہ مسجد امام اچھا ہو تو گناہوں کی اس بستی میں لوگ صرف عزت کرتے ہیں۔'' غلام شبیر نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا تو میری جان میں جان آئی۔

انہی شروع کے ایام میں ایک واقعہ ہوا، پہلے دن ہی دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو دروازے پر کسی نے دستک دی۔ غلام شبیر نے جا کے دروازہ کھولا اور پھر ایک کھانے کی ڈھکی طشتری لے کے اندر آ گیا۔ میرے سوالیہ نگاہوں کے جواب میں کہنے لگا۔

''نوراں نے کھانا بھجوایا ہے۔ پڑوس میں رہتی ہے۔'' میں کچھ نا بولا اور نا ہی مجھے کوئی شک گزرا، سوچا ہوگی کوئی اللہ کی بندی اور پھر امام مسجد کے گھر کا چولہا تو ویسے بھی کم ہی جلتا ہے۔ بہرحال جب اگلے دو دن بھی یہ ہی معمول رہا تو میں نے سوچا کہ یہ کون ہے۔ جو بغیر کوئی احسان جتائے احسان کیے جا رہی ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں ہی تھا جب غلام شبیر کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا۔

''میاں غلام شبیر یہ نوراں کہاں رہتی ہے؟ میں چاہتا ہوں میری گھر والی جا کر اس کا شکریہ ادا کر آئے۔''

غلام شبیر کے تو اوسان خطا ہو گئے یہ سن کر

''جی بی بی نہیں جا سکتی جی وہاں۔'' میں نے حیرانی سے مزید استفسار کیا تو گویا غلام شبیر نے پہاڑ ہی توڑ دیا میرے سر پر۔

''میاں جی، اس کا پورا نام تو پتا نہیں کیا ہے مگر سب اس کو نوراں کنجری کے نام سے جانتے ہیں پیشہ کرتی ہے جی۔''

''پیشہ کرتی ہے..... یعنی طوائف ہے..... اور تم ہمیں اس کے ہاتھ کا کھلاتے رہے ہو؟ استغفر اللہ! استغفر اللہ!'' غلام شبیر کچھ شرمسار ہو میرا غصہ دیکھ کر تھوڑی دیر بعد ہمت کر کے بولا۔

''میاں جی یہاں تو سب ایسے ہی لوگ رہتے ہیں ان کے ہاتھ کا نہیں کھائیں گے تو مستقل چولہا جلانا پڑے گا جو آپ کی تنخواہ میں ممکن نہیں۔'' یہ سن کر میرا غصہ اور تیز ہو گیا۔

''ہم شریف لوگ ہیں غلام شبیر بھوکے مر جائیں گے مگر

طوائف کے گھر کا نہیں کھائیں گے۔'' میرے تیور دیکھ کر غلام شبیر کچھ نہ بولا مگر اس دن کے بعد سے نوراں کنجری کے گھر سے کھانا کبھی نا آیا۔

جس مسجد کا میں امام تھا، عجیب بات یہ تھی کہ اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ بس ٹبی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ ایک دن میں نے غلام شبیر سے پوچھا کہ ''میاں نام کیا ہے اس مسجد کا؟'' وہ ہنس کو بولا۔

''جی اللہ کے گھر کا کیا نام رکھنا؟''

''پھر بھی کوئی تو نام ہوگا سب مسجدوں کا ہوتا ہے۔''

''بس میاں جی بہت نام رکھے جس فرقے کا مولوی آتا ہے، پچھلا نام تبدیل کر کے نیا رکھ دیتا ہے۔ آپ ہی کوئی اچھا سا رکھ دیں۔'' کچھ کھسیانا ہو کے سر کھجاتا ہوا بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ گناہوں کی اس بستی میں اس واحد مسجد کا کیا نام رکھا جائے گا؟ ہاں موتی مسجد ٹھیک رہے گا۔ گناہوں کے کیچڑ میں چمکتا پاک صاف موتی۔ دل ہی دل میں میں نے مسجد کے نام کا فیصلہ کر لیا اور اپنی پسند کو داد دیتا اندر کی جانب بڑھ گیا جہاں بیوی کھانا لگائے میری منتظر تھی۔

اب بات ہو جائے قرآن پڑھنے والے بچوں کی، تعداد میں گیارہ تھے اور سب کے سب لڑکے، ملی جلی عمروں کے پانچ سے گیارہ بارہ سال کی عمر کے، تھوڑے شرارتی ضرور تھے مگر اچھے بچے تھے، نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر آتے تھے، دو گھنٹے سپارہ پڑھتے تھے اور پھر باہر گلی میں کھیلنے نکل جاتے، کون تھے اور کس کی اولاد تھے؟ نہ میں نے کبھی پوچھا نہ کسی نے بتایا پھر ایک دن غضب ہو گیا۔ قرآن پڑھنے والے بچوں میں ایک بچہ نبیل نام کا تھا۔ یوں تو اس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن بس تھوڑا شرارتی تھا، تلاوت میں دل نہیں لگتا تھا، بس آگے پیچھے ہلتا رہتا تھا۔ اور کھیلنے کے انتظار میں لگا رہتا، میں بھی درگزر سے کام لیتا کہ چلو بچہ ہے لیکن ایک دن ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس دن صبح ہی سے میرے سر میں ایک عجیب درد تھا، غلام شبیر سے مالش کرائی پیناڈول کی دو گولیاں بھی کھائیں مگر درد زور اور بیل کی مانند سر میں چنگھاڑتا رہا۔ درد کے باوجود اور شبیر کے منع کرنے پر بھی میں نے بچوں کا ناغہ نہیں کیا۔ نبیل بھی اس دن معمول سے کچھ زیادہ ہی شرارتیں کر رہا تھا۔ کبھی ایک کو چھیڑتا کبھی دوسرے کو جب اس کی حرکتیں حد سے بڑھ گئیں تو یکا یک میرے دماغ پر غصے کا بھوت سوار ہو گیا اور میں نے پاس رکھی لکڑی کی رحل اٹھا کر نبیل کو دے ماری، میں نے نشانہ تو کمر کا لیا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ رحل بچے کی پیشانی پر جا لگی۔

خون بہتا دیکھ کر میں سر کا درد بھول گیا اور گھبرا کر غلام شبیر کو آواز دی۔ وہ غریب بھگتتا ہوا آیا اور بچے کو اٹھا کے پاس والے ڈاکٹر کے کلینک پر لے گیا۔ خدا کا شکر ہوا کہ چوٹ گہری نہیں لگی تھی۔ مرہم پٹی سے کام چل گیا تھا اور ٹانکے نہ لگے۔ خیر باقی بچوں کو فارغ کر کے مسجد کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ چادر میں لپٹی ایک عورت نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عورت دہلیز پہ کھڑی مسجد کے دروازے سے لپٹی رو رہی تھی۔

چالیس پینتالیس کا سن ہوگا۔ معمولی شکل وصورت، سانولا رنگ اور چہرے پہ پرانی چیچک کے گہرے داغ، آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں اور گالوں پر بہتا کالا سرما، زیور کے نام پہ کانوں میں لٹکتی سونے کی ہلکی سی بالیاں اور ناک میں چمکتا سستا سرخ رنگ کا لونگ، چادر بھی سستی مگر صاف ستھری اور پاؤں میں ہوائی چپل۔

''کیا بات ہے بی بی..... کون ہو تم؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میں نوراں ہوں مولوی صاحب۔'' اس نے چادر کے پلو سے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔

نوراں..... نوراں کنجری..... میرے تو گویا پاؤں تلے زمین ہی نکل گئی۔ میں نے ادھر ادھر غلام شبیر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر وہ تو نبیل کی مرہم پٹی کرا کے اور اس کو اس کے گھر چھوڑنے کے بہانے نجانے کہاں غائب تھا۔

''جی نوراں کنجری!'' اس نے نظریں جھکائے اپنے نام کا اقرار کیا مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے منہ سے نکلنے والی اس کے گالی جیسی عرفیت پر شرمندگی ہوئی مگر پھر خیال آیا کہ وہ طوائف تھی اور اپنی بری شہرت کی ذمہ دار بھی، شرمندگی اس کو ہونی چاہیے تھی مجھے نہیں پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری موتی جیسی مسجد میں اس طوائف کا ناپاک وجود کسی غلاظت سے کم نہیں تھا۔

''باہر نکل کے کھڑی ہو۔ مسجد کو گندا نہ کر بی بی۔'' میں نے نفرت سے باہر گلی کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے کچھ اس حیرانگی سے آنکھ اٹھا کے میری طرف دیکھا کہ جیسے اسے مجھ سے اس رویے کی امید نہ ہو۔ ڈبڈبائی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے کسی ان کہی فریاد کی لو بھڑکی لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے

آنسوؤں کے پانی میں احتجاج کے ارادے کو غرق کیا اور بغیر کوئی بات کئے چلی گئی۔ میں نے بھی نہ روکا کہ پتا نہیں کس ارادے سے آئی تھی اتنی دیر میں غلام شبیر بھی پہنچ گیا۔

''کون تھی میاں جی..... کیا چاہتی تھی۔'' غالباً اس نے عورت کو تو دیکھا تھا مگر دور سے شکل نہیں پہچان پایا۔

''نوراں کنجری تھی۔ پتا نہیں کیوں آئی تھی؟'' مگر میں نے بھی وہ ڈانٹ پلائی کہ آئندہ اس پاک جگہ کا رخ نہیں کرے گی۔'' میں داد طلب نظروں سے غلام شبیر کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر ستائش کی جگہ افسوس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''وہ بیچاری دکھوں کی ماری اپنے بچے کا گلہ کرنے آئی تھی میاں جی۔ نبیل کی ماں ہے۔ بچے کی چوٹ برداشت نہیں کر سکی اور آپ نے اس غریب کو ڈانٹ دیا۔'' غلام شبیر نے نوراں کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''تو نبیل نوراں کا بیٹا ہے۔ ایسی حرکتیں کرے گا تو سزا ملے گی۔ جیسی ماں ویسا بیٹا۔'' میں نے اپنی شرمندگی کو بیہودگی سے چھپانے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کو خیال بھی آیا کہ بچہ تو معصوم ہوتا ہے۔ اور پھر میں نے زیادتی بھی کی تھی۔ مگر پھر اپنے استاد ہونے کا خیال آیا تو سوچا کہ بچے کی بھلائی کے لیے تو ہی مارا ہے کیا ہوا اور پھر ایک طوائف کو کیا حق حاصل کہ مسجد کے امام کی شکایت کر سکے۔

''کتنے بچے ہیں نوراں کے؟'' میں نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

''مسجد میں پڑھنے والے سب بچے نوراں کے ہیں میاں جی۔ اس کے علاوہ ایک گود کا بچہ بھی ہے۔ اس محلے میں صرف نوراں اپنے بچوں کو مسجد بھیجتی ہے۔ باقی سب لوگوں کے بچے تو آوارہ پھرتے ہیں۔'' غلام شبیر کی آواز میں پھر نوراں کی وکالت گونج رہی تھی۔ میں نے بھنا کر جواب دینے کا ارادہ کیا ہی تھا۔ کہ کبوتوال صاحب کی گاڑی سامنے آ کر رکی۔ خود تو پتا نہیں کیسا آدمی تھا مگر بیوی بہت نیک تھی ہر دوسرے تیسرے روز ختم کے نام پر کچھ نہ کچھ میٹھا بھجوا دیتی تھی۔ اس دن بھی کبوتوال کا اردلی جلیبیاں دینے آیا تھا۔ گرما گرم جلیبی کی اشتہا انگیز مہک نے میرا سارا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور نوراں کنجری کی بات آئی گئی ہو گئی۔

یہ نبیل کو مار پڑنے کے کچھ دنوں بعد کا ذکر ہے۔ عشاء پڑھا کر میں غلام شبیر سے ایک شرعی معاملے پر بحث میں الجھ گیا تو گھر جاتے کافی دیر ہو گئی۔ مسجد سے باہر نکلے تو بازار کی رونق شروع تھی۔ بالکونیوں پر جھلملاتے پردے لہرا رہے تھے اور کوٹھوں سے ہارمونیم کے سر اور طبلوں کی تھاپ کی آواز ہر سو گونج رہی تھی۔ پان سگریٹ اور پھولوں کی دکانوں پر بھی دھیرے دھیرے رش بڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے نظر نوراں کے گھر کے دروازے پر جا پڑی۔ وہ باہر ہی کھڑی تھی اور ہر آتے جاتے مرد سے ٹھٹھے مار مار کر گپیں لگا رہی تھی۔ آج تو اس کا روپ ہی دوسرا تھا۔ گلابی رنگ کا چست سوٹ، پاؤں میں سرخ گرگابی، نگنے سر پر اونچا جوڑا، جوڑے میں پروئے موتیے کے پھول، میک اپ سے لدا چہرہ، گہری شوخ لپ سٹک، آنکھوں میں مسکارا اور مسکارے کی اوٹ سے جھانکتی دعوت۔

''لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔'' میں نے طنزیہ نگاہوں سے غلام شبیر کو جانب دیکھا، آخر وہ نوراں کا وکیل جو تھا۔

''چھوڑیے میاں جی عورت غریب ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔'' اس نے گویا بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر میں اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔

''یہ بتاؤ میاں۔ جب اس کے گاہک آتے ہیں تو کیا بچوں کے سامنے ہی.....؟'' میں نے معنی خیز انداز میں اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''میاں جی، ایک تو اس کے بچے صبح اسکول جاتے ہیں اور اس لئے رات کو جلدی سو جاتے ہیں۔ دوسرا، مہمانوں کے لئے باہر صحن میں کمرہ الگ رکھا ہے۔ غلام شبیر نے ناگوار سے لہجے میں جواب دیا۔

''استغفر اللہ..... استغفر اللہ!'' میں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں ختم کرنا مناسب سمجھا کیوں کہ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ غلام شبیر کے لہجے سے جھانکتی ناگواری کا رخ نوراں کی جانب نہیں تھا۔ اس کے بعد نوراں کا ذکر میرے سامنے تب ہوا جن دنوں میں اپنے اور زوجہ کے لیے حج بیت اللہ کی غرض سے کاغذات بنوا رہا تھا۔ اس غریب کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اور میں اللہ اور اس کے نبی پاک کی خدمت میں پیش ہوں اور اولاد کی دعا کریں۔ میرا بھی من تھا کہ کسی بہانے سے مکے مدینے کی زیارت ہو جائے۔ نام کے ساتھ حاجی لگا ہو تو شاید محکمے والے کسی اچھی جگہ تبدیلی کر دیں۔ زوجہ کا ایک بھانجا انہیں دنوں وزارت مذہبی امور میں کلرک تھا۔ اس کی وساطت سے درخواست کی قبولی کی کامل امید تھی۔ کاغذات فائل میں اکٹھے کیے ہی تھے کہ غلام شبیر ہاتھ میں کچھ اور

کاغذات اٹھائے پہنچ گیا۔

''میاں جی ایک کام تھا آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔'' اس نے ہچکچاتے کہا۔

''ہاں، ہاں، میاں کیوں نہیں، کیا بات ہے۔'' میں نے داڑھی کے بالوں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میاں جی، آپ کی تو وزارت میں واقفیت ہے ایک اور حج کی درخواست بھی جمع کرا دیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات میری جانب بڑھائے۔

''دیکھو میاں غلام شبیر، تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں گھر بار تمہارے ذمے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور پھر تمہارے پاس حج کے لئے پیسے کہاں سے آئے؟'' میں نے کچھ برہمی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں میاں جی، آپ غلط سمجھے، یہ میری درخواست نہیں ہے۔ نوراں کی ہے۔'' اس نے سہم کر کہا۔

''کیا..... میاں ہوش میں تو ہو..... نوراں کنجری کے مدینے جائے گی؟ اور وہ بھی اپنے ناپاک پیشے کی رقم سے؟ توبہ..... توبہ۔'' میرے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی یہ واہیات سن کر۔

''میاں جی طوائف ہے پر مسلمان بھی تو ہے اور وہ تو اللہ کا گھر ہے وہ جس کو بلانا چاہے بلا لے۔ اس کے لیے سب ایک برابر۔'' اپنی طرف سے غلام شبیر نے بڑی گہری بات کی۔

''اچھا..... اللہ جس کو بلانا چاہے بلا لے..... واہ میاں واہ، تو پھر میں درخواست کیوں جمع کراؤں؟ نوراں سے کہو سیدھا اللہ تعالیٰ کو ہی بھیج دے۔'' میں نے غصے سے کہا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

زوجہ کا بھانجا برخوردار نکلا اور اللہ کے فضل و کرم سے میری اور زوجہ کی درخواست قبول ہو گئی۔ ٹکٹ کے پیسے کم پڑے تو اسی بھلی لوک کے جہیز کے زیور کام آ گئے۔ اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہو گئے۔ احرام باندھا تو گویا عمر بھر کے گناہ اتار کے ایک طرف رکھ دیے اللہ کا گھر دیکھا اور نظر بھر کے دیکھا، فرائض پورے کرتے کرتے رمی کا دن آ گیا۔ بہت رش تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ، ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر، گرمی بھی بہت تھی، میرا تو دم گھٹنا شروع ہو گیا۔ زوجہ بیچاری کی حالت بھی غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اوپر سے غضب کچھ یہ ہوا کہ میرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ ہاتھ کیا چھوٹا، لوگوں کا ایک ریلا مجھے رگیدتا ہوا پتا نہیں کہاں سے کہاں لے گیا۔ عجب حالات تھے، کسی کو دوسرے کا خیال نہیں تھا۔ ہر کوئی بس اپنی جان بچانے کے چکر میں تھا۔ میں نے بھی لاکھ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر پیر رپٹ ہی گیا، میں نیچے کیا گرا، ایک عذاب نازل ہو گیا، ایک نے میرے پیٹ پر پیر رکھا تو دوسرے نے میرے سر کو پتھر سمجھ کر ٹھوکر ماری، موت میرے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی، میں نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ کسی اللہ کے بندے نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

میں نے سانس درست کی اور اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اس کی طرف نگاہ کی، مانو ایک لمحے کے لیے تو بجلی ہی گر پڑی، کیا دیکھتا ہوں کہ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے نوراں کنجری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ یہ ناپاک عورت یہاں کیسے آ گئی..... اس کی حج کی درخواست کس نے اور کب منظور کی؟ میں ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کہاں صاحب ایک آہنی گرفت تھی میں نہیں چھڑا سکا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی اس طرف کچھ عورتیں اکٹھی تھی، اچانک میری نظر زوجہ پر پڑی جس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بے تاب نگاہوں سے مجمع ٹٹول رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں تو سب کلفت بھول گئی میں دوڑ کر اس تک جا پہنچا اور آنسو پونچھے۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ، کچھ ہو جاتا تو۔'' پریشانی سے الفاظ اس کے گلے میں اٹک رہے تھے۔

''بس کیا بتاؤں آج مرتے مرتے بچا ہوں۔ جانے کون سی نیکی کام آ گئی، میں تو پاؤں تلے روندا جا چکا ہوتا اگر نوراں نہیں بچاتی۔'' میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نوراں؟ ہماری پڑوسن نوراں؟ وہ یہاں کہاں آ گئی؟ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔'' اس نے حیرانگی سے کہا۔

''ارے نہیں ..... نوراں ہی تھی۔'' میں نے ادھر ادھر نوراں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر وہ تو نہ جانے کب کی جا چکی تھی۔ بعد میں بھی اس کو بہت ڈھونڈا مگر اتنے جم غفیر میں کہاں کوئی ملتا۔ خدا خدا کر کے حج پورا ہوا اور ہم دونوں میاں بیوی وطن واپس روانہ ہوئے، لاہور ائر پورٹ پر غلام شبیر پھولوں کے ہاروں سمیت استقبال کو آیا تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو باجی، بہت بہت مبارک میاں جی بلکہ اب تو میں آپ کو حاجی صاحب کہوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کو مبارک باد دی تو میری گردن حاجی صاحب کے

لقب سن کر اکڑ گئی، میں نے خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے اس کے کندھے پہ تھپکی دی اور سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔

ٹیکسی میں بیٹھے، میں نے مسجد اور گھر کی خیریت دریافت کی تو نوراں کا خیال آ گیا۔ ''میاں غلام شبیر، نوراں کی سناؤ۔'' میرا اشارہ اس کی حج درخواست کے بارے میں تھا۔

''اس بے چاری کی کیا سناؤں میاں جی؟ لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟'' اس نے حیرانگی سے میری جانب دیکھا۔

''بس ملاقات ہوئی تھی مکے شریف میں۔'' میں نے اس کے لہجے میں چھپی اداسی کو اپنی غلط فہمی سمجھا۔

''مکے شریف میں ملاقات ہوئی تھی؟ مذاق نا کریں میاں جی، نوراں تو آپ کے جانے کے اگلے ہی دن قتل ہو گئی تھی۔'' اس نے گویا میرے سر پر بم پھوڑا۔

''قتل ہو گئی تھی؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''جی میاں جی، بے چاری نے حج کے لیے پیسے جوڑ رکھے تھے، اس رات کوئی گاہک آیا اور پیسوں کے پیچھے قتل کر دیا غریب کو، ہمیں تو صبح پتا چلا جب اس کے بچوں کے اس کی لاش دیکھی، شور مچایا تو سب اکٹھے ہوئے، پولیس والے بھی پہنچ گئے اور اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے، ابھی کل ہی میں مردہ خانے سے میت لے کے آیا ہوں، آج صبح ہی تدفین کی اس کی۔'' غلام شبیر کی آواز آنسوں میں بھیگ رہی تھی۔

''قاتل کا کچھ پتا چلا؟'' میں ابھی بھی حیرانگی کی گرفت میں تھا۔ پولیس کے پاس اتنا وقت کہاں سے میاں جی کہ طوائفوں کے قاتلوں کو ڈھونڈے، اس بے چاری کی تو نماز جنازہ میں بھی بس تین افراد تھے، میں اور دو گورکن، اس نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اور اس کے بچے؟ ان کا کیا بنا؟'' میں نے اپنی آنکھوں میں امڈتی نمی پونچھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''نوراں کے بچے نہیں تھے۔ میاں جی، غلام شبیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، طوائفوں کے محلے میں جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو زیادہ تر اسے راتوں رات اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے وہ سب ایسے ہی بچے تھے۔ نوراں سب جانتی تھی کہ کس کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے، بس لڑکا ہوتا تو اٹھا کر اپنے گھر لے آتی، کہنے کو طوائف تھی میاں جی مگر میں گواہ ہوں، غریب جتنا بھی کماتی بچوں پر خرچ کر دیتی، بس تھوڑے، بہت الگ کر کے حج پر جانے کے لئے جمع کر رکھے تھے، وہ بھی اس کا قاتل لوٹ کر لے گیا۔''

''یہ بتاؤ غلام شبیر، جب میں نے اس کی درخواست جمع کرانے سے انکار کیا تو اس نے کیا کہا؟'' مجھ پر حقیقتوں کے در کھلنا شروع ہو چکے تھے۔

''بس میاں جی کیا کہتی بے چاری، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگی کہ بس تو ہی اس کنجری کو بلا لے، مجھ پر تو پوچھو گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔'' ناسف کی ایک آندھی چل رہی تھی، ہوا کے دوش میری خطائیں اڑ رہی تھیں۔ گناہوں کی مٹی چل رہی تھی اور میری آنکھیں اندھیائی جا رہی تھیں۔

''آپ کیوں روتے ہو میاں جی؟ آپ تو ناپاک کہتے تھے اس کو۔'' غلام شبیر نے حیرانگی سے میری آنسوں سے تر داڑھی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہوں غلام شبیر کہ کیوں روتا ہوں، وہ ناپاک نہیں تھی، ناپاک تو ہم ہیں جو دوسروں کی ناپاکی کا فیصلہ کرتے پھرتے ہیں، نوراں اللہ کی بندی تھی، اللہ نے اپنے گھر بلا لیا۔'' میری ندامت بھری ہچکیاں بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

غلام شبیر نا سمجھتے ہوئے مجھے تسلی دیتا رہا۔ ٹیکسی محلے میں داخل ہوئی اور مسجد کے سامنے ہو گئی۔ اترا یہ تھا کہ نوراں کے دروازے پہ نظر پڑی، ایک ہجوم اکٹھا تھا وہاں۔

''کیا بات ہے غلام شبیر؟ لوگ اب کیوں اکٹھے ہیں؟''

''میں جی میرے خیال میں پولیس والے ایدھی سینٹر والوں کو لے کے آئے ہیں وہ ہی لوگ بچوں کو لے جائیں گے، ان غریبوں کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔'' غلام شبیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں نے زوجہ کا ہاتھ پکڑا اور غلام شبیر کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے نوراں کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''کہاں چلے میاں جی؟'' غلام شبیر نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نوراں کے بچوں کو لینے جا رہا ہوں، آج سے وہ میرے بچے ہیں اور ہاں مسجد کا نام میں نے سوچ لیا ہے۔ آج سے اس کا نام نور مسجد ہے۔''

قاتل لکھاری

سلمان بشیر

کچھ لوگ انجانے میں ایسے کام کرجاتے ہیں جس پر انہیں بعد میں پچھتاؤں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور انہیں اپنی غلطی کو ٹھیک کرنے کا موقع بھی گوانہ پڑجاتا ہے۔
ایک ایسا انسان جس نے انجانے میں ایک ایسی کہانی لکھ دی جو خود اس کے گلے میں پھندا ثابت ہوئی۔

خوف و تجسس سے لبریز ایک ایسی کہانی جس کی ہر سطر آپ کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لئے کافی ہوگی

''نن.....نن.....نہیں.....ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی طور بھی حقیقت نہیں ہوسکتی۔ بھلا ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔نن.....نن،نہیں..... یہ سچ نہیں ہے۔فقط میرا وہم ہے۔مم.....مم میرا ڈر ہے۔''

رام چندر نارائن اپنے خیالات کی ہکلائے ہوئے نفی کررہا تھا۔حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل کر چوڑی ہوگئی تھیں۔ڈر اُس کی نس نس میں سما کر گھر کر چکا تھا۔دسمبر کی یخ بستہ سردی بھی اُس کے پورے بدن پر آئے پسینے کو منجمد کرنے سے انکاری تھی۔

اُسے اچانک سے اپنے گرد و نواح میں عجیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ڈر مزید اس کو ڈرانے لگا۔رفتہ رفتہ ان آوازوں میں تیزی آتی گئی۔رام نے ڈرتے ہوئے آواز کی سمت کان لگائے۔مگر یہ کیا۔اس کے کانوں میں اب کوئی بھی آواز نہیں پڑ رہی تھی۔

کچھ ثانیے تک وہ گومگو کی کیفیت کا شکار رہا۔جب اُسے دوبارہ کوئی بھی آواز سنائی نہیں دی تو وہ اپنے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے اُسے اپنا جوتا ڈھونڈنے میں دشواری ہورہی تھی۔وہ ننگے پاؤں ہی دیوار پر نصب بجلی کے بورڈ کی طرف بڑھا،مگر کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے فرش پر دھڑام سے گر پڑا۔درد کی شدید ٹیس اٹھی اور وہ اپنے سر کو تھام کر بیٹھ گیا۔پورے سر میں درد پھیل کر شدت اختیار کرگیا تھا۔رام نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر درد والی جگہ پر ہاتھ پھیرا تو اُس کی انگلیاں کسی گیلی مگر چیز سے تر ہوگئیں۔

اچانک باہر زور سے بادل گرجے اور ساتھ ہی ساتھ بجلی چمکی۔بجلی چمکنے کی بدولت کمرے میں ایک لمحے کے لیے تیز روشنی پھیل کر ختم ہوگئی۔مگر وہ ایک لمحہ ہی رام چندر کو اس جیتی جاگتی دُنیا سے بے خبر کردینے کے لیے کافی تھا۔

بے ہوش ہونے سے قبل اُس نے اپنے سامنے فرش پر گوتم کی لاش کو خون میں لت پت پڑا دیکھا تھا۔وہی گوتم جس کی چتا کو شام سے پہلے رام چندر نے اپنی آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہوتے دیکھا تھا۔اپنے کمرے میں گوتم کی لاش کو دیکھ کر حیرت و ڈر کی وجہ سے رام چندر بے ہوش ہوکر گوتم کی لاش کے اوپر گر گیا۔

اُس کے بے ہوش ہوتے ہی گوتم کی لاش کے چہرے پر ایک شیطانی ہنسی پھیل گئی اور لاش نے بے ہوش پڑے رام چندر کو اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔

.....☆☆.....

''ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ماحول پر گھنیرا سکوت و سناٹا چھایا ہوا تھا۔گاؤں کی بل کھاتی کچی سڑک رات کے سناٹے میں کسی وشال اجگر کا روپ دھارے ہوئے تھی۔گاؤں کا کچا چوک،جس کے درمیانی حصے میں ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا،بالکل سنسان و ویران تھا۔کبھی کبھار ایک لمحے کے لیے جب ہوا چلتی تو برگد کے پیڑ کی شاخیں اور اُن شاخوں کا زیور سبز و زرد پتے آپس میں سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے۔پورا گاؤں کسی ویران قبرستان کی مانند مردہ مردہ سا اور بہت ڈراؤنا لگ رہا تھا۔

ایسے میں ایک دو مرلے کے مکان کے چھوٹے سے

کمرے میں ایک دیا روشنی پھیلا کر ماحول کو مزید پُراسرار بنانے پر تُلا ہوا تھا۔ کمرے کا اندرونی خانہ بہت عجیب تھا۔ کمرے کی دیواروں پر سیاہ پینٹ کیا ہوا تھا۔ وہاں ایک پرانا سا بیڈ بھی موجود تھا جس پر میلی کچیلی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک میز اور اُس میز کے سامنے ایک کرسی پڑی تھی۔ میز پر کچھ پرانی بوسیدہ سی کتابوں کا راج قائم تھا۔ کچھ میلے سے سفید کاغذ جو اپنا رنگ وروپ تبدیل کر کے زردی مائل ہو چکے تھے، اسی میز پر پڑے تھے۔ بیڈ کے بالکل ساتھ نیچے زمین پر ایک کچا گھڑا ٹھنڈے پانی سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کی بجلی زیادہ تر بند ہی رہتی تھی اسی لیے گھروں میں دیے ہی جلا کر اندھیرے کو دور بھگایا جاتا تھا۔ بیڈ کے نیچے سیاہ رنگ کا بابائے آدم کے زمانے کا ایک صندوق بھی تھا۔ جس کے اندر کچھ کپڑے لپیٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ کپڑوں کی تہہ کے نیچے کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو گھر کے مالک کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔

گھر کے صحن میں ایک پیپل کا پیڑ تھا۔ جس کے پتے صحن میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے دوش پر ایک دوسرے کو لاد تے ہوئے اِدھر اُدھر کسی بنجارے کی طرح بھٹکتے نظر آتے تھے۔ اُس گھر کا مالک اپنے اُسی اکلوتے پُراسرار کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا کسی ضعیف کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اُس کتاب کے ساتھ ایک قاری کا تعلق بنائے ہوئے تھا۔ دراصل وہ جو جاننا چاہتا تھا جو کرنا چاہتا تھا وہ ابھی تک ممکن نہیں ہو پایا تھا۔ کئی مہینے مزید اس کتاب کا مطالعہ اور کچھ تجربے کرنے کے بعد وہ مایوس ہو گیا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ دراصل وہ سب کرنے والا ہے جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ آخر ایسا کیا تھا اُس کتاب میں..... ایسا کیا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا، حاصل کرنا چاہتا تھا؟ جب اُس کو معلوم ہو گیا کہ وہ زندگی بھر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا تو اُس نے تنگ آ کر اُس کتاب کو بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔

.....☆☆.....

اگلی رات اُس نے بیڈ کے نیچے سے کتاب کو اُٹھایا اور دوبارہ کرسی پر براجمان ہو کر کتاب کو بغور دیکھنے لگا۔ سیاہ

جلد والی وہ کتاب ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ کتاب کا کوئی عنوان نہیں تھا۔ جس نے بھی وہ کتاب لکھی تھی اُس کی کی لکھائی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی جو اُس کی لکھائی کی تعریفیں کی جاسکیں۔ ہر صفحے پر تین چار لائنوں کے کچھ منتر درج تھے۔ ہر منتر کو ایک خاص نمبر دیا گیا تھا۔ جیسے پہلے صفحے پر لکھے منتر کو 'چوالیس' نمبر دیا گیا تھا۔ دوسرے صفحے پر کندہ منتر کو دو سو ساٹھ۔ اسی طرح ہر منتر کو مختلف نمبر دے کر اس کی پہچان ظاہر کی گئی تھی۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان نمبروں کا کیا مقصد ہے۔ ہر منتر کو بہت عجیب اور مختلف نمبر دے کر کیا ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آدھی سے زیادہ کتاب صاف تھی۔

اُس رات اُس شخص کے ذہن میں نا جانے کیا آیا کہ وہ پن لے کر اس کتاب پر لکھنے بیٹھ گیا۔

ساری رات وہ کتاب پر کچھ لکھتا رہا۔ دراصل وہ کتاب پر کچھ کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ایسی کہانیاں جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسی کہانیاں جو فقط اس کے خیالات پر مبنی تھیں۔

وہ پانچ کہانیاں لکھ چکا تھا۔ ہر کہانی کے اختتام سے اگلا صفحہ وہ خالی چھوڑ دیتا تھا۔

لیکن ایک خاص بات تھی جس سے لاعلم تھا۔ وہ خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر کہانی لکھنے سے پہلے کہانی کے عنوان کی جگہ اس کتاب پر لکھے منتروں میں سے ایک منتر لکھ دیتا تھا۔ منتر لکھنے کے بعد وہ اپنے ذہن میں پنپتے خیالات کو اُن زردی مائل صفحات پر اتار دیتا۔ پانچ کہانیاں لکھ کر وہ لکھنا بند کر چکا تھا۔ کیونکہ کتاب کے صفحات ختم ہو چکے تھے۔ پھر وہ وہیں کرسی پر ہی ڈھے سا گیا اور ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو گیا۔

.....☆☆.....

وہ کتاب اُسے ایک کھنڈر سے ملی تھی۔ اس کھنڈر کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ وہاں بھوت پریت بستے ہیں۔ مگر وہ ایک دلیر لڑکا تھا۔ ان باتوں سے اس کے ذہن و دل میں رتی بھر بھی ڈر نہیں آیا۔ ایک دن وہ اسی کھنڈر میں تھا جب اُسے وہ کتاب ایک پتھر کے نیچے دبی ہوئی نظر آئی۔ وہ جلدی سے کتاب کی جانب لپکا اور کتاب کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کتاب کا کوئی عنوان نہیں تھا۔ جب اس نے وہ کتاب کھول کر دیکھی تو حیران رہ گیا۔ کیونکہ وہ وہی کتاب تھی جس کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائے تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کتاب میں دولت مند بننے کے راز پوشیدہ ہیں۔ کسی کا گمان تھا کہ اس کتاب کے ذریعے مرے ہوئے لوگوں سے باتیں کی جاسکتی ہیں۔ کئی ایسے لوگ بھی تھے جو یہ مانتے تھے کہ اس کتاب کے ذریعے جن بھوت قید کیے جا سکتے ہیں۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کتاب کا راز کیا ہے۔ بس لوگ اتنا جانتے تھے کہ انہیں ان کے پُرکھوں نے اس کتاب کے بارے میں بتایا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کتاب کہاں غائب ہو گئی تھی۔

رام چندر کو جب وہ کتاب ملی تو اس کی پہچان اس سیاہ جلد نے کی جس کے بارے میں اس نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔ دوسری پہچان یہ تھی کہ وہ کتاب کسی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ دونوں نشانیوں کو پا کر رام چندر بہت خوش ہوا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے دنیا جہان کی سب سے قیمتی شے پا لی ہو۔ گھر آ کر اس نے کتاب کو مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے وہ کتاب مل گئی ہے۔

لیکن وہ اپنے گاؤں کے سب سے بزرگ انسان سے ہر روز معلومات اکٹھی کرنے ضرور جاتا تھا۔ وہ بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ کتاب پر لکھے منتروں کو کس جگہ اور کس حالت میں پڑھنے ہیں۔ تاکہ مطلوبہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔ کیونکہ کتاب پر کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ یہ منتر اس خاص مقصد کے لیے ہے یا اسے کس طرح پڑھنا ہے۔ وہ بس اپنے بزرگوں سے معلومات اکٹھی کر کے ان منتروں کو پڑھنا چاہتا تھا۔

رام چندر نے کئی سال تک اس کتاب کا مطالعہ کیا اور کئی سال وہ اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہوئے منتروں کے جاپ کرتا رہا تھا۔ مگر اسے کوئی فائدہ یا کوئی کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔

اُس رات بھی اس نے تنگ آ کر کتاب کو بیڈ کے نیچے پھینک دیا تھا پھر اگلی رات اس کتاب پر پانچ کہانیاں لکھ دی تھیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اُس نے کیا کر دیا تھا۔ رام چندر اسی کمرے میں میز کے سامنے پڑی کرسی پر سویا ہوا تھا جب اسے کتاب کے صفحوں کی تیز تیز پھڑ پھڑانے کی آواز

سے جاگ گیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا کرسی پر حیرت سے بیٹھا ہوا اس کتاب کو دیکھ رہا تھا جس کے صفحے یوں تیز رفتاری سے رخ بدل رہے تھے جیسے کمرے میں کوئی طوفان آیا ہو۔ مگر طوفان تو دور کی بات ہوا کا ذرا بھی نہیں تھا وہاں۔ کمرے کا دروازہ بھی بند تھا، اور پنکھا سردی کی وجہ سے پچھلے تین مہینوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ کتاب کے صفحے خود بخود پلٹتے گئے اور ایک جگہ آ کر رُک گئے۔

اُس نے غور کیا تو اس کی لکھی کہانیوں کے بعد چھوڑے میں خالی صفحے پر اسے کچھ ہندسے دکھائی دیے۔ سیاہ جلی حروف میں ''ساٹھ'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ حروف کبھی سرخ رنگ کے ہو جاتے تو کبھی سیاہ۔ پھر اچانک کتاب کے صفحے دوبارہ خود بخود حرکت میں آئے اور اچانک کتاب یوں بند ہوگئی جیسے کبھی کھولی ہی نہ گئی ہو۔

رام چندر نے کتاب کو دوبارہ کھولا اور ساری کتاب کھنگال ڈالی مگر وہ ''ساٹھ'' کا سرخ و سیاہ ہندسہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کو پہلی بار ڈر کا شدید احساس ہوا تھا۔ اس کا دماغ اور شریر سن ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ کبھی اسے ایسا لگتا جیسے وہ سب خواب تھا۔ مگر اس کا یہ احساس بھی اس کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ جب وہ اس سارے مسئلے پر غور کرتے کرتے تھک گیا تو بستر پر ڈھے گیا۔ وہ اپنی زندگی بدلنے چلا تھا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی زندگی کل سے بچ میں بدل جائے گی۔ کل کا سورج اس کی زندگی میں کیا نیا روپ لے کر آنے والا تھا وہ اس سے بے خبر تھا۔

کمرے میں جلتا دیا اچانک سے بجھ گیا اور رام چندر جو کہ نیند میں تھا یہ بھی جان نہیں پایا کہ کوئی اُس پر بہت شیطانی ہنسی ہنسا تھا۔

.....☆☆.....

''گوتم سارا دن جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے سیاہ بادلوں نے گھیرا تنگ کر رکھا تھا۔ ہوا بھی تھوڑی تیز اور ٹھنڈی تھی جو کہ سردی کے موسم میں گوتم کے جسم کو خنجر کی طرح چیرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جنگل گھنا اور وسیع تھا، اور اوپر سے شام کے گہرے ہوتے سائے جنگل کو مزید خوفناک بنا رہے تھے۔

گوتم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جلد از جلد جنگل سے باہر نکلنے کی سعی کر رہا تھا۔ تبھی اچانک جنگل میں یوں اندھیرا چھا گیا جیسے کوئی سیاہ چادر ہو۔ جیسے کوئی سیاہ بخت۔ جیسے کوئی گہرا اندھیر کنواں۔

گوتم کے پاؤں چلتے چلتے اچانک سے رک گئے۔ اُسے گہرے اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گوتم کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا دل ڈر کی کیفیت میں ڈوب کر تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ دل کا ڈر دماغ کے ڈر سے کہیں زیادہ طاقتور اور شدید ہوتا ہے۔ کیونکہ دل میں جو ڈر ایک بار گھر بنا لیتا ہے پھر وہ آسانی سے وہاں سے نقل مکانی نہیں کرتا۔ جبکہ دماغ کا ڈر مصروفیات میں قید ہو کر کچھ وقت کے لیے انسان سے دور چلا جاتا ہے۔

گوتم نا آگے بڑھ سکتا تھا نا پیچھے۔ کیونکہ ہر طرف ایسا اندھیرا تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تبھی گوتم کو اپنے ارد گرد سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ گوتم ڈر کے مارے بھیگی بلی بن گیا۔ سرگوشیاں مزید قریب ہوتی گئیں، اور پھر گوتم کو ایسے لگا جیسے اس بار گوتم کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا گیا ہے۔

غزل

میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہو جاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ
دشت سے دور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شہر میں داخل ہو جاؤ
جس پہ ہوتا ہی نہیں خونِ دو عالم ثابت
بڑھ کے اک دن اسی گردن میں حمائل ہو جاؤ
وہ ستم گر تمہیں تسخیر کیا چاہتا ہے
خاک بن جاؤ اور اس شخص کو حاصل ہو جاؤ
عشق کیا کارِ ہوس بھی کوئی آسان نہیں
خیر سے پہلے اسی کام کے قابل ہو جاؤ
ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہو جاؤ
میں ہوں یا موجِ فنا اور یہاں کوئی نہیں
تم اگر ہو تو ذرا راہ میں حائل ہو جاؤ

شاعر: عرفان صدیقی

غلام یاسین نوناری..... چوک سرور شہید

''کک..... کک..... کون ہے؟'' گوتم نے اپنے چاروں طرف گھومتے ہوئے ہکلاتے ہوئے آواز دی۔ جو کہ شاید اس کے حلق سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔

پھر دفعتاً گوتم کو کسی نے اس کے سر کے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ گوتم کا سر زمین پر کسی لکڑی سے ٹکرایا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر میں شدید درد ہوا تھا۔ گوتم اس وقت شدید درد میں مبتلا ہونے کے باوجود ڈرا ہوا تھا۔ وہ زمین پر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ وہاں سے دوڑنا چاہتا تھا مگر اندھا کیا جانے کہ جانا کدھر ہے۔

''گوتم..... گوتم..... گوتم۔'' اسے پھر سے اس کا نام سنائی دیا۔ مگر اس بار بہت واضح اور تیز سنائی دیا تھا۔ کسی نے تین بار کسی گیت کی لے میں اس کا نام پکارا تھا۔

''کک..... کک..... کون ہو تم..... کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو.....؟'' گوتم نے ہمت کر کے اُس ان دیکھی لڑکی سے پھر سے سوال کیا جو اس کے لیے یمراج بنی ہوئی تھی۔

''میں کون ہوں..... یہی پوچھا ناں تم نے.....؟''

''ہاں یہی پوچھا ہے۔ بتاؤ کون ہو تم..... اور میرے پیچھے کیوں پڑی ہو..... کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟'' گوتم نے ڈر کو خود سے دور بھگاتے ہوئے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔

''میں کون ہوں.....؟ میں موت ہوں تمہاری۔''

اچانک سے وہ غصے سے بپھری محسوس ہوئی۔ اس کی آواز میں بادلوں کے جیسی گرج تھی۔ ''میں وہ ہوں جس کے گھر کو ابھی تم کاٹ کر آ رہے ہو۔ میں وہ ہوں جس کے بچوں کا سر تم نے اپنی کلہاڑی سے کاٹ ڈالا۔ میں وہ ہوں جس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو تم نے مار ڈالا۔'' وہ غصے سے دھاڑے جا رہی تھی۔ پھر جنگل میں ایسی روشنی پھیلی جیسے کئی دیے ایک ساتھ روشن کر دیے گئے ہوں۔

گوتم ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ روشنی دیکھتے ہی گوتم جلدی سے اٹھا اور بھاگنے لگا۔ روشنیاں گوتم کے تعاقب میں تھیں۔ کبھی وہ روشنیاں ختم ہو جاتیں تو کبھی پھر سے روشن ہو جاتیں۔ گوتم کو اس وقت بس جنگل سے نکلنے کی پڑی تھی۔ مگر وہ کیا جانتا تھا کہ وہ زندگی کی طرف نہیں بلکہ موت کی طرف بھاگ رہا ہے۔

جنگل ختم ہونے ہی والا تھا، اور وہ روشنیاں ابھی تک گوتم پر مسکراتی ہوئی اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب جنگل کا آخری کونہ آیا تو وہ روشنیاں اچانک سے گوتم کے آگے آ گئیں، اور گوتم ایک دم سے وہیں ساکت ہو گیا۔

گوتم نے وہ دیکھا جو شاید اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ روشنیاں ختم ہو گئیں اور ان کے ختم ہوتے ہی گوتم کے سامنے ایک بڑا سا وجود لہرانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی گوتم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

گہری سیاہ رنگت والی، کسی بڑے سے درخت کے سائز کی وہ عورت سچ مچ موت کے فرشتے کی طرح تھی۔ اس کے بال اتنے گھنے اور لمبے تھے کہ زمین سے لگ رہے تھے۔ گوتم نے غور کیا تو وہ بال نہیں بلکہ سانپ تھے۔ جو آہستہ آہستہ گوتم کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ڈر اور خوف کے مارے گوتم کے پاؤں من من کے بھاری ہو چکے تھے۔ اس کے منہ سے رال نہیں بلکہ خون ٹپک رہا تھا۔ آنکھیں اتنی بڑی جیسے گھڑا ہوں۔ ناک کی لمبائی منہ سے آگے تک بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں الٹے اور تلوار کی مانند ناخن تھے۔ وہ گوتم کو ڈراؤنا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''تم نے میرے بچوں کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں کبھی چین نہیں آنے دوں گی۔''

''میں نے جان بوجھ کر تمہیں بچوں کو نہیں مارا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ جہاں تمہارا بسیرا ہے تو میں زندگی بھر اس جنگل کا رخ نہیں کرتا۔ میں تو کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ آج پتہ نہیں کیسے اس جنگل میں آ گیا مجھے خود نہیں پتہ۔'' گوتم صفائیاں دینے لگا۔ موت کے ڈر سے وہ رو رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تم خود نہیں آئے بلکہ تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''کیا.....؟'' گوتم مزید حیرت زدہ ہو گیا۔

''ہاں۔ تمہیں کسی اور نے یہاں بھیجا ہے۔ مگر میری طاقتیں ابھی مجھے یہ نہیں بتا رہیں کہ وہ کون شخص ہے۔ جو میرے بچوں کو قتل کروانا چاہتا تھا، اور اس نے ایسا کیا بھی۔''

''میں بھی تو وہی کہہ رہا ہوں کہ میں خود نہیں جانتا کہ میں یہاں کیسے آیا۔ دیکھو اب تو مجھے چھوڑ دو۔ مجھے گھ

جانے دو۔ میں آج کے بعد یہاں کبھی نہیں آؤنگا۔''

''نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ کیونکہ مجھے تم کو مارنے کا حکم ملا ہے۔''

''کک..... کک..... کیا.....؟ کس نے تمہیں مجھے مارنے کا حکم دیا ہے؟''

''اِس نے۔'' اِس چڑیل نے اپنی ہتھیلی کو آگے کیا تو ہتھیلی آگ کی طرح دہک رہی تھی۔

وہاں ہلکی ہلکی سرخ وسیاہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس پر ''ساٹھ'' لکھا ہوا تھا۔

''یہ میرا حاکم ہے۔ یہی مجھے حکم دیتا ہے۔ یہی میری پہچان بھی ہے۔ میرے حاکم نے مجھے تم کو مارنے کا حکم دیا ہے اسی لیے تمہاری موت کو طے ہے۔''

چڑیل کے اُس انکشاف نے گوتم کو چاروں شانے چت کر دیا۔ وہ بے یار و مددگار کھڑا خود کو کوس رہا تھا کہ وہ آج کیوں جنگل میں آیا تھا۔ کاش اسے پہلے علم ہوتا تو وہ زندگی بھر اس طرف کا رُخ نہیں کرتا۔ مگر افسوس۔ صد افسوس۔ ساری کشتیاں جل چکی تھیں۔ چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں۔

اچانک اُس چڑیل کے سانپوں کی مانند بالوں نے برق رفتاری سے گوتم کے سارے وجود کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ وہ سانپ گوتم کے جسم سے لپٹے ہوئے اُسے ڈسے جا رہے تھے۔ کوئی سانپ کان میں گھس رہا تھا کوئی ناک میں تو کوئی منہ کے راستے پیٹ میں گھستا چلا جا رہا تھا۔

گوتم کی آنکھوں کے ڈیلے ڈر کی شدت کے باعث آنکھوں سے باہر نکل آئے تھے۔ جس جگہ آنکھوں کے ڈیلے تھے اب وہاں گہرے سیاہ سوراخ تھے جن سے سرخ و سیاہ خون بہہ کر گوتم کے پورے وجود کو رنگتا جا رہا تھا۔ گوتم کے جسم پر جگہ جگہ سانپوں کے کاٹنے کے نشان تھے۔ گوتم کب کا مر چکا تھا۔ ایسی موت جو اس نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچی تھی۔ ایسی موت جو برسوں تک یاد رکھی جانے والی تھی۔ ایسی موت جو کوئی بھی پانا نہیں چاہتا تھا۔ گوتم کے جسم سے جگہ جگہ سفید جھاگ کی مانند مادہ نکل کر بہہ رہا تھا۔ موت اپنا کام کر چکی تھی۔ گوتم کو مکتی مل چکی تھی۔ مگر وہ مکتی فقط دنیا والوں کی نظروں میں تھی۔ اُسے ابھی تک نروان حاصل نہیں ہوا تھا۔ جونی چکر بھی ابھی نہیں مل سکتا تھا اُسے۔ کیونکہ ابھی اُس کی آتما کو اس دنیا سے رہائی نہیں ملی تھی۔

کچھ وقت کے بعد گاؤں کے چوراہے پر پڑی گوتم کی لاش کو دیکھ کر لوگ ڈر سے کانپنے لگے۔ جو بھی گوتم کو دیکھتا، اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا۔ ایسی دردناک موت آج تک کسی نے بھی نہیں دیکھی تھی۔

رات کے گہرے اندھیرے میں جب بجلی بند تھی تو پورا گاؤں ہاتھوں میں لالٹین پکڑے گاؤں کے چوراہے ہر موجود گوتم کی لاش کے گرد گھیرا بنائے کھڑا تھا۔ بستی والوں کا شور سن کر رام چندر بھی اپنے گھر سے نکل کر وہاں آ گیا۔ گوتم پر نظر پڑتے ہی رام چندر خوف میں لپٹا کانپنے لگا۔

اگلی شام کو گوتم کی چتا کو اگنی دے دی گئی۔ رام چندر اگنی دیتے سمے وہیں پر موجود تھا۔ اس کے رُوں رُوں میں خوف و ڈر نے حصار بنایا ہوا تھا۔ رام کو گوتم کی موت دیکھی دیکھی سی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے رہ رہ کر یہ چیز بے چین کر رہی تھی کہ اُس نے ایسا منظر پہلے بھی کہیں دیکھا ہے مگر دماغ پر زور دینے کے باوجود اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے وہ منظر کہاں دیکھا ہے۔

رام رات کو گھر میں بیٹھا تھا۔ اُس کا ذہن ابھی تک گوتم کی لاش پر ہی ٹِکا ہوا تھا۔ دفعتاً اُس کے ذہن میں کچھ گردش کرنے لگا۔ کچھ ہندسے بار بار اس کے ذہن پر دستک

ظہور قدسی (صلی اللہ علیہ وسلم)

چمنستان دہر میں بار ہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخ نادر نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑ برس صرف کر دیے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے چرخ کہن تد بہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔

کتاب: سیرت النبی..... علامہ شبلی نعمانی

انتخاب: افتخار الدین انجم..... راولپنڈی

دے کر اُسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اُس کا دل ایک دم سے جیسے بند ہو گیا۔ آنکھیں حیرت و پریشانی سے چوڑی ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے وہی کتاب نکالی۔ کتاب کھول کر اُس نے ساٹھ نمبر والا منتر دیکھا۔ اُسے کل یہی نمبر تو نظر آیا تھا مگر ساٹھ نمبر والا منتر پڑھنے کے باوجود وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اس منتر کو دیکھتا رہا۔ مختلف نظریوں سے اس منتر کا مشاہدہ کرتا رہا مگر کچھ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

جب وہ تنگ آ گیا تو کتاب بند کرنے لگا۔ کتاب بند کرتے وقت اچانک اس کا ہاتھ رک گیا۔

رام کے سامنے اُسی کتاب پر لکھی ہوئی اس کی ایک کہانی آ گئی۔ کہانی کے عنوان کی جگہ ایک منتر درج تھا۔ رام کو خیال آیا کہ یہ تو وہی ساٹھ نمبر والا منتر ہے۔ لیکن وہ پھر اس سوچ میں ڈوب گیا کہ اس منتر کا کیا چکر ہے، اور یہ ساٹھ نمبر کا ہندسہ۔ اُسے پھر خیال آیا کہ گزشتہ شب جب کتاب کے اوراق خود حرکت کر رہے تھے تو ایک جگہ آ کر رُک گئے تھے۔ وہاں ساٹھ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ منتر کا اور اس ہندسے کا کیا چکر ہے۔ اُسے کیوں وہ ہندسہ گزشتہ شب نظر آیا تھا؟ پھر ایک خیال آنے کے بعد وہ مزید ڈر گیا۔

اُس نے اپنی لکھی وہی ساٹھ نمبر کے منتر والی کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ جوں جوں وہ کہانی پڑھتا جا رہا تھا توں توں رام پہ دہشت و خوف بسیرا کرتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ رام نے جانے انجانے میں ایسا کچھ لکھ دیا تھا جو اب حقیقت میں ہو چکا تھا۔ ساٹھ نمبر والے منتر کی کہانی کا واحد کردار گوتم ہوتا ہے۔ جو ایک دن یونہی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا ہے۔ راستے میں اسے شام ہو جاتی ہے، اور گھر واپس لوٹتے سے جنگل میں ایک چڑیل سے اس کا سامنا ہو جاتا ہے، اور پھر وہی چڑیل اس کو مار ڈالتی ہے۔

اُس کی کہانی کے کردار کی موت اور حقیقت میں اس کے گاؤں والے گوتم کی موت بالکل ایک جیسی تھی۔ جیسے کہانی کے کردار کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں ویسے ہی اس کے گاؤں کے گوتم کی بھی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ آسان لفظوں میں یہ کہ اُس کہانی کے کردار نے کہانی میں جو بھی عمل کیا تھا یا اس کے ساتھ جو بھی معاملہ پیش آیا تھا ویسا ہی حقیقت میں پیش آیا تھا۔ گاؤں کے لڑکے گوتم کے ساتھ۔

رام اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈر رہا تھا۔

اچانک رام کو اپنے اردگرد بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ڈر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باعث اسے کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بجلی کا بٹن آن کرنے کی خاطر اٹھا کہ اچانک کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے زمین پر زور سے گرا۔ درد کی ایک شدید لہر کا احساس ہوا۔ اچانک بجلی زور سے چمکی تو اسے کمرے میں فرش پر گوتم کی لاش نظر آئی۔ وہ مزید ڈر گیا۔ تبھی ڈر و خوف کی وجہ سے رام بیہوش ہو گیا۔ اس کے بیہوش ہوتے ہی گوتم کی لاش قہقہے لگاتی ہوئی رام کے ساکت وجود پر جھک کر گوتم کی لاش رام کو غصے سے دیکھتے ہوئے اچانک غائب ہو گئی۔

.....☆☆.....

رام بہت ڈرا ہوا تھا۔ کل رات والے واقعے نے اس کو کچھ ایسا اپنے حصار میں جکڑا تھا کہ وہ ابھی تک خود کو اسی قید میں محسوس کر رہا تھا۔

وہ میز کے سامنے بیٹھا تھا جب وہی منتروں والی کتاب خود بخود حرکت میں آتی ہے۔ کل والا عمل پھر سے دوہرایا۔ صفحات کسی ان دیکھی طاقت کے زیر اثر گردش کرتے رہے اور پھر ایک خالی صفحے پر آ کر رک گئے۔

رام کی اُس کتاب پر لکھی چوتھی کہانی کا وہ صفحہ تھا وہ بالکل خالی تھا۔ پھر سے اس صفحے پر کچھ ہندسے دکھائی دینے لگے۔ سرخ و سیاہ روشنائی میں قید۔

ایک سو دس۔ ہاں بالکل یہی ہندسہ درج تھا وہاں۔

رام چند حیرت و خوف سے پھر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ پھر جلدی سے ایک سو دس نمبر والے منتر کی کہانی نکال کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ کہانی پڑھ کر یہ جان لے گا کہ اب کس کا قتل ہونے والا ہے۔ ساری کہانی پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے بعد بھی اسے اپنے گاؤں میں کہانی والا کردار نہ مل سکا۔

اس نے باقاعدہ گاؤں کے سب سے بزرگ انسان سے بھی اُس نام کے شخص کو جاننا چاہا مگر وہاں سے بھی کامیابی نہ ملی۔ آخر اب کون ہو سکتا ہے..... کون موت کے گھاٹ اترنے والا تھا؟ رہ رہ کر اُسے خود پر افسوس اور غصہ

آئے جا رہا تھا کہ کیوں اس نے وہ منتروں والی کتاب اٹھائی تھی اگر اٹھا بھی لی تھی تو اس سے آگے کیوں بڑھا تھا۔ کیوں اس نے لوگوں کی موت کی کہانی تحریر کی تھی؟

.....☆☆.....

اگلی صبح اخبار میں ایک درمیانی عمر کے شخص کی خوفناک تصویر لگی تھی۔ صحافیوں کے مطابق اس انسان کا قتل کسی پاگل بوڑھے نے کیا تھا۔ کیوں کے لاش کے نزدیک انہیں ایک لوہے کی لاٹھی ملی تھی جس پر خون لگا ہوا تھا۔

مگر صرف رام ہی جانتا تھا قتل کسی پاگل بوڑھے نے نہیں بلکہ اس شخص کی بیوی نے کیا تھا، اور اس کی بیوی یقینی طور پر اب گھر میں کہرام مچائے مگرمچھ کے آنسو بہائے جا رہی ہوگی، اور کچھ دن بعد اپنے پریمی سے بیاہ کرنے والی ہوگی۔

اُس رات بھی کمرے میں اندھیرا تھا۔ بارش بھی ہو رہی تھی اور رام چندر ڈرا ڈرا سا بیٹھا ہوا تھا۔ جب اسے اپنے سامنے کل رات قتل ہونے والے پریتم کی لاش نظر آئی۔ وہ سمٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پریتم کی لاش کے ساتھ اب گوتم کی لاش بھی خونی نگاہوں سے رام چندر کو دیکھ رہی تھی۔

رام کی زندگی صرف وفقط ڈر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ پریتم اور گوتم کی لاشیں اسے خوابوں میں بھی ڈرانے لگیں تھیں۔ ہر وقت اسے یہ احساس شدت سے ہوتا کہ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ رام کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس مصیبت سے باہر نکلے۔

اُس رات بھی وہ بہت خوف کی حالت میں میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے بہت بے چین اور پرسکون کر دیا۔ اس نے جلدی سے وہ منتروں والی کتاب اٹھائی۔ رام کا مقصد اس کتاب کے تمام صفحات کو پھاڑ کر جلا دینے کا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بقیہ تین کہانیوں کے صفحات کتاب سے پھاڑنے چاہے مگر یہ کیا۔ کتاب کے صفحات تو جیسے لوہے کے ہو گئے تھے۔ وہ انکو پھاڑ تو کیا فولڈ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ ناکام ہی رہا۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے اور یکے بعد دو اور قتل ہو گئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے رام نے کتاب میں لکھا تھا۔ وہی کردار.....وہی ہتھیار.....وہی کرب ناک موت..... جیسے ہی کوئی قتل ہوتا اس شخص کی لاش رام کا جینا دوبھر کرنے کے لیے اس کے خوابوں خیالوں اور حتی کہ اس کے گھر تک آ جاتی۔

گوتم، پریتم، نارائن، روی یہ وہ چار لوگ تھے جو رام کی کہانیوں کے کردار تھے۔ یہ وہ چار بے قصور لوگ تھے جن کی موت کا فرمان رام نے لکھا تھا۔ یہ وہ چار لوگ تھے جو رام کی زندگی ختم کرنے کے درپے تھے۔ رام ڈر و خوف سے مکمل طور پر پاگل ہو گیا تھا۔ اب ایک کہانی باقی بچی تھی۔ مطلب ایک قتل اور، اور کرب ناک موت اور۔ ایک اور زندگی کا خاتمہ۔ مگر جب رام نے منتروں والی کتاب پہ اپنی لکھی وہ آخری کہانی پڑھی تو اس کا پورا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ خون جسم میں جیسے جم گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی ساکت و جامد ہو گئے۔ کون جانتا تھا کہ اگلی موت کس کی ہونے والی تھی۔ پوری بستی اپنے اپنے بستروں میں دبکی ہوئی تھی۔ مگر رام کو ایک پل بھی چین کا میسر نہیں تھا۔

.....☆☆.....

غزل

انہیں یہ ڈر ہے کہ لاشوں پہ سیاست ہو گی
مجھے یہ فکر کہ لاشوں پہ ریاست ہو گی
آپ کا کام ہے لاشوں پہ بنانا نغمے
موت کو بیچنا سر آپکی عادت ہو گی
آپ کے جھوٹ کو ہے درکار آواز بلند
میں جو بولوں گا تو لہجے میں صداقت ہو گی
بعد کرنے کے ستم آپ بھی پچھتائیں گے
آپ کے خون میں تھوڑی جو شرافت ہو گی
آپ تو وردی و بندوق پہ اتراتے ہیں
آپکی زات پہ وردی کو ندامت ہو گی
ظلم بڑھ جائیگا برداشت کی حد ٹوٹے گی
پھر جو ہو گی وہ میری جان بغاوت ہو گی

شاعر: یاسر تاج
انتخاب: اسادر شاہ.....اٹلی

وہ جنوری کی آخری شام تھی۔ شام سے پہلے تک موسم بالکل ٹھیک تھا۔ مگر شام کے سائے گہرے ہوتے ہی بادلوں سے آسمان کی چھاتی بھر گئی۔ کچھ وقت کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ رام اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا، کمرے کے دروازے کو کھولے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چینی تھی۔ کہیں کہیں تفکر اور ڈر بھی تھا۔

بارش نے رفتار پکڑ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل کر دیا۔ آسمان سے بار بار بجلی کے چمکنے کی بھی آوازیں سنائی دی رہی تھیں۔ جیسے ہی بجلی چمکنے کی آواز آتی، رام ایک دم سے ڈر کر خود میں سمٹ جاتا۔

رام کی نظریں اپنے گھر کے سامنے والی دیوار پر تھیں جہاں جامن کا بڑا سا درخت لگا ہوا تھا وقفتاً ایک مرتبہ پھر سے بجلی چمکی۔ بجلی کی آواز سے رام کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ تبھی رام کو اپنے سامنے لہراتے ہوئے چار عکس دکھائی دیے۔ چاروں آہستہ آہستہ رام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رام میں اتنی ہمت بھی نہیں بچی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہل سکے۔ وہ چاروں جب رام کے پاس آ پہنچے تو ان کے عکس واضح ہو گئے۔ ایک مکمل جسمانی روپ دھارے ہوئے وہ بہت خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔

ان میں سے ایک گوتم تھا جس کی موت جنگل میں بسنے والی چڑیل کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ دوسرا پریتم، جس کو اس کی اپنی ہی بیوی نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ تیسرا نارائن تھا جس کی موت سوتے وقت ایک وشال سانپ کے کاٹنے سے ہوئی تھی، اور وہ سانپ نا جانے کس دیس کا تھا کہ اس کے زہر کی وجہ سے نارائن کا سارا جسم پانی بن کر بہہ گیا تھا۔ اب رام کے سامنے صرف نارائن کا ہڈیوں سے بھرا ڈھانچہ تھا۔ چوتھا شخص روی تھا جس کی موت سمندر میں ڈوبنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب اس کی لاش سمندر سے باہر نکالی گئی تو وہ پانی کی وجہ سے پھول کر بہت بھاری ہو گئی تھی۔ اب رام کے سامنے روی کا بھاری بھرکم وجود تھا جو کسی بھی طور روی نہیں لگ رہا تھا مگر وہ تھا روی ہی۔

رام کے گھر میں اچانک بہت گھنیرا اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرا ان لاشوں کی طاقت سے ہوا تھا۔ رام کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سخت سردی کے موسم میں بھی وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ پھر اُن چاروں نے خوفناک قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ انکی آواز اتنی تیز تھی کہ رام کے کانوں میں شدید درد ہونے لگا۔ رام اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ چاروں اچانک غائب ہو گئے۔ رام نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ رام دوسری طرف مڑا ہی تھا کہ اچانک وہ پھر سے اس کے سامنے ظاہر ہو گئے۔ رام اچانک ڈر سے پیچھے کی جانب ہٹا نیچے گر گیا۔ میز کا ایک کونا رام کے سر میں جا لگا اور وہاں سے خون بہنے لگا۔

گوتم کی لاش جلدی سے آگے بڑھی اور رام کے سامنے اس کا خون چاٹنے لگی۔ گوتم کے منہ پر اور ہاتھوں پر رام کا خون لگا ہوا تھا جسے دیکھ کر اور گوتم کی خوفناک ہنسی دیکھ کر رام کو قے آ گئی۔ رام نے منہ سے خون تھوکا تھا جو گوتم اور نارائن کا ڈھانچہ چاٹ رہے تھے۔ رام کو پھر خون کی قے آئی۔ نارائن کا ڈھانچہ مکمل طور پر خون سے تر ہو گیا تھا۔ پھر پریتم آگے بڑھا۔ اُس نے رام کو اس کے سر کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا ایسے جیسے وہ کوئی بہت ہلکی چیز ہو۔ رام کے سر کے بال اس کی جلد اکھڑ کر پریتم کے ہاتھوں میں رہ گئے۔ رام کو اپنے سر میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے بالوں سے عاری سر میں چھوٹے چھوٹے سوئیوں کی مانند سوراخ ہو گئے جن سے خون کی ہلکی ہلکی پھوار ارد گرد گر رہی تھی اور وہ چاروں رام کے خون سے اپنا منہ رنگتے چلے جا رہے تھے۔

پریتم کے بعد پانی سے بھرے غبارے کی مانند ادھر ادھر ڈالتا ہوا روی آگے بڑھا اور رام کو اس کے پاؤں سے پکڑ کر کمرے سے باہر پھینکتا ہوا خود بھی باہر آ گیا۔ بارش ابھی تک جاری تھی۔ رام کی چیخیں اب پورے گاؤں میں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ چیخیں سوائے رام اور ان چاروں لاشوں کے کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔

روی نے پھر رام کو ایک ٹانگ سے پکڑا اور زور سے گھر کے خارجی دروازے کی طرف پھینک دیا۔ رام دروازے میں اتنے زور سے لگا کہ دروازہ اپنی جگہ سے اُکھڑ گیا اور رام دروازے کے باہر جا گرا۔ رام کے جسم پر لپٹے ہوئے کپڑے خون سے بھر گئے تھے۔

چاروں رام کو گاؤں کے چوراہے پر لے آئے۔ رام کو نیچے زمین پر پٹخ کر وہ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اب

اُن چاروں کے چہروں پر شدید غصہ تھا۔ آنکھیں خون رنگ ہوگئی تھیں۔ ان کے چہرے اتنے خوفناک ہوگئے تھے کہ ان کو جو بھی دیکھ لیتا فوراً وہیں جان کی بازی ہار جاتا۔

''کیا قصور تھا ہمارا..... کیوں ہماری موت کو لکھا تم نے..... کیوں ایسی موت دی جو سوچنے والے کو ساری زندگی پاگل بنائے رکھے.....؟'' گوتم نے غصے سے رام سے سوال کیا۔

رام کے پاس سوائے آہوں اور درد کے کچھ نہ بچا تھا۔ وہ تو خود نہیں جانتا تھا کہ اُس کے نادانی کیا رنگ لے آئے گی۔

''میں نے تم کو نہیں مارا۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہیں بھگوان کا واسطہ ہے۔ مجھے معاف کر دو۔'' رام نے ان کے سامنے روتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔

''معافی ہی تو نہیں مل سکتی تمہیں۔ تم نے ہمیں جو موت دی ہے وہ ہمارا حق نہیں تھی۔ لیکن ان تمہیں جو موت ہم دیں گے وہ تمہارا ضرور حق ہے۔'' پریتم نے خوفناک منہ بناتے ہوئے دہشت سے کہا۔

''دیکھو جو بھی ہوا وہ سب غلطی سے ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جو میں لکھ رہا ہوں وہ سب حقیقت میں بھی پیش آ سکتا ہے۔ مجھے معاف کر دو..... معاف کر دو مجھے۔'' رام تواتر سے ہاتھ جوڑے معافی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مگر اکثر طلب کی تکمیل نہیں ہوتی۔ آج بھی وہی سب کچھ ہو رہا تھا۔

''تم نے ہمارا موت نامہ تو لکھ لیا۔ لیکن انجانے میں تم نے اپنی موت بھی خود اپنے ہاتھوں سے لکھ دی ہے۔ اب ہم تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے جیسا انصاف تم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔'' نارائن نے اتنا کہتے ہی اپنے ڈھانچے میں ڈھلے ہاتھ کی انگلیوں کو رام کی ران میں ٹھونس دیا۔ درد و تکلیف کی بھرپور لہر رام کے انگ انگ میں اٹھی۔ اس کی چیخیں ہر سو گونج رہی تھیں مگر کوئی بھی انکو سننے والا نہیں تھا۔

روی آگے بڑھا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کو زور سے رام کی بائیں ٹانگ پر گرایا۔ رام کی اس ٹانگ کی تمام ہڈیاں چیخ سے ٹوٹ گئی۔ درد کی وجہ سے رام کی آنکھوں سے بھی خون بہنے لگا۔ اس کی ناک سے بھی سیاہ خون بہتا ہوا اس کے منہ پر پھیل چکا تھا۔

گوتم نے رام کے دائیں بازو کو پکڑ لیا اور پریتم نے رام کے بائیں بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور ایک ساتھ دونوں نے زور کا جھٹکا دیا۔ رام کے دونوں بازو اُس کے دھڑ سے جدا ہوگئے۔

رام کو جو درد مل رہا تھا وہ درد دراصل انجانے میں اس نے خود ہی اپنی قسمت میں لکھا تھا۔ اب اس درد سے بچا کی ایک صورت تھی اور وہ صورت صرف موت تھی۔ ایک ٹانگ ٹوٹنے اور دونوں بازو دھڑ سے الگ ہونے کے باوجود رام مرا نہیں تھا نہ ہی بے ہوش ہوا تھا۔ شاید اسے اپنی موت کا منظر آخری سانس تک دیکھنا تھا۔ وہ اپنی موت کا کھیل دیکھنے سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔

رام گاؤں کے چوراہے پر گیلی زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم کے ہر ایک حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خود اُس وقت موت کی دعا کر رہا تھا۔ تکلیف حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ شاید درد کا آخری مقام بھی طے کر لیا تھا رام نے۔ پھر چاروں لاشیں ایک ساتھ رام کی جانب بڑھیں۔ گوتم اور روی نے رام کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور ایک جھٹکا دے کر دھڑ سے الگ کر دیں۔ عین اسی سے رام کی موت واقع ہوگئی۔ انہوں نے رام کے جسم کے ہر ایک حصے کو وہیں درخت پر لٹکا دیا، اور اُس کے سر کو وہیں چوراہے پر رکھ دیا، اور اچانک وہ لاشیں جو دراصل شیطانی روحیں تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں سے غائب ہوگئیں۔

اس منتروں والی کتاب پر رام کی لکھی ہوئی کہانیاں رام کے مرتے ہی خود بخود صاف ہوگئیں۔ کتاب کے صفحات پہلے کی طرح کورے ہوگئے بالکل ایسے جیسے اُس پر کبھی کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔

وہ چاروں روحیں تو رام کی موت کے ساتھ ہی مکتی پا گئی تھیں مگر رام کی روح کو مُکتی نہیں ملی تھی۔ رام کی روح اب بھی اس کے گھر میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اُسے مکتی صرف ایک صورت میں مل سکتی ہے کہ رام کے جیسا ہی کوئی شخص آئے اور اُس کتاب کو بنا پڑھے جلا دے۔ مگر ایسا کب ہو سکتا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

(قسط نمبر1)

وجود حیات

عرفان رامے

ایک ایسے انسان کی کہانی جو اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے وہ بہت دور نکل آیا تھا

وجود میں حیات تلاشنا آسان نہیں بسا اوقات وجود ہوتا ہے لیکن حیات نہیں اور کبھی حیات وجود تلاشتے تھک ہار کر جان ہی دے دیتی ہے مگر معلوم نہیں اس سلسلے میں کس موڑ پر وہ اپنے وجود سے الگ ہوئی حیات کو ڈھونڈ بھی پاتا ہے یا نہیں۔

زندگی انجان راستوں کا سفر ہے۔ اس میں کون، کب، کہاں اور کیسے مل جائے کوئی نہیں جانتا۔ لمحے جب کھو جائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔ محبتوں کے پڑاؤ میں وفاؤں کے سائباں نہ ہوں تو راستہ کٹھن ہو جاتا ہے۔

رشتوں کے درمیان شیشے کی دیوار کی کہانی محبتوں، عداوتوں اور سازشوں میں گندھی سحر انگیز سلسلے وار کہانی

ائیر پورٹ کی عالیشان عمارت سے باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہی تیمور برنی نے کلائی گھما کر گھڑی پر نظر دوڑائی اور سگریٹ سلگا کر بند شیشے سے ٹکرانے والی بوندوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش اور برفانی ہواؤں نے سردی میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔

ائیر پورٹ سے گھر تک کا سفر قریباً ایک گھنٹہ پر محیط تھا اور بارش بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بیوی نویرا کو یوں اچانک واپسی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ عام حالات میں وہ اکثر نویرا کو فلائٹ شیڈول سے آگاہ کر دیا کرتا تھا اور وہ اسے لینے کے لیے ائیر پورٹ بھی آجایا کرتی تھی۔ مگر آج موسم کی شدت کا احساس کرتے ہوئے اس نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔

دوسری خاص وجہ یہ بھی تھی کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ وہ گھر پہنچ کر نویرا کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس نے نویرا کے لیے خاص طور پر ایک قیمتی ڈائمنڈ بریسلٹ بھی خریدا تھا۔

نویرا کو ڈائمنڈ پہننے کی بہت آرزو تھی۔ ماضی میں اپنے کمزور مالی حالات کے باعث تیمور برنی آج تک اس کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ مگر اب صورت حال پہلی سی نہیں رہی تھی۔ اس کی آمدن میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ اب اپنی بیوی بچوں کی خواہشات آسانی سے پوری کر سکے۔

تیمور کو نویرا سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ وہ اس کی بیوی ہی نہیں دوست بھی تھی۔ ان کی شادی کو دس سال گزر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بیٹیوں سے نوازا تھا مگر آج بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو نو بیاہتا جوڑے کی طرح چاہتے تھے۔

نویرا خود بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی اور کسی صورت اپنی تعلیمی قابلیت کو کچن میں روٹیاں پکاتے ہوئے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے تیمور کی اجازت سے ایک ہسپتال میں بطور ایڈمنسٹریٹر ملازمت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ملازمت کے باوجود اس نے کبھی اپنے بچوں کی پرورش یا گھرداری میں لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسی لیے تو تیمور برنی اسے ایک آئیڈیل بیوی قرار دیتا تھا۔

گھر کے سامنے پہنچ کر تیمور برنی نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے رخصت کیا اور پھر انگلیوں میں دم توڑتے سگریٹ کا آخری کش لے کر فلٹر کو گیلی سڑک پر اُچھال دیا ....اب وہ خالی سڑک پر کھڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ گھر میں داخل ہونے سے قبل وہ فضا میں بکھری ہوئی بھیگی تازگی کو اپنے وجود میں سمو لینا چاہتا تھا کیونکہ نویرا کو سگریٹ کی بو

NW
SE
S

سخت ناپسند تھی۔ خصوصاً اس وقت جب وہ چند روز گھر سے باہر گزار کر واپس آیا ہو۔

بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ خنکی کے باوجود ہلکی پھوار اسے بہت فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ تیمور برنی چند لمحے اس خوشگوار ٹھنڈک کو محسوس کرنے کے بعد قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور چابی سے گیٹ کا لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

شہر کے پوش علاقے میں جدید طرز تعمیر کا حامل یہ چھوٹا سا گھر بیرونی منظر سے ہی اپنے مکینوں کی نفاست پسندی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ گیٹ بند کرنے کے بعد وہ پورچ میں کھڑی اپنی کار کے قریب سے گزر کر اندرونی عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ایک بار پھر چابی لاک میں گھما کر گھر کے داخل ہو گیا۔

ان کے ہاں کل وقتی ملازم نہیں تھا، البتہ گھر میں ایک اُدھیڑ ملازمہ ضرور کام کرتی تھی جو دن بھر کا کام نبٹا کر مغرب کے بعد اپنے گھر لوٹ جاتی تھی۔ تیمور برنی چونکہ اکثر دیر سویر سے گھر لوٹتا تھا اس لیے نوریا کو بے آرام کرنے کی بجائے دروازے کی اضافی چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔

ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر تیمور برنی ٹی وی لاؤنج میں پہنچا تو چند قدم کے فاصلے پر خواب گاہ کے ادھ کھلے دروازے سے مدھم نیلی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ سکون سے چلتا ہوا آگے بڑھا تو سامنے بیڈ پر اپنے مخصوص سلیپنگ گاؤن میں نوریا دکھائی دی۔ پیروں کی حرکت بتا رہی تھی کہ وہ ابھی تک جاگ رہی ہے۔

نوریا کو دیکھ کر تیمور برنی کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ لیکن یہ مسکراہٹ بہت عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ جیسے ہی اس نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

یہ دیکھ کر وہ خود کو ریزہ ریزہ ہوتا محسوس کر رہا تھا کہ بیڈ روم میں اس کی جان سے پیاری بیوی اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی موجود تھا۔

بے وفائی کے ہاتھوں وفا کا قتل دیکھ کر تیمور برنی سکتے میں آ گیا تھا۔ اسے اپنے بیڈ روم میں موجود غیر مرد کسی عفریت کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اُس اجنبی نے اپنی بانہیں نوریا کی کمر کے گرد حمائل کر کے اسے اپنے بہت قریب کر رکھا تھا۔ نوریا کا سر اس کے سینے پر ہونے کے باعث تیمور برنی اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں دھیمی آواز میں میوزک بج رہا تھا اور کبھی کبھی ان دونوں کی سمجھ نہ آنے والی سرگوشیاں بازگشت بن کر تیمور کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

اس کریہہ منظر نے تیمور برنی کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بظاہر بے پناہ محبت کرنے والی نوریا اس کے اعتماد کا یوں بے دردی سے خون بھی کر سکتی ہے۔ لیکن سب کچھ جانتی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ فیصلہ کن انداز میں دبے پاؤں چلتا ہوا اسٹڈی روم کی جانب بڑھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے میز کی دراز سے چمکتا ہوا سائلنسر لگا ریوالور نکالا اور چیمبر میں گولیوں کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد تیزی سے بیڈ روم کی جانب لوٹ آیا۔ شدید غصے سے اس کا خون بری طرح کھول رہا تھا۔

بیڈ روم کا منظر ابھی تک جوں کا توں تھا۔ وہ دونوں اتنے مدہوش تھے کہ کسی کو تیمور برنی کی غیر متوقع واپسی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

اُن کی اسی بے خبری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تیمور برنی آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم نیلی روشنی میں اسے بیڈ پر اٹھکیلیاں کرتے مرد کا چہرہ ابھی تک واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی تیمور برنی ان کے قریب پہنچا کمرے میں کسی تیسرے وجود کی سرسراہٹ محسوس کرتے ہی وہ دونوں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

جب ان کی نظر سامنے کھڑے تیمور برنی پر پڑی تو دونوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ زیادہ بری حالت نوریا کی تھی۔ اس کی آنکھیں اپنے شوہر کو سامنے دیکھ کر حیرت، خوف اور پشیمانی سے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔

پھر اس ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل پیدا ہوئی اور اجنبی مرد نے بیڈ سے اُتر کر بھاگنے کی کوشش کی۔ تیمور برنی پہلے ہی اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ جونہی اس مرد نے زمین پر قدم رکھا تیمور برنی کے ہاتھ میں موجود سائلنسر

لگے آتشی کھلونے نے دہکتا ہوا انگارا اُگل دیا... مگر گولی اپنے ہدف کے قریب سے ہوتی ہوئی دیوار میں جا دھنسی۔

تیمور برنی کو فائرنگ کرتے دیکھ کر قریب بیٹھی نویرا کو جیسے ہوش سا آ گیا اور وہ چیختی چلاتی تیزی سے ریوالور پر جھپٹ پڑی۔ ابھی وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے پائی تھی کہ تیمور برنی نے ہونٹ بھینچ کر ایک مرتبہ پھر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

دوسرا فائر ہوتے ہی نویرا کے مرمریں جسم کو جھٹکا لگا اور وہ چند لمحے کے لیے اپنی جگہ پر ڈگمگانے کے بعد پشت کے بل واپس بیڈ پر جا گری۔

تیمور برنی جس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے باپ کی نشانی اس ریوالور کو استعمال کیا تھا نویرا کو یوں ڈھیر ہوتا دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اسی گھبراہٹ میں ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا تھا۔ گولی نویرا کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی اور گرم گرم خون جسم سے اُبل کر بیڈ شیٹ کو سرخ کیے چلا جا رہا تھا۔

غفلت کے ان لمحات سے کمرے میں موجود تیسرے فرد نے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور وہ تیمور برنی کو زوردار دھکا دے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

تیمور برنی جو کہ اس ساری صورت حال سے بہت گھبرا گیا تھا سنبھل کر اُٹھتے ہی تیزی سے اس شخص کے تعاقب میں لپکا... لیکن اس وقت تک وہ شیطان صفت اجنبی گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تیمور برنی اس کے تعاقب میں مین گیٹ سے باہر پہنچا تو سڑک پر دُور دُور تک کسی ذی روح کا نشان تک نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کچھ دور تک اجنبی شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر زخمی نویرا کا خیال ذہن میں آتے ہی واپس گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

تیمور جب نویرا کے پاس واپس پہنچا تو وہ آخری سانس لے رہی تھی۔ اسے یوں زخمی حالت میں دیکھ کر تیمور کے دل میں محبت اور نفرت دونوں قسم کے جذبات نے بیک وقت سر اُٹھا لیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ نویرا کو اپنی محبت کا یقین دلائے یا پھر اس کی بے وفائی پر نفرت کا اظہار کرے۔

وہ چند لمحے ساکت کھڑا بغور نویرا کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھتا رہا اور پھر قریب بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے یہ سب کیوں کیا نویرا..... تم پر تو مجھے اپنی ذات سے بھی زیادہ بھروسہ تھا۔ میں نے تو تمہیں پرستش کی حد تک چاہا تھا، پھر کیوں تم نے میرے مان، میرے فخر اور میری محبت کو پیروں تلے روند ڈالا.....''

''یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے تیمور برنی..... جس سے میں نے محبت کی وہ مجھے اس مشکل وقت میں چھوڑ کر فرار ہو گیا اور جس سے زندگی بھر نفرت کرتی رہی اسی کی آغوش میں دم توڑ رہی ہوں۔ کتنا روئی تھی میں، کتنی منت سماجت کی تھی اپنے والدین کی کہ میں شہزاد کے بنا جی نہیں پاؤں گی۔ مگر انھیں تو میری محبت سے بلاوجہ کی چڑ تھی۔ باپ نے خودکشی کی دھمکی دی تو ماں نے دوپٹہ اُتار کر میرے قدموں میں رکھ دیا... یوں محبت ہار گئی اور تم والدین کی پسند میری زندگی میں آ گئے۔ کاش میں نے اسی دن گھر چھوڑ دیا ہوتا جب شہزاد نے مجھے کورٹ میرج کا مشورہ دیا تھا۔ مگر مجھ پر تو خاندان بھر کی عزت کا بھوت سوار تھا۔''

نویرا کی پُرنم آنکھوں میں اب بھی تیمور برنی کے لیے نفرت تھی۔

''اگر مجھ سے کوئی اختلاف تھا تو شکوہ کیا ہوتا۔ میرا ساتھ پسند نہیں تھا تو جدائی مانگی ہوتی۔ یوں میری پیٹھ میں خنجر کیوں گھونپا تم نے..... میرا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی احساس کر لیا ہوتا۔ وہ تو ہماری محبت کی نشانی ہیں۔ کیوں ہر تعلق ہر رشتے کی تذلیل کی تم نے۔''

تیمور برنی نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ نویرا کو دیکھتے ہوئے کہا اور اُسے ہسپتال لے جانے کے لیے اُٹھنے ہی والا تھا کہ نویرا نے روئے زمین پر آخری ہچکی لی اور تیمور برنی کے چہرے پر مرکوز اس کی ہرنی کی سی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔

خود تیمور برنی کی حالت بھی اس لمحے ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ نویرا نے مرنے سے قبل واقعی اُسے زندہ درگور کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے نویرا کا سر بیڈ پر رکھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کی بند کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی

اور پانی کی بوندیں کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانے کے بعد باریک لکیروں کی شکل اختیار کررہی تھیں۔

تیمور برنی کا ذہن موجودہ صورت حال پر تیزی سے غور کررہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی مانند کوندا کہ نویرا کبھی کبھی رات گئے تک بیٹھ کر اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی..... اور اکثر وعدہ لیا کرتی تھی کہ وہ اس کی زندگی میں کبھی یہ ڈائری کھول کر نہیں دیکھے گا۔

ڈائری کا خیال آتے ہی وہ تیزی سے بیڈ روم میں موجود الماری کی جانب بڑھا جس میں نویرا کی وہ ذاتی ڈائری محفوظ تھی۔ الماری کھولی تو معلوم ہوا کہ وہ دراز لاک تھا جس میں ڈائری محفوظ تھی۔ تیمور برنی نے افراتفری میں دراز کی چابی ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پھر ناکامی پر لوہے کے ایک راڈ کی مدد سے دراز کا لاک توڑ ڈالا۔

اس کام سے فارغ ہوکر تیمور برنی نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری نکالی اور ٹیبل لیمپ آن کر کے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ ڈائری پڑھ رہا تھا اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا چلا جارہا تھا۔ ڈائری کے ابتدائی صفحات پر نویرا کے یہ الفاظ تیمور برنی کو نشتر کی طرح محسوس ہوئے تھے۔

''یہ میری زندگی کی سب سے تلخ حقیقت ہے تیمور برنی کہ میں نے شادی کے بعد تم سے ہر پل صرف اور صرف نفرت کی ہے۔ شہزاد میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر میرے والدین اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تمہارا رشتہ آیا تو میں نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن والدین میری شادی ہر صورت تم سے کرنے پر بضد تھے۔ انھوں نے مجھے قائل کرنے کے لیے ہر وہ نفسیاتی حربہ استعمال کیا جو ہمارے معاشرے میں رائج ہے۔ آخر کار جیت اُن کی ہوئی اور مجھے کسی بے زبان جانور کی طرح تمہارے سپرد کردیا گیا۔

شادی کے بعد ایک وفا شعار بیوی کا کردار ادا کرتے ہوئے بظاہر تو میں نے ہر پل تمھیں اپنی محبت کے حصار میں جکڑے رکھا لیکن باوجود کوشش کے شہزاد کو بھلا نہیں پائی۔

میں اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کرچکی تھی کہ اب میں کبھی بھی شہزاد کی نہیں ہو پاؤں گی اور مجھے ساری زندگی تمہارے گھر میں گھٹ گھٹ کر جینا ہوگا۔ میں نے دنیا داری کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے چہرے پر وفا شعار بیوی کا ایسا نقاب چڑھا لیا تھا کہ تم اتنا قریب ہونے کے باوجود بھی میری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کے بھڑکتے ہوئے الاؤ کو محسوس نہیں کرپائے تھے۔''

تیمور برنی اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ اسے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس میں سکت نہیں رہی تھی کہ ڈائری کا مزید مطالعہ کرکے کسی حتمی نتیجے تک پہنچ سکے۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح چلتا ہوا ایک مرتبہ پھر نویرا کے قریب آگیا جو خون میں لت پت پڑی تھی۔ نویرا کی بے نور آنکھوں میں اسے اپنے لیے نفرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈائری پڑھنے کے بعد تیمور برنی کے دل میں نویرا کی محبت ہمیشہ کے لیے دم توڑ گئی تھی۔ اب اسے اپنے قاتل ہونے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔

اس وقت تیمور برنی کے سامنے اس پرکشش عورت کی لاش پڑی تھی جو کچھ دیر قبل تک اس کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اس کے ہونٹ، بال، کاندھے، کاتل اور گھنیری پلکیں..... سب تیمور برنی کے لیے اہم تھیں۔ مگر اب ایک عام سی عورت محسوس ہورہی تھی..... اپنے معیار سے گری ہوئی عورت جسے اپنے شوہر کی زندگی میں ہی کسی غیر مرد کی محبت نے جکڑ رکھا تھا..... اس وقت نویرا، تیمور برنی کو غلاظت کی ایک ایسی پوٹلی محسوس ہورہی تھی جو اپنی باطنی نجاست کو ریشمی غلاف میں لپیٹ کر مصنوعی خوشبو کے سہارے اس کے دل کے تخت پر براجمان ہوگئی تھی۔

یہ سوچ کر جبران برنی نے جھرجھری سی لی اور پھر ایک نیا خیال ذہن میں آتے ہی اپنی بیٹیوں کے بارے سوچنے لگا۔

''مجھے ان دونوں کو مار کر خودکشی کرلینی چاہیے تاکہ دنیا والوں کے لیے یہ واقعہ کبھی حل نہ ہونے والا معمہ بن کر رہ جائے۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ''لیکن یہ سب فوری طور پر کیسے ممکن ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

اس کی بڑی بیٹی اریبا ان دنوں اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ جبکہ چھوٹی نگار اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔

''فی الوقت مجھے نگار کو موت کی نیند سلانا ہوگا۔''

فیصلہ کرتے ہی تیمور برنی نے دوبارہ ریوالور اُٹھایا اور

بچیوں کے بیڈ روم میں جا پہنچا۔ سامنے چار سالہ نگار نرم و گداز بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ تیمور برنی نے بیڈ کے سرہانے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور بغور اپنی بیٹی کے معصوم چہرے کی جانب دیکھنے۔

چند لمحے بعد اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ریوالور کی نال بچی کی کنپٹی پر رکھ دی۔

عین اس لمحے جب ٹریگر دبتے ہی گولی اپنے ہدف کی جانب بڑھنے والی تھی تیمور برنی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اندر سے اُسے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔

''ہوش کرو تیمور برنی..... کیوں اس معصوم کی جان لینے پر تلے ہو۔'' ضمیر کے جھنجھوڑتے ہی ٹریگر پر انگلی کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔

اب تیمور برنی کے اندر ایک جنگ سی جاری تھی۔ کچھ سمجھ نہ آنے پر اس نے نگار کی پیشانی پر بوسہ دیا تو بخار میں بری طرح جھلس رہی تھی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ اس نے نگار کو کمبل میں لپیٹ کر کندھے سے لگا لیا اور شدید پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر آ گیا۔

وہ ہر صورت یہاں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ صبح سویرے ملازمہ کے آتے ہی نویرا کے قتل کی خبر آگ کی طرح پھیل جائے گی اور پھر اس کا بچ نکلنا محال ہو جائے گا۔

آسمان پر بادلوں کی گھن گرج جاری تھی مگر بارش تھم چکی تھی۔ تیمور برنی نے اپنی ذاتی کار استعمال کرنے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا تھا۔ کیوں کہ دل میں یہ خوف بھی سر اُٹھانے لگا تھا کہ کسی بھی ناکے پر کار رُوک کر اُسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ چناں چہ وہ پیدل ہی اپنی بیٹی کو کندھے سے لگائے گیلی سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔

تیمور برنی نگار کو اپنے ساتھ لے تو آیا تھا مگر خیر اور شر کے درمیان کشمکش اب بھی جاری تھی۔ دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''بیٹی کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے اس کرب سے نجات حاصل کر لو..... تمہاری بیوی کے ایک غیر مرد سے ناجائز تعلقات تھے..... ممکن ہے یہ تمہاری ناجائز اُولاد ہو۔''

لیکن دماغ اسے مسلسل احتیاط برتنے کی تلقین کر رہا تھا۔

''ایک قتل تو تم کر آئے ہو تیمور برنی..... اب اپنی معصوم بچی کی جان لے دوسرا کبیرہ گناہ مت کرنا۔ کیسے مار سکتے ہو تم اپنی جان سے عزیز بیٹی کو جو تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے.....''

انہی سوچوں میں وہ کئی کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے ایک بس اسٹاپ پر جا پہنچا۔ یہ پرانی طرز کا بنا ہوا ایک برآمدہ نما بس اسٹاپ تھا جہاں شاید کسی بے گھر شخص نے کچھ دیر قبل سوکھی لکڑیاں جلا کر خود کو بارش سے محفوظ رکھا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر سردی کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہوئی تو وہ دیوار کے سہارے پڑے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گیا۔

''نگار کو اسی جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر یہ میرے ساتھ رہی تو میں کبھی اپنا دل صاف نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے ہمیشہ نویرا اور شہزاد کے تعلقات کا خیال ستاتا رہے گا۔ اس بچی کی زندگی باقی ہے تو قدرت ضرور اس کی مدد کرے گی۔ یقیناً کوئی نیک انسان اسے اپنے ساتھ لے جائے گا' یوں میرا ضمیر مجھے اپنی بیٹی کے قتل پر ملامت نہیں کرے گا..... ویسے بھی مجھے نئی منزلوں کی تلاش میں ہمیشہ کے لیے اس شہر کو چھوڑ جانا ہے۔ مجھے اپنی اولاد یا گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ قانون اور معاشرے کی نظر میں میری حیثیت اب ایک قاتل کی ہے۔ مجھے اس علاقے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔'' تیمور برنی فیصلہ کن انداز میں بڑبڑایا۔

اس نے نگار کو نیم تاریک بس اسٹاپ کے بینچ پر لٹا دیا اور پھر آخری مرتبہ اس کے معصوم چہرے کو غور سے دیکھنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

تیمور برنی جلد از جلد اپنی بچی اور گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ پولیس کا خوف بھی مسلسل اُسے ستا رہا تھا۔ وہ قریباً دوڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ سڑک کے کنارے درخت کے ٹوٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

جب بے ترتیب سانسیں بحال ہوئیں تو دل کے کسی گوشے میں دبی محبت کی چنگاری نے پھر سے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور سویا ہوا ضمیر ملامت کرنے لگا۔

''اتنا برا سلوک تو انسان اپنے دشمن سے بھی نہیں کرتا جتنا تم نے اپنی معصوم بیٹی سے کیا ہے تیمور برنی..... محض

شک کی بنیاد پر کہ وہ تمہاری بیٹی نہیں، تم اسے ویرانے میں چھوڑ آئے ہو۔ اگر تمہارا شک غلط ثابت ہوا تو عمر بھی خود کو معاف نہیں کر پاؤ گے۔ باپ تو بیٹیوں کے محافظ ہوا کرتے ہیں اور تم خود اُسے زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے ہو۔ فوراً واپس جاؤ اور اپنی غلطی کا ازالہ کرو۔ ورنہ سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تمہارے۔''

ضمیر پر احساس کا نیا چابک پڑتے ہی تیمور برنی کے تن بدن میں بجلی سی بھر گئی۔ وہ بنا مزید کچھ سوچے اپنی جگہ سے اُٹھ کر دیوانہ وار بس اسٹاپ کی جانب دوڑ پڑا جہاں کچھ دیر قبل نگار کو چھوڑ کر آیا تھا۔

خود کو ملامت کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

مگر جیسے ہی وہ اپنی منزل پر پہنچا، بس اسٹاپ کی بینچ کو خالی دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ نگار وہاں نہیں تھی۔ لکڑی کی بینچ جس پر وہ اپنی بیٹی کو بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا خالی پڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

''نگار کہاں گئی..... کہاں گئی میری بچی۔'' وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔

''نگار..... نگار.....''

''نگار کہاں ہو تم.....''

تیمور برنی دیوانہ وار چیختا چلاتا ادھر اُدھر نگار کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ بیٹی جو باپ کی ایک آواز پر بھاگ کر لپٹ جایا کرتی تھی آج اسے اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلا رہی تھی۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی تھی۔

تیمور برنی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ بیٹی سے کچھ ہی دیر کی جدائی نے اس کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو پکارتا ہوا خالی سڑک پر دوڑا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک موڑ پر سامنے سے نمودار ہونے والی تیز رفتار کار کی ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھوں کو چندھیا کر رکھ دیا.... پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا آنے والی گاڑی کی زوردار ٹکر نے اُسے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھال کر کئی میٹر دور کیچڑ میں جا پٹخا۔

اس حادثے میں شدید زخمی ہونے کے باوجود تیمور برنی نے تیزی سے سنبھل کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر سر میں لگنے والی چوٹ کے باعث چکرا کر واپس زمین پر گر پڑا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے زخمی چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر ذہن تاریکی کا حصہ بن گیا۔

-☆-☆-☆-

بس اسٹاپ کے عقب میں واقع پارک کے اندر بنے شیڈ کے نیچے بے سدھ پڑے جمالے کو نیم بستہ ہواؤں نے آج وقت سے پہلے ہی جگا دیا تھا۔ وہ رات کو نشے کا سگریٹ سلگا کر بس اسٹاپ کے اندر ہی لیٹ جایا کرتا تھا۔ مگر آج باہر سردی میں لیٹنے کی ایک وجہ یہ بنی تھی کہ اسٹاپ کے اندر چند پولیس والے آگ جلائے بیٹھے تھے۔ قریب ہی پولیس پٹرولنگ کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔

جمالا نشے کی حالت میں ان کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس لیے پارک ہی میں شیڈ کے نیچے لیٹ گیا تھا۔ اُس رات شدید سردی تھی۔ آسمان پر ہونے والی بادلوں کی گرج چمک، بارش اور سرد ہواؤں نے اسے اپنے غلیظ لحاف اور اس پر موجود پلاسٹک کی شیٹ کے اندر بھی برف بنا دیا تھا۔ چناں چہ وقت سے پہلے آنکھ کھلنے پر وہ بدمزگی کے عالم میں پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف چل دیا جس کے پار بس اسٹاپ تھا۔

اس نے ٹوٹی ہوئی دیوار سے جھانک کر باہر دیکھا تو پولیس کی گاڑی جا چکی تھی۔ اب وہ پرسکون انداز میں ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھا اور بس اسٹاپ میں جا پہنچا۔

جیسے ہی جمالا بس اسٹاپ کے اندر داخل ہوا سامنے بینچ پر کمبل میں لپٹی ہوئی معصوم سی بچی کو دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ لمحہ بھر میں سگریٹ کا بچا کھچا نشہ بھی ہرن ہو گیا۔ اس نے چٹکی کاٹ کر خود کو اپنے ہوش میں ہونے کا یقین دلایا اور پھر تیزی سے چلتا ہوا بچی کے سرہانے جا بیٹھا۔

کچھ فاصلے پر روشن سٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں بچی کا چہرہ چاند کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی اچھے گھرانے کی بیٹی معلوم ہو رہی تھی۔

''کون ہو سکتی ہے یہ چاندنی گڑیا..... اور یہاں کیسے پہنچی..... اتنی چھوٹی سی بچی بارش میں خود گھر سے یہاں نہیں آ سکتی، یقیناً معاملہ کچھ اور ہے۔''

جمالے نے اس کے قریب بیٹھتے ہی خود سے کئی سوال

ماہنامہ

حجاب کراچی

مارچ 2020 کے شمارے کی ایک جھلک

عشق دی بازی — ریحانہ آفتاب کا سلسلے وار ناول

عشق نگر کے مسافر — ندا حسنین کا سلسلے وار ناول

دل کو کس کا ملال تھا — نادیہ احمد کا مکمل ناول

فرح طاہر، قرۃ العین سکندر، زینب ملک، فری انعم
عائشہ تنویر سمیت دیگر بہنوں کی خوب صورت تحریریں

اس کے علاوہ

قارئین کے ذوق کے عین مطابق مستقل سلسلوں میں پڑھیے

بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخاب
شوخی تحریر، حسن خیال، ہومیو کارنر، ٹوٹکے

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں/ (021-35620771/2)

کر ڈالے تھے۔ لیکن اگلے ہی پل اس کی زرد آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ اس نے سر کو جھٹک کر خیالات کی گرد جھاڑ دی۔ اب اسے اپنے کسی سوال کے جواب کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس بچی کی بدولت اس کی بہت سی مشکلات آسان ہونے والی تھیں۔

جمالے نے آگے بڑھ کر بچی کی پیشانی کو چھوا تو احساس ہوا کہ وہ بخار کی شدت سے انگاروں کی طرح دہک رہی ہے۔ لیکن جمالے کو اس کی بیماری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اگر دنیا میں کسی چیز سے سروکار تھا تو وہ صرف نشے کی پڑیا تھی۔

''واہ میرے مالک..... کون کہتا ہے تو نشہ کرنے والوں کا خدا نہیں۔ کیسا وسیلہ بنا دیا ہے تو نے۔ سچ کہتے ہیں مولوی صاحب! خدا کیڑے کو پتھر میں رزق دیتا ہے۔ آج ثابت ہو گیا کہ تو نشئی لوگوں کو ٹھٹھرتی راتوں میں بھی رزق دے سکتا ہے۔''

جمالے نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور نگار کو کمبل اور پلاسٹک کی شیٹ میں لپیٹ کر کندھے سے لگا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سنہری چڑیا اپنی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی سرد موسم کی بھینٹ چڑھ جائے۔ چناں چہ مکمل تیاری کرنے کے بعد وہ بس اسٹاپ سے باہر نکل آیا۔

اس موقع پر جمالے نے بجائے سیدھی سڑک پر سفر کرنے کے اسٹاپ کے عقب میں موجود پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار عبور کی اور تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ جمالا نشئی ضرور تھا مگر بے وقوف ہرگز نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رات کے اس پہر پولیس کی پٹرولنگ گاڑی سڑک پر گشت کرتی رہتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر وہ بچی کے ساتھ دھر لیا گیا تو بچاؤ کی کوئی صورت نہ بن پائے گی۔ بچی کے اغوا کا الزام اُسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی پہنچا سکتا تھا۔

پارک سے گزر کر جمالا چوک کی دوسری جانب شہر کے بڑے قبرستان کے پاس موجود تھا۔ یہاں بھی اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور شہر خاموشاں میں داخل ہو گیا جس کا دوسرا گیٹ کافی دور ایک بڑی آبادی میں کھلتا تھا۔

اس مقام پر پہنچ کر وہ ایک برساتی نالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کافی دیر چلنے کے بعد بڑی آبادی ختم ہوئی تو اسے دور سے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ بچی کو اٹھا کر مسلسل چلتے رہنے کے باعث جمالے کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ لیکن وہ ہمت کر کے آگے بڑھتا رہا اور خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب پہنچ گیا۔

بارش اور سردی کے باعث سب لوگ اپنی اپنی جھگیوں میں دبکے پڑے تھے۔ جب وہ جھونپڑیوں کے قریب پہنچا خانہ بدوشوں کے کتوں نے ایک اجنبی کو اپنے علاقے میں پا کر زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

جمالا بے دھڑک آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ کتے مضبوط زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں اور صرف بھونک کر اپنے مالکوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔

چند شہریوں کو کاٹنے پر پولیس نے بستی والوں کو سختی سے حکم دیا تھا کہ آئندہ اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے گا جس کا کتا کسی کو کاٹنے کا مرتکب قرار پا..... اس وارننگ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ انھوں نے اپنے کتوں کو شام ڈھلتے ہی باندھنا شروع کر دیا تھا۔

جمالے نے اپنا سفر جاری رکھا اور بستی کے وسط میں موجود ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر ہانپتی آواز میں اپنی آمد کی اطلاع دی۔

''خلیفہ جی..... او خلیفہ جی.....''

جمالے کی ہانپتی کانپتی آواز اندر مکینوں تک پہنچی تو جھونپڑی کا پردہ سرکا اور ایک لمبا تڑنگا، ہٹا کٹا شخص لالٹین تھامے باہر نکل آیا۔

''ابے جمالے تو اس وقت..... ابے کیا شہر میں بھونچال آگیا ہے جو تو اتنی سردی اور بارش میں یہاں بھاگ آیا؟''

''فضول باتیں مت کرو خلیفہ..... تمہارے لیے ایک ہیرا ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ دیکھو گے تو طبیعت اتنی خوش ہو جائے گی کہ قیمت سے زیادہ انعام دے ڈالو گے مجھے۔''

جمالے نے کاندھے سے لگی نگار کو تھپتھپا کر خلیفہ کو اپنی آمد کا مقصد واضح کیا۔ یہ سن کر خلیفہ نے چونک کر اس کی

جانب دیکھا اور پھر رال ٹپکاتا ہوا بولا۔

''ابے الو! تو پھر باہر کیوں کھڑا ہے۔ اگر تجھے سردی لگ گئی تو جان نکلنے کے بعد بھی ہنستا دکھائی دے گا اور دفنانے والے اسی غلط فہمی کا شکار رہیں گے کہ نیک آدمی اس پاپی دنیا سے چھٹکارہ پانے کے بعد خوشی خوشی اگلے جہان رخصت ہو رہا ہے۔ چل شاباش آجا اندر۔''

خلیفہ نے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور بے تکلفی سے جمالے کا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی ایک ناگوار سی باس نے جمالے کا استقبال کیا۔ یہ گھٹن زدہ ماحول اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

جھونپڑی کے ایک کونے میں بچھے خستہ حال قالین پر خلیفہ کے درجن بھر بچے پکی ہوئی سویوں کی مانند آپس میں الجھے ہوئے سو رہے تھے۔ قریب ہی بچھی ایک بڑی سی چارپائی پر خلیفہ کی بیوی تاجاں، جمالے کی بے وقت آمد پر ناگواری سے اپنے سر کو کھجانے میں مصروف تھی جو یقیناً جوؤں کی افزائش کے لیے کسی نرسری سے کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

''کیسی ہو تاجاں.....؟''

جمالے نے تاجاں کی اس ادائے بے نیازی کو نظر انداز کرتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا تو وہ اُکتاہٹ سے بھرپور جمائی لے کر اس جملے میں چھپی خواہش کو محسوس کرتے ہوئے منہ پھاڑ کر بولی۔

''دفع دور..... کالا منہ، نیلے پیر ہوں تیرے منحوس جمالے۔''

تاجاں کا جواب سن کر جمالے نے برا سا منہ بنا لیا تو خلیفہ اپنا قہقہہ نہ دبا سکا۔

''یوں نہیں کہتے تاجاں، جمالا اپنا خاص آدمی ہے۔''

''تو نہیں جانتا اس ندیدے کو، یہ صرف تیرے سامنے مسکین بنتا ہے۔ تیری غیر موجودگی میں اس کی بدمعاشیاں عروج پر ہوتی ہیں۔''

تاجاں کی اس بات نے جمالے کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر خلیفہ کو اس بات کا شک ہو گیا کہ وہ اس کی پرکشش خدوخال رکھنے والی میلی کچیلی بیوی کا عاشق ہے، اور کبھی کبھار خیراتِ حسن وصول کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو خلیفہ اس کو کچا چبا جائے گا۔

چناں چہ وہ ہڑبڑا کر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''چھوڑ خلیفہ ان عورتوں کی تو عقل ہی گٹوں گوڈوں میں ہوتی ہے، تم اپنا مال وصول کر کے مجھے فارغ کرو۔''

جمالے کی بدحواسی دیکھ کر تاجاں شرارت بھرے انداز میں زیرلب مسکرا دی۔ مگر جمالے نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور نگار کو چارپائی پر لٹا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خلیفہ اور تاجاں لڑکی کو دیکھنے کے لیے اس پر جھک گئے تھے۔

تاجاں بغور نگار کے چہرے کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی جہاں فرشتوں کی سی معصومیت تھی۔ جب کہ خلیفہ ان باتوں سے بے نیاز یوں الٹ پلٹ کر نگار کے ہاتھ پاؤں چیک کر رہا تھا جیسے قصائی جانور کو ٹٹول کر گوشت کا اندازہ لگا رہا ہو۔

''سچ بتانا جمالے کہاں سے لایا ہے یہ چھوکری.....؟''

تاجاں نے نگار کے چہرے سے نظریں ہٹا کر جمالے سے پوچھا تو وہ بے رخی سے بولا۔

''پیڑ گننے کی بجائے آم کھانے سے مطلب رکھو بی بی، صرف یہ بتاؤ کہ مال پسند آیا ہے یا میں کوئی اور گاہک تلاش کروں۔''

جمالے کے لہجے میں اجنبیت محسوس کر کے تاجاں کو بہت برا لگا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سخت جواب دیتی خلیفہ نے اپنے کام سے فارغ ہو کر گہری سانس لی اور جمالے کی طرف متوجہ ہوا۔

''چھوکری مجھے پسند ہے۔ لیکن پہلے صاف بتا دے، کوئی پولیس والا پھڈا تو نہیں ہے ناں۔''

''بالکل نہیں۔ ایک دم صاف ستھرا مال ہے۔''

''دیکھ جمالے سچ بولنا ورنہ تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر اپنے پیسے واپس نکال لوں گا۔'' خلیفہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو خلیفہ، میں خطرے والے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یہ لڑکی تو مجھے دو گھنٹے قبل بس اسٹاپ سے ملی ہے۔ پتا نہیں کون چھوڑ گیا ہے اسے۔ مجھے تو لگتا ہے ماں باپ مر گئے ہوں گے، یا سوتیلی ماں والا چکر ہو گا۔ اسی لیے کوئی اپنے گلے سے اُتار کر یہاں چھوڑ گیا۔'' جمالے نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

''ہوں ٹھیک ہے۔ اچھا بول کیا لے گا تو؟''

''تیس ہزار.....'' اس نے جواب دیا۔

''ابے اپنی قیمت ساتھ میں مت لگا۔ صرف لڑکی کی بات کر۔''

''تیس ہزار کچھ زیادہ نہیں ہیں خلیفہ۔ تم نے تو اس سے کئی تیس ہزار کما لینے ہیں۔''

''نہیں یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ لڑکی پانچ سال سے کم عمر کی نہیں ہوگی۔'' خلیفہ نے نگار کی عمر کا اندازہ لگایا۔

''ہاں اتنی تو ہوگی۔'' جمالے نے سر ہلایا۔

''پھر تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ ہمارے دھندے میں یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اس عمر میں بالک کو سمجھ بوجھ کم ہوتی ہے اور اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی زیادہ اثر نہیں کرتی۔ اگر کوئی راہ چلتے اسے پہچان لے تو الگ سے مصیبت بن جاتی ہے۔ اس لیے میں تجھے دس ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دے سکتا۔'' خلیفہ نے فیصلہ سنا دیا۔

''یہ تو بہت کم ہیں خلیفہ۔ چل تو دو ہزار کم دے دینا، مگر اس سے کم ہرگز نہیں۔'' جمالے نے کہا۔

'میں تجھے دس ہزار سے زیادہ ایک پیسہ نہیں دوں گا..... ویسے بھی تیری وجہ سے دس ہزار کا پہلے ہی نقصان ہو چکا ہے میرا۔ پچھلی بار جو لڑکا تو میرے پاس چھوڑ گیا تھا چوتھے دن ہی مر گیا تھا منحوس۔ اس لڑکی کو بھی تیز بخار ہے۔ ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا اور کون کون سی بیماریاں ہیں اسے۔ پتہ نہیں بچتی بھی ہے یا نہیں۔'' خلیفہ نے اپنی ماہرانہ رائے پیش کی تو جمالے کا منہ لٹک گیا۔

''یہ تو زیادتی ہے خلیفہ۔ دس ہزار بہت کم ہیں۔ کم از کم اتنا تو دے کہ میرا کچھ وقت سکون سے گزر جائے۔''

جمالے نے اپنی مجبوریوں کا رونا رویا تو بات بارہ ہزار میں طے پا گئی۔ خلیفہ نے اپنی چارپائی کے نیچے رکھا ہوا پرانا سا بھاری بھرکم صندوق کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں سے بارہ ہزار روپے گن کر جمالے کے ہاتھ میں تھما دیے۔

روپے ہاتھ میں آتے ہی جمالا یوں ہشاش بشاش ہو گیا جیسے اس کے جسم میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔ اس نے جلدی سے رقم کو اپنی میلی سی پھٹی پرانی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس لیا اور خلیفہ سے ہاتھ ملانے کے بعد تاجاں کو دیکھ کر آنکھ مارتا ہوا باہر نکل گیا۔

''دفع دور..... مردود..... نشئی کہیں کا۔''

تاجاں جو کہ پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اس کی الوداعی حرکت پر مزید سیخ پا ہو گئی۔

''جانے دے اسے۔ تنگ کرتا ہے تجھے اور تو ہے کہ بلاوجہ آگ بگولا ہو جاتی ہے۔'' خلیفہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ خون پی جاؤں اس مردود کا۔''

''اچھا اچھا بس کر۔ اگر وہ شیطان ہے تو حاجن تو بھی نہیں ہے تاجاں۔'' خلیفہ نے اسے گھرکا۔

''تو کہنا کیا چاہتا ہے خلیفے.....؟'' شوہر کی بات سن کر تاجاں سٹپٹا کر رہ گئی تھی۔

''بحث مت کر تاجاں..... اُٹھ کر چائے پانی کا انتظام کر۔ میرا دماغ اس وقت صرف اس لڑکی پر غور کر رہا ہے۔'' خلیفہ نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا سوچ رہا ہے تو اس کے بارے میں؟'' تاجاں چونکی۔

''لڑکی بری نہیں ہے۔ مگر اس کا جلد از جلد بندوبست کرنا ضروری ہے۔ ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا۔ موسم کافی خراب ہے اور لوگ اپنے لحافوں میں گھسے سو رہے ہیں۔'' خلیفہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو چاہتا کیا ہے..... کھل کر بتا خلیفے؟''

تاجاں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خلیفہ کی زبان سے وہ جملے نہیں سننا چاہتی تھی جو دن سنے اُسے سمجھ آ گئے تھے۔

''سوچ رہا ہوں اسے ابھی طیفے کے پاس لے جاؤں۔''

''اتنی جلدی.....؟'' تاجاں کا سانس سینے میں اٹک سا گیا تھا۔

''ہاں جلدی ضروری ہے۔ روشنی پھیلتے ہی والی وارث اسے ڈھونڈنے نکل پڑیں گے۔ پھر یہ لڑکی اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ اپنے ماں باپ کا نام نہ بتا سکے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ آج ہی اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں اس طرح یہ بیس پچیس دن کے لیے بستر سے جا لگے گی اور جب تک اس کے ہوش ٹھکانے آئیں گے دماغ بھی ٹھکانے پر آ چکا ہوگا۔ اس دوران یہ ہمارے

ماحول کی عادی ہو چکی ہو گی۔ ویسے بھی اگلے مہینے ایک بیوپاری نئے بچے خریدنے کے لیے آنے والا ہے۔ اس کی شرط یہی ہے کہ بچے اپاہج ہوں۔ لوگ ایسے بچوں کو زیادہ بھیک دیتے ہیں۔'' خلیفہ نے تفصیل بتائی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں ایک بات کہنا چاہ رہی تھی خلیفہ جی۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''کیسی بات.....؟''

''اگر ہم اس لڑکی کو اپاہج بنانے کے بجائے اپنے رنگ میں رنگ لیں تو.....؟''

''احمقوں کی سی باتیں مت کرتا جاں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ عرصہ سے تیرے دماغ میں ہمدردی اور ترس کا کیڑا کلبلانے لگا ہے۔ مت بھول ہم خاندانی بھکاری ہیں۔ ہمارے دلوں میں قصائیوں کی سی سختی ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ہم بھوکے مر جائیں گے۔'' خلیفہ نے اس کی بات کاٹ کر غراتے ہوئے کہا تو تاجاں سہم کر خاموش ہو گئی اور دھیرے سے بولی۔

''لیکن میں یہ سب اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھ سکتی۔''

''کس نے کہا ہے تجھے کہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ۔ میں اسے طیفے کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ اس کام میں اُستاد ہے اور اپنے پاس دوادارو کا بھی انتظام رکھتا ہے۔ نہیں مرتی تیری یہ لاڈلی۔ تو سکون سے چائے بنا اور کچھ دیر تک دو پیالے طیفے کی جھونپڑی میں بھجوا دینا، اور ہاں چائے میں گڑ پرانے والا ڈالنا، اُس کا مزا ہی اور ہے۔ طیفا چائے پی کر خوش ہو جائے گا تو کام بھی تسلی بخش کرے گا۔''

اپنی بات مکمل کرتے ہی خلیفہ نے نگار کو چارپائی سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

طیفے کا خیمہ ذرا ہٹ کر تھا۔ اور اسے اپنی بستی میں ڈاکٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ خلیفہ بارش سے بننے والے کیچڑ کے دریا کو عبور کر کے منزل پر پہنچا تو دیو قامت طیفا بستر میں بیٹھا حقے کے کش لے رہا تھا۔

خلیفہ کو نئے شکار کے ہمراہ دیکھ کر اس کی گھنی داڑھی کے درمیان چھپے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''بسم اللہ..... خلیفہ سائیں! لگتا ہے تازہ تازہ ہاتھ مارا ہے صبح سویرے۔'' وہ مکاری سے ہنسا۔

کہاں آ کے رکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا
وہ تیرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر میری بات سن، اسے بھول جا، اسے بھول جا
میں تو گم تھا تیرے دھیان میں، تری آس میں تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی میرے کان میں، میرے ساتھ آ اسے بھول جا
کیوں اٹا ہوا ہے غبار میں، غم زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا تیرے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اسے بھول جا
یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سر آئینہ اسے بھول جا
جو بساطِ جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے میں پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بلا اسے بھول جا

شاعر: امجد اسلام امجد
انتخاب: ثمر فاطمہ گڑھا موڑ

''بس ایسا ہی سمجھو..... آج کل حالات زیادہ اچھے نہیں، سوچا فوراً اس کا آپریشن کروا لیا جائے۔''

''جو آپ کا حکم خلیفہ سائیں.....''

طیفا اپنی جگہ سے اُٹھ کر کونے میں پڑے صندوق کی جانب بڑھا اور پھر اس میں سے دواؤں کی چند شیشیاں اور ایک تیز دھار گنڈاسہ نکال لایا۔

''حکم کرو خلیفہ سائیں.....'' وہ اپنے آلات چھوٹے سے میز پر سجا کر نگار کو گھورتے ہوئے بولا۔

''فی الحال اس کا دائیاں پاؤں کاٹ دو۔ لیکن خیال رکھنا لڑکی کمزور ہے، کہیں مر ہی نہ جائے۔'' خلیفہ نے خدشے کا اظہار کیا۔

''کیوں فکر کرتے ہو خلیفہ سائیں۔ بے شک طیفا پڑھا لکھا حکیم نہیں، مگر اس کے پاس اپنے باپ دادا کے وہ حیران کن جڑی بوٹیوں والے نسخے موجود ہیں کہ ہاتھ پاؤں کاٹتے ہی زخم سے بہنے والا خون برف کی طرح جم جاتا ہے۔ یہی نہیں، پندرہ بیس دن کے علاج سے ہی مریض اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے کسی بھی چوک میں

بھیک مانگنے کے لیے بیٹھا دیا جائے۔'' طیفے نے فخر سے جواب دیا۔

''مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے طیفے۔ میں تو بس لڑکی کی صحت دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ تم اپنا کام شروع کرو۔ وقت کم ہے ہمارے پاس۔''

خلیفہ نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ویسے بھی طیفے کے علاوہ قبیلے میں کوئی دوسرا قابل اعتماد آدمی نہیں تھا جو ان معاملات میں اس کی مدد کر سکتا۔

''جو حکم خلیفہ سائیں۔''

طیفے نے فرمانبرداری سے جواب دیا اور پھر ایک سیال محلول کے چند قطرے نگار کے منہ میں ٹپکا کر اسے لکڑی کے ایک تخت پر لٹا دیا۔ اب نگار کا سر خلیفہ کی گود میں اور ٹانگ لکڑی کے ایک بھاری بھرکم ٹکڑے پر تھی۔

''لڑکی کے جسم کو قابو رکھنا خلیفہ سائیں..... بے ہوشی کی دوا دے دی ہے، پھر بھی ٹانگ کٹنے پر اس کے جسم کو تیز جھٹکا لگے گا۔'' طیفے نے ہدایت کی۔

''بے فکر ہو جاؤ.....''

خلیفہ نے اسے تسلی دی اور نگار کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے جسم کے گرد اپنی گرفت کو مضبوط تر کر لیا تاکہ اس کی آواز خیمے سے باہر نہ جا سکے۔

تمام انتظامات مکمل ہوتے ہی طیفے نے ہاتھ بڑھا کر تیز دھار گنڈاسہ اُٹھایا اور آگے بڑھ کر نگار کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔

اس نے اعتماد کے ساتھ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے نگار کی ٹانگ کو ٹٹول کر ضرب لگانے کے لیے جگہ کا تعین کیا اور پھر اس کا گنڈاسے والا ہاتھ ہوا میں بلند ہونے لگا۔

اس لمحے وقت بالکل تھم سا گیا تھا، اور فضا اُس دردناک چیخ کے انتظار میں سہم گئی تھی جو معصوم نگار کے حلق سے برآمد ہونے والی تھی۔

☆-☆-☆-

نویرا کے قتل سے نا صرف اس اپنا کا گھر برباد ہو گیا تھا بلکہ اس کی ماں آسیہ بیگم نے بھی اپنی جواں سال بیٹی کی موت کا گہرا صدمہ لیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کاشف اور بہو عذرا کے ہمراہ رہتی تھیں۔ کاشف اور نویرا کے علاوہ آسیہ بیگم کی اور کوئی اُولاد نہیں تھی۔ ان کے شوہر کا کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔

آسیہ بیگم اسی غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ ان کی بیٹی نویرا اپنے شوہر تیمور برنی کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔ گو شادی سے قبل وہ اپنے کلاس فیلو شہزاد سے محبت کرتی تھی مگر والدین کے سمجھانے پر اس نے تیمور سے شادی کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

لیکن یہ تو کسی نے سوچا تک نہیں تھا کہ ایک دن پرانی شناسائیاں بھی نہ بھرنے والے گھاؤ لگا جائیں گی۔ پولیس کو یقین تھا کہ یہ قتل اس کے شوہر تیمور برنی نے کیا تھا۔ ائیر پورٹ ذرائع سے اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ تیمور برنی اسی رات شہر میں واپس لوٹا تھا۔ اس نے گھر آتے ہی یہ واردات کیوں کر ڈالی اس کا واحد ثبوت وہ ڈائری پیش کر رہی تھی جو موقع واردات سے ملی تھی۔

کمرے سے کچھ ایسے شواہد بھی ملے تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قتل کے وقت کوئی تیسرا شخص بھی وہاں موجود تھا۔ اس کیس کی دوسری گتھی جسے ابھی تک سلجھایا نہیں جا سکا تھا وہ ان کی کمسن بیٹی نگار تھی جو واردات کے بعد سے لاپتہ تھی۔ خیال یہی تھا کہ قاتل جاتے ہوئے نگار کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد آسیہ بیگم، نویرا کی دوسری بیٹی ارینا کو مستقل طور پر اپنے گھر لے آئی تھیں۔ ارینا بچیوں میں بڑی تھی اور کافی حد تک سمجھ دار تھی۔ ماں کی موت اور باپ، بہن کی پراسرار گمشدگی نے اس کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ رہی سہی کسر اس کی مُمانی عذرا بیگم نے پوری کر دی تھی۔ جو اُس کی اپنے گھر آمد پر قطعاً خوش نہیں تھیں۔

''مجھے تو پہلے ہی نویرا کے لچھن ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ جب بھی تیمور دوسرے شہر دورے پر جاتا تھا وہ بچیوں کو یہاں بھیج دیا کرتی تھی اور جواز ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ بچیاں نانی سے اداس ہو گئی ہیں۔ اب چاند چڑھا ہے تو سارا جگ تھوتھو کر رہا ہے ہم پر۔'' وہ غصے سے کڑھتے ہوئے بڑبڑائی تو کاشف نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے عذرا۔ میری بہن کو مرے چار دن نہیں گزرے اور تم نے غیروں جیسا انداز اپنا لیا۔ کم از کم تمہیں تو اس قسم کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

''میرے ہونٹ سی دینے سے آپ کی بہن کو دیوی کا درجہ نہیں مل جائے گا۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی دو بچیوں کی ماں اور پھر بھی آشنا کے ساتھ تعلقات..... توبہ، توبہ۔'' عذرا نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو کاشف اس کی بات سن کر بھڑک اُٹھا۔

''بند کرو یہ بکواس۔ شرم آنی چاہیے تمہیں یہ سب سوچتے ہوئے۔ خبردار اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔''

''تو..... تو کیا کرلیں گے آپ..... زبان نوچ لیں گے میری یا پھر گھر سے نکال دیں گے۔ یہی اُمید رکھتی ہوں میں اب آپ لوگوں سے۔ جانتے ہیں آپ، لوگ کیسی کیسی باتیں کررہے ہیں نوریا کے بارے میں۔ اب تو اُن کی گلی کے چوکیدار نے بھی پولیس کے سامنے بیان دے دیا ہے کہ اس نے اکثر تیمور برنی کی غیر موجودگی میں ایک شخص کو ان کے گھر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے ہمارے لیے، خود تو مرگئی ڈائن، جاتے جاتے یہ جونک چھوڑ گئی ہمارا خون چوسنے کے لیے۔ میں کہتی ہوں اگر تیمور غیرت والا ہوتا تو چھوٹی بیٹی کے ساتھ ساتھ بڑی بیٹی کو بھی مار کر کسی کنویں میں پھینک دیتا۔ منحوس انسان خود تو بیوی کو قتل کر کے فرار ہوگیا اور عمر بھر کی مصیبت ہمارے گلے میں ڈال دی۔ میں پوچھتی ہوں کیا سوچا ہے آپ نے اریبا کے بارے میں، آخر کون پالے گا اُسے.....؟'' عذرا کا تو جیسے خون کھول رہا تھا۔

''نوریا کے بچے اسی گھر میں رہیں گے۔'' کاشف نے تمہید کو نظر انداز کر کے مختصر جواب دیا۔

''کب تک.....؟''

''جب تک میں زندہ ہوں۔''

''لو جی! اور سنو..... شرطیں بھی وہ باندھ رہے ہیں کہ میں اپنی بیوگی کے لیے دُعا بھی نہ کرسکوں۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ایسی بات مت کہو بیٹی..... خدا سے صرف رحمت مانگو۔''

اسی لمحے آسیہ بیگم پرنم آنکھوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ تو عذرا نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہوگئی۔

''میں تمہارے سامنے ہوں۔ تم اریبا کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتی ہو مجھ سے کہو۔ اب اس کی ماں، باپ اور سرپرست صرف میں ہوں۔''

''امی جان میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اب کیا مستقبل ہے نوریا کی بچیوں کا۔ ددھیال میں کوئی ہے نہیں اور کاشف کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کی محدود آمدن میں تو خود ہمارا گزارا مشکل سے ہوتا ہے، اریبا کا بوجھ ہم کیسے اُٹھا پائیں گے، پھر سچی بات یہ ہے کہ ہماری اپنی بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ کل جب اُس کے رشتے کی بات چلے گی تو لوگ طرح طرح کے سوال کریں گے ہم سے نوریا اور اس کی بیٹی کے بارے۔ ممکن ہے یہ سوچ کر مسترد بھی کرنے لگیں ہماری بیٹی کو کہ پھوپھی کے کرتوت ایسے تھے تو بھتیجی جانے کیسی ہوگی۔''

''تم بالکل بے فکر رہو عذرا..... میں اریبا کے ساتھ گھر کے اُوپر والے پورشن میں شفٹ ہوجاؤں گی۔ اس کا راستہ بھی الگ ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم لوگوں کو ہماری موجودگی کا احساس تک نہیں ہونے پائے گا۔ باقی رہا کاشف کی محدود آمدن کا مسئلہ تو اس بارے بھی تم بے فکر ہو جاؤ۔ میاں صاحب کی پنشن اور ایک دکان سے آنے والا کرایہ ہماری گزر بسر کے لیے کافی رہے گا۔'' آسیہ بیگم نے تحمل سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن کب تک چلے گا یہ سب کچھ.....؟'' عذرا ان کی بات سن کر سخت لہجے میں بولی۔

''جب تک تیمور برنی واپس نہیں آجاتا۔'' آسیہ بیگم نے گہری سانس لی۔

''وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اب..... اس نے ایک قتل کیا ہے اور قاتل کبھی سولی پر جھولنے کے لیے واپس نہیں آیا کرتے۔''

''وہ ضرور آئے گا اور میری نگار کو بھی واپس لے کر آئے گا..... بلکہ آج میں تم دونوں کے سامنے اسے اپنی بیٹی کا خون معاف کرتی ہوں۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ تیمور، نوریا کو ٹوٹ کر چاہتا تھا اور کوئی بھی محبت کرنے والا اپنے محبوب کو صرف اسی وقت قتل کرتا جب اس کے اعتماد کا خون ہو۔''

یہ کہتے ہوئے آسیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تو کاشف نے جلدی سے آگے بڑھ کر انھیں دلاسہ دیا اور اُن کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

''میں نوریا کا بڑا بھائی ہوں امی جان۔ آج اگر وہ

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو بھی ہمارے دکھ درد سانجھے ہیں۔ اس کی بیٹی کی پرورش آپ سے زیادہ میری ذمہ داری ہے۔ اس لیے آپ کہیں نہیں جائیں گی اور ہمارے ساتھ ہی رہیں گی..... ہاں اگر کسی اور کو اس کڑے وقت میں ہمارا ساتھ نہیں دینا اور وہ ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے تو میں اسے قطعاً نہیں روکوں گا۔''

کاشف نے عذرا کے تیور دیکھ کر سخت لہجے میں فیصلہ سنایا تو وہ بجائے کچھ بولنے کے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ لیکن وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ارینا کو کسی صورت اس گھر میں قدم نہیں جمانے دے گی۔

-☆-☆-☆-

تیمور برنی کی آنکھ کھلی تو وہ خوب صورت خواب گاہ میں نرم و گداز بستر پر موجود تھا۔

ہوش آنے کے بعد وہ دیر تک خالی نظروں سے کمرے کی منقش چھت کو گھورتا رہا۔ پھر اس کا سویا ہوا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا اور ماضی کے واقعات فلم کی طرح ذہن کے تاریک پردے پر منظر بدلنے لگے۔

اس کا اپنے گھر میں داخل ہونا، تانیہ کا قتل، اجنبی شخص شہزاد کا فرار، اور پھر نگار کے ساتھ گھر سے نکل پڑنا، یہ تمام واقعات ذہن میں تازہ ہوتے ہی اس کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہوگئی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ جس وقت وہ گاڑی سے ٹکرایا اُسے نگار کی تلاش تھی۔

اپنی کمسن بیٹی کا خیال آتے ہی وہ بستر سے اُتر آیا اور ڈگمگاتے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ یکدم چکرا کر رہ گیا، اس سے قبل کہ وہ زمین پر گرتا بیڈ کا سہارا لے کر دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ عین اُسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر خاتون اندر داخل ہوتے ہی اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

''ارے.....! آپ کو ہوش آگیا.....؟''

''ہاں! اور میں یہاں سے فوراً چلے جانا چاہتا ہوں۔'' وہ اپنا سر تھامتے ہوئے بولا۔

''ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام سے بستر پر لیٹ جائیں۔ آپ کے سر پر گہری چوٹ آئی ہے۔'' آنے والی خاتون شاید کوئی نرس تھی۔ وہ تیمور برنی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر چیک کرنے لگی اور پھر سہارا دے کر واپس بستر پر لٹا دیا۔

''میں کہاں ہوں اور کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں؟'' اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ دو دن بعد گہری نیند سے جاگے ہیں۔ درمیان میں آپ کو ایک دو مرتبہ ہوش آیا تھا مگر ذہنی کیفیت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ چناں چہ ڈاکٹر نے آپ کو سکون کا انجکشن لگا دیا۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' نرس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کافی بہتر..... مگر آپ نے بتایا نہیں کہ میں کہاں ہوں؟'' تیمور برنی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شاید وہ اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''مجھے اس سوال کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ آرام کریں میں باس کو آپ کے ہوش میں آنے کی اطلاع پہنچا دیتی ہوں۔'' نرس نے ٹکا سا جواب دیا۔

''اوکے۔''

تیمور برنی نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا اور آنکھیں موند کر گہری سانسیں لینے لگا۔ نرس نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہی تیزی سے دوا انجکشن تیار کر کے اس کی رگوں میں اُتارے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد تیمور برنی ایک مرتبہ پھر گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ اسے زیادہ فکر نگار کے بارے تھی۔ وہ خود کو نوریا کے قتل سے زیادہ نگار کی گمشدگی کے معاملے میں قصوروار محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ دوبارہ کھلا تو تیمور برنی نے چونک کر اُس جانب دیکھنے لگا۔ چند لمحے خالی نظروں سے سامنے کھڑے اُدھیڑ عمر شخص کو گھورنے کے بعد وہ ہڑبڑا کر بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

''یزدانی صاحب آپ؟''

''تھینک گاڈ تمہیں ہوش آگیا۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔''

''بہتر ہوں..... مگر آپ..... اور میں یہاں کیسے پہنچا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔'' یزدانی کو سامنے پا کر تیمور برنی کو شدید حیرت ہو رہی تھی۔

وہ کسی دور میں سیٹھ یزدانی کی فرم میں منیجر کے طور پر

کام کرتا رہا تھا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یزدانی بہت سے غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے تو اس نے جرائم میں اس کا ساتھ دینے کی بجائے ملازمت چھوڑ کر نئی جگہ کام شروع کر دیا تھا۔ تیمور کے یوں ملازمت چھوڑنے پر یزدانی نے اسے واپس لانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کیونکہ تیمور نے اپنی محنت اور ایمانداری سے اس کی نظروں میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ اس بات کو یزدانی خود بھی تسلیم کرتا تھا کہ اس کے اسٹاف میں تیمور برنی سے بڑھ کر قابل آدمی اور کوئی نہیں ہے۔

''اُس رات تم میری ہی گاڑی سے ٹکرائے تھے۔ سچی بات ہے میں خود بھی اس وقت نشے میں تھا۔ پھر بھی تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیا اور ساتھ موجود ایک دوست کی مدد سے کار میں ڈال کر یہاں لے آیا۔ تمہاری حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ جس انداز میں تم میری گاڑی سے ٹکرائے تھے ان حالات میں بنا حقیقت جانے تمہیں ہسپتال لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ڈاکٹر کو گھر بلوا کر تمہارا علاج شروع کروا دیا۔ تمہاری بے ہوشی کے دوران مجھے بہت حد تک اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے تمہارے گھر کے حالات معلوم کروانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ تم اپنی بیوی کا قتل کر کے فرار ہوئے ہو۔'' یزدانی نے سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے تفصیل سنائی۔

''جی ہاں ایسا ہی ہے، اور میں اسی وقت اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔'' تیمور برنی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

''احمق مت بنو۔ پولیس تمہارے تعاقب میں ہے۔ انہیں ریوالور پر موجود فنگر پرنٹس سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ قتل تم نے کیا ہے، باقی ائیر پورٹ سے بھی تمہارے شہر میں واپس آنے کی تصدیق ہو چکی ہے۔''

''اور میرے بچے.....؟''

''تمہاری بڑی بیٹی اپنی نانی کے پاس ہے۔'' یزدانی نے نرمی سے کہا۔

''کیا میں ان سے بھی نہیں مل سکتا؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال یہ ممکن نہیں۔ پولیس تمہارے خاندان کے ہر

naeyufaq.com
تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
تیری زلف کے سر ہونے تک
خاندانی اختلاف کے پس منظر میں لکھا گیا اقراء صغیر احمد کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ دیگا
اکائی
عشنا کوثر شردار کا ایک لازوال ناول جس کا ہر لفظ انمٹ نقوش چھوڑ دیگا
عشق دی ماری میں جھلی
صائمہ قریشی کی دلکش و دل موہ لینے والی تحریر غم و خوشی سے آراستہ ایک ناقابل فراموش کہانی
Info@naeyufaq.com
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (03008264242)

فرد سے تفتیش کر رہی ہے۔ ایسے میں اگر تم نے ان سے رابطہ کیا تو دھر لیے جاؤ گے۔ ویسے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا؟ جبکہ مجھے یاد ہے کہ تم تو اس کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔'' یزدانی نے ہمدردی سے پوچھا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی بہت تعریف کیا کرتا تھا اس کی۔ لیکن اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب انسان کسی کی منافقت کو خلوص سمجھ بیٹھے تو اس کی تعریف کرتا نہیں تھکتا۔'' تیمور برنی کے لہجے میں کرب تھا۔

''کیا جرم کیا تھا اس نے.....؟'' یزدانی نے چند لمحے توقف کے بعد سوال کیا۔

''مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ مگر افسوس کہ وہ دلربا جسے میں بہت خاص سمجھتا تھا ایک عام سی عورت ثابت ہوئی..... اتنی عام کہ اس نے محبت کو میری کمزور سمجھ لیا اور اپنی اداؤں کو ہتھیار تصور کرنے لگی۔ جبکہ میں اسی غلط فہمی میں ذلت کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا کہ مجھ سا خوش نصیب شاید ہی روئے زمین پر کوئی دوسرا ہو، جس کے لیے چاند زمین پر اُتر آیا ہو۔''

''بس کافی ہے، میں سمجھ گیا..... کون تھا وہ شخص۔'' یزدانی کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

''اس کا پرانا عاشق..... اس سے بڑا کرب کیا ہو سکتا ہے انسان کے لیے کہ اس کی بیوی کسی غیر کی بانہوں میں دکھائی دے۔ ایک ایسا رشتہ جو بنتا ہی اعتماد اور محبت کی بنیاد پر ہو، اگر منافقت کی بھینٹ چڑھ جائے تو انسان کے لیے زندہ رہنے کا جواز نہیں بچتا۔'' تیمور برنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے تیمور..... ایک بات یاد رکھو کہ عورت اگر بے وفائی پر اُتر آئے تو مرد کے وقار اور اس کی محبت کو برباد کر ڈالتی ہے۔ بے وفا عورت اُس دیمک کی سی ہوتی ہے جو بظاہر شفاف اور چمکدار دکھائی دینے والی لکڑی کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے کمزور کر ڈالتی ہے۔'' یزدانی نے اسے دلاسہ دیا۔

''جو کچھ ہو چکا میں اپنے کیے پر نادم ہوں اور اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے مجھے اپنی بیٹی نگار کو تلاش کرنا ہے جسے میں اپنے شک کی بھینٹ چڑھا بیٹھا ہوں۔'' تیمور برنی نے بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ پولیس تمہارے تعاقب میں ہے۔ میرے کارندے تمہارے گھر والوں پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تمہاری بیٹی اپنی نانی کے گھر محفوظ ہاتھوں میں ہے؟'' یزدانی نے اُسے سمجھانا چاہا۔

''تو پھر آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟''

''تمہیں اپنے غم کو کمزوری نہیں طاقت بنانا ہوگا۔ اس کمزور لمحے کوئی بھی جذباتی فیصلہ تمہاری زندگی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ تمہارا واپس جانا کسی صورت دانش مندی نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔'' یزدانی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' تیمور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ ملک سے باہر چلو۔'' یزدانی نے مشورہ دیا۔

''میں آپ کے لیے کوئی نئی مصیبت نہیں بننا چاہتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر میں اپنے مسائل پر نظر دوڑاؤں تو تمہیں اپنا سب سے چھوٹا مسئلہ تصور کرتا ہوں۔ تمہیں ایک نئے عزم سے آگے بڑھنا ہوگا۔ مصیبتیں آتی ہیں تو انسان کو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور جب وہ ان مصیبتوں سے بچاؤ کے لیے جدوجہد کا آغاز کرتا ہے تو اسے زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اس وقت مجھے کسی قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں تمہارا مل جانا میرے لیے کسی غیبی مدد سے کم نہیں۔''

یزدانی کے لہجے میں یہ تاثر واضح محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ آج بھی تیمور پر بھروسہ کرتا تھا۔

''کیا آپ مستقل طور پر ملک سے باہر جا رہے ہیں؟'' تیمور برنی نے سوال کیا۔

''ہاں..... یہاں رہتے ہوئے میرے ستارے آج کل مسلسل گردش میں ہیں۔ تمہاری طرح میں بھی یہاں پولیس کو مطلوب ہوں۔ میرے بہت سے غیر قانونی دھندے قانون کی نظروں میں آ چکے ہیں۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ اب میرا نام ایئر پورٹ ایگزٹ لسٹ میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔'' یزدانی نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''ان حالات میں جب کہ آپ خود مشکل میں گرفتار ہیں تو مجھ جیسا مجرم آپ کی کیا مدد کرسکتا ہے۔'' تیمور برنی نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سوچنا میرا کام ہے۔ اگر ہم اس ملک سے نکل گئے تو ایک نئی زندگی کو اپنا منتظر پائیں گے۔''

''اور ہم باہر جائیں گے کیسے.....؟'' تیمور برنی نے پوچھا۔

''اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ صورت حال اچھی نہیں، اس لیے ہم اکٹھے یہاں سے باہر نہیں جائیں گے، پہلے تمہیں رباب کو لے کر سمندر کے راستے دبئی پہنچنا ہوگا۔'' یزدانی نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''کون رباب؟'' تیمور برنی چونکا۔

''میری دوسری بیوی۔'' یزدانی نے مختصر جواب دیا۔

''اور آپ.....؟''

''میں تم لوگوں سے وہیں ملوں گا۔ ہم سب کا ایک ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کیوں کہ اگر ہم سب پکڑے گئے تو بچانے والا کوئی نہیں رہے گا۔'' یزدانی اپنی ہی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

تیمور برنی اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ نویرا اس دنیا سے جا چکی تھی اور ارینا اپنی نانی کی سرپرستی میں تھی۔ یزدانی نے اسے یہ تسلی بھی دی تھی کہ وہاں منتقل ہونے کے بعد وہ اپنی بیٹی کو پاس بلا سکتا ہے۔

اس وقت اگر کوئی پریشانی اندر ہی اندر تیمور برنی کو کھائے چلی جا رہی تھی تو وہ صرف نگار تھی۔ یزدانی نے اُسے یہ یقین دہانی بھی کروا دی تھی کہ اس کے کارندے بہت جلد نگار کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

چناں چہ تمام معاملات طے ہونے کے بعد انھوں نے کراچی جانے کا منصوبہ بنا لیا۔

رباب ان دنوں کراچی میں تھی۔ تیمور برنی نے یزدانی سے ابھی تک اس کی بیوی کے بارے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ البتہ یزدانی نے اسے اپنے طور پر یہ ضرور بتا دیا تھا کہ اس نے رباب سے تین سال قبل خفیہ شادی کی تھی اور اب اس کی خواہش ہے کہ رباب بھی اس کے ساتھ ہی ملک سے باہر چلی جائے۔ یزدانی کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے یزدانی اب واپسی کا کوئی در کھلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جلد ہی تمام تیاری مکمل ہو گئیں اور پھر ایک رات تیمور برنی اور یزدانی ایک سرکاری گاڑی میں کراچی روانہ ہو گئے۔

اس سہولت کے لیے یزدانی نے اپنے ایک بااثر سیاستدان دوست کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس گاڑی کے استعمال کا مقصد راستے میں آنے والے بے شمار پولیس ناکوں سے بخیریت گزر جانا تھا۔ چناں چہ طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ دونوں بغیر کسی مشکل کا سامنا کیے اپنی منزل پر موجود تھے۔

کراچی میں یزدانی کے ساتھیوں نے ان کی رہائش کا خفیہ انتظام کیا ہوا تھا۔ اپنے پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر انھوں نے سارا دن پرسکون ماحول میں نیند کے مزے لوٹے اور پھر اسی شام یزدانی، رباب سے ملنے اور سفر کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے کے لیے گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ رات تیمور برنی نے اسی کوٹھی میں گزاری۔

اگلے روز ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تیمور برنی اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ ملازم نے اندر آ کر اُسے یزدانی کی واپسی کی اطلاع دی۔ خبر ملتے ہی تیمور برنی نے لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اُترتا ٹی وی لاؤنج میں جا پہنچا۔

لیکن جیسے ہی تیمور برنی کی نظر یزدانی کے ساتھ بیٹھی خاتون پر پڑی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

''رومانہ.....''

اس سے قبل کہ تیمور برنی کے ذہن میں گونجنے والا یہ نام اس کے لبوں پر آتا یزدانی کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''آؤ تیمور! ان سے ملو..... یہ ہے میری وائف بلکہ یوں سمجھو کہ میری پوری لائف..... رباب یزدانی۔''

یزدانی اپنی بیوی کی تعریف کیے چلا جا رہا تھا جب کہ تیمور برنی کے ذہن میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ہنومان

عثمان عبداللہ

زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں جن سے انسان خوف زدہ ہوجاتا ہے اور پھر وہ خوف انسان کو موت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ ان دونوں کو بھی خوف نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ مگر وہ دونوں ایک حصار کے قیدی بنتے جارہے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے سب کو دنگ کردیا تھا

ایک ایسے جوڑے کا حوال جس کی شادی ہوئی مگر حالات نے عجیب وغریب رخ اختیار کرلیا تھا

پنڈت مشرا داس کا تعلق پاکستان کے شہر لاہور سے تھا۔ جب پاکستان بننے اور ہندوستان کے دو ٹکڑے ہونے کا اعلان ہوا تو پنڈت مشرا نے بھارت کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہاں اب ان کی جان کو خطرہ تھا۔ بھارت میں جس بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اس سے پاکستان کے مسلمان ہندوؤں کے خلاف ہوگئے تھے اور بدلے کی آگ میں جلتے ہندوؤں کو نشانہ بنا رہے تھے گو کہ یہاں سے ہندوں پہلے ہی ہجرت کر گئے تھے پر چند میں پنڈت مشرا داس بھی شامل تھے انہیں اب اپنی جان کی فکر تھی اس لیے مختصر سے سامان کے ساتھ بھارت ہجرت کر کے دکن میں قیام کر گئے۔

مشرا داس کے ماتا پتا تو تھے نہیں اور چند ایک رشتے دار تھے جو پاکستان کے دیہاتوں میں رہائش پذیر تھے یا ہجرت کر کے بھارت آگئے تھے۔ مشرا داس نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ دکن کے ایک چھوٹے سے مندر میں بھجنگ گانا شروع کردیا تھا بھگوان کی دیا سے آواز اچھی تھی۔ اور پھر سر و تال کا بھی پتا تھا اسی لیے جلد ہی علاقے میں مشہور ہوگئے۔

راکھی ساونت کا گھرانہ خاصہ پرہیزی تھا ماس، مچھلی، گوشت سے وہ لوگ دور رہتے اور اس کا نام سننا بھی پاپ سمجھتے تھے ان کے لیے اس کے علاوہ بھی بھگوان کے دیے رزق میں بہت کچھ تھا۔ بھگوان کا نام ان کے یہاں چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چھ گھنٹے نہیں لیا جاتا تھا کیونکہ اس دوران وہ صرف آرام کرتے یا گھر کے دوسرے کام کرتے تھے۔ راکھی ساونت کے گھر والوں کو پنڈت مشرا داس پسند آئے تو انہوں نے لگن کی بات چلائی اور یوں چند مہینوں میں پنڈت مشرا داس کی شادی راکھی ساونت سے ہوگئی۔ زندگی جیسے خوش گوار سی ہوگئی تھی ہر محرومی جیسے ختم ہوگئی تھی اور اس خوشی میں اضافہ کرنے جلد ہی ایک مہمان کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔

پنڈت رام داس شروع سے ہی باپ کے ساتھ رہا تھا گو کہ پانچویں تک پنڈت مشرا داس نے رام داس کو اسکول بھی پڑھایا لیکن اس کے بعد اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور اس کو پوجا پاٹ سکھانے لگا تھا۔ دنیا کی اونچ نیچ سے اس کو اتنی ہی آگاہی دی جتنی ضرورت سمجھی تھی اس لیے وہ ایک طرح سے بے وقوف تھا یا عام زبان میں الو کا پٹھا جو کوئی بھی اس کو کچھ کہتا اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا تھا اور اس پر عمل بھی کرتا تھا جوانی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس کی یہ عادت پختہ ہوگئی تھی۔ جبکہ پنڈت مشرا داس نے اب اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

☆☆

پنڈت رام داس کی شادی کی عمر ہوگئی تھی اور اس کے لیے لڑکیاں دیکھنے کا کام شروع ہوگیا تھا۔ اس کی ماں راکھی مشرا ہر لڑکی میں عیب نکال کر انکار کردیتی۔ گو کہ پنڈت رام داس بہت خوب صورت نہیں تھا اور نہ ہی اسے دوسرے پنڈتوں کی طرح اچھے بھجنگ آتے تھے۔ اس کی آواز بھی عام سی تھی اور بے سری تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود

پنڈت رام داس کی ماں کو اس کے لیے لڑکی خوب صورت اور گھڑ چاہیے تھی۔ جو ہر کام میں طاق ہو اور ایک نظر میں ہی دل میں اتر جائے اور پنڈت رام داس کے دل کو بھانے کے ساتھ گھر کو بھی طریقے سے سنبھالے۔ پر ان کے معیار پر کوئی بھی لڑکی پوری نہیں اتر رہی تھی اور یہ ہی بات ان کی پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی۔

انہوں نے اپنے ملنے جلنے والوں سے بھی کہہ رکھا تھا اور خود بھی تلاش کر رہی تھی۔ پر ناکامی انہیں مسلسل منہ چڑا رہی تھی پر یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتیں یا پھر اچھے وقت کا انتظار کرتیں۔ پنڈت سے مہرت نکلوا کر ہی وہ یہ سب کر رہی تھیں۔

پنڈت رام داس کو جب سے ماں کے ارادے معلوم ہوئے تھے وہ پریشان ہو گیا تھا اور کچھ شرارتی دوست اسے آنے والے وقت سے خوفزدہ کر رہے تھے۔ لڑکی ذات کی ایسی تصویر کھینچتے کہ ان کے دانتوں تلے پسینہ آجاتا۔ آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ جاتی اور وہ پہلو بدل کر رہ جاتے کیونکہ ماں کو روکنا تو دور کی بات ان سے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے بھی وہ گھبراتے تھے کیونکہ راکھی مشرا اپنی بات کہنے کی عادی تھیں اور کسی کی وہ سننا پسند نہیں کرتی تھیں حتیٰ کہ وہ اپنے پتی مشرا داس کی بات بھی نہیں سنتی تھیں۔ پنڈت رام داس کے لیے یہ گھڑی پریشانی کی تھی اس لیے وہ پوری لگن سے پوجا کرنے لگا اور شدت سے پرارتنا کرتا کہ ماں کو کبھی وہ لڑکی نہ ملے جس سے اس کا لگن ہونا ہے۔ شاید یہ اس کی پرارتنا کا ہی نتیجہ تھا جو اس کی ماں کو ابھی تک وہ لڑکی مل نہیں رہی تھی۔

''ہاتھی مارنا آسان ہے پر پہلی رات عورت کو مارنا مشکل۔'' شرارتی دوستوں نے پنڈت رام داس کو گھیرا ہوا تھا اور چہرے پر بظاہر سنجیدگی لیے آنکھوں میں شرارت لیے کہہ رہے تھے اور پنڈت رام داس سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''اگر پہلی رات عورت کو نہ مارا تو پھر وہ تجھے مارے گی کبھی چپل سے تو کبھی چھری سے اور جانتا ہے کبھی تو پہلی رات ہی جان سے مار دیتی ہے۔'' اس کے دوست نے بہت راز داری سے پنڈت رام داس کے کانوں میں ایک خوف اتارا تھا جو دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

''موت تو آنی جانی ہے یار پر کیا اس خوف میں ساری زندگی شادی نہیں کرے گا اپنا یار۔'' ایک دوست نے پنڈت رام داس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''لوہا اگر گرم ہونا تو وار خوب پڑتا ہے اور عورت ساری

زندگی غلام بن کر رہتی ہے بس یہ ایک طریقہ ہے۔'' پہلے دوست نے دوسرے دوست کو آنکھ مارتے کہا تھا۔

''اور لوہے کو آگ میں تاپنا ضرور پڑتا ہے بس تم یہ سمجھنا کہ تمہارے سامنے آگ ہے۔'' دوسرے دوست نے رازداری سے کہا تھا۔

''اب یہ تم پر ہے کہ تم خود جلتے ہو یا آگ کو ٹھنڈا کرتے ہو۔'' دونوں دوست قہقہہ لگا رہے تھے اور دونوں ہی پنڈت رام داس کو سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کی آسان باتیں پنڈت رام داس کو مشکل لگی تھی جب ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور وہ الجھ گیا تھا۔ اور اسی الجھن میں وہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی ماں کو بھی سمجھا نہیں سکتا تھا اس لیے رات دیر تک مندر میں رہتا تھا اور بھگوان کے سامنے جھکا اپنی پریشانی روتا تھا۔

.....☆☆.....

بالآخر تھوڑا وقت گزرا راکھی مشرا مایوس ہو کر گھر بیٹھ گئی پر اسے اپنے بیٹے کی شادی نہ ہونے کا دکھ اور فکر بھی تھی جو اسے کسی پل چین لینے نہیں دے رہی تھی۔ جن لوگوں سے بیٹے کی شادی کی بات کی تھی انہوں نے بھی مایوس لوٹا دیا تھا۔ اب کوئی آسرا ہی نہیں رہا تھا۔ جہاں وہ جاتی اور بیٹے کی شادی کی بات چلاتیں۔ انہوں نے دوبارہ مخورت نکلوایا تو جو بات سامنے آئی وہ ان کے لیے پریشان کن تھی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے..... رام داس شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ پنڈت کی بات سن کر ہی سکتے میں آ گئی فوراً رام داس کو بلا بھیجا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ہم تمہارے لیے لڑکیاں دیکھتے پھیر رہے ہیں۔''

''جی ماں۔'' وہ سر جھکائے بولا۔

''کوئی لڑکی تمہاری نظر میں ہے تو بتاؤ۔'' وہ بغور رام داس کو دیکھتے بولیں۔ پنڈت رام داس پہلو بدل کر رہ گیا۔

''نہیں۔''

''پھر شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے۔'' بہت جتاتا ہوا لہجہ تھا۔ پنڈت رام داس گھبرا گیا۔ اب ماں سب جان گئی تھیں تو ان کو اپنی پریشانی کیسے بتاتے۔

''بس ابھی نہیں کرنی شادی۔''

''کیوں؟'' راکھی مشرا نے غصہ سے پوچھا۔

''تمہارے باپ کی شادی بھی اسی عمر میں ہوئی تھی اور تمہاری بھی ہو جانی چاہیے میں اس میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اٹل لہجے میں کہتی رخ پھیر گئی اس کا مطلب تھا کہ تم جاسکتے ہو، پنڈت رام داس خاموشی سے انہیں ایک نظر دیکھ کر چلا گیا۔ اب اس کے روز و شب مندر میں گزرنے لگے تھے۔ وہ گھر بھی بہت کم آتا تھا اور کسی سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ بھگوان کے سامنے بیٹھا وہ من کی ہر بات بہت آرام سے کہہ دیا کرتا تھا۔ اسے یہاں شانتی ملتی تھی ایسی شانتی جو اس کو ہر بات سے بے خبر کر دیتی تھی۔

یہ گرمیوں کے دن تھے جب اسے خبر ملی کہ اس کی ماں بہت بیمار ہے۔ وہ مندر سے نکل کر گھر آیا تو ماں کو بستر پر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ کتنے عرصہ بعد ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا اسے یاد تھا تو ماں کا چہرہ جس کا ہر نقوش تنا رہتا تھا اور اب بیماری کے باعث تنی ہوئی چیز ڈھلی پڑ گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ماں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ راکھی مشرا نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

''میں آ گیا ہوں ماں، جو تو کہے گی ویسا ہی کروں گا۔'' اس نے جلدی سے کہا تھا اور مرتی ماں کو جیسے نیا جیون ملا تھا۔

''سچ۔'' وہ مسکرا کر بولیں تو اس نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیتے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''ہاں سچ۔'' اس کے لیے ماں کی خوشی سب سے اہم تھی۔ ایسے میں غم اور خوف کہیں چھپ گئے تھے بس اس وقت سب منظر پر حاوی ماں تھی اور وہ یہاں بے بس ہو گیا تھا۔

.....☆☆.....

آناً فاناً پنڈت رام داس کے لیے لڑکی دیکھی گئی اور شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ سب کچھ بہت جلدی ہوا تھا اور اس سب میں پنڈت رام داس مندر نہیں جا سکا تھا۔ وہ ایک طرح سے گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا یا پھر آنے والے وقت نے اسے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ کسی سے بھی نظر نہیں ملا رہا تھا۔

شادی میں شرکت کے لیے آئے مہمان اسے دیکھ کر چھیڑ خانی کر رہے تھے اور وہ خوف کی وجہ سے مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بھگوان بھی ماں کے ساتھ مل گیا ہے اور اس کی ساری مجبوری کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔ اس نے

کتنے ناریل چھڑائے تھے اور کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے اپنی شادی نہ ہونے کے لیے پر وہ سب غارت گیا تھا اور اب اس کی شادی ہونے جارہی تھی۔ اور اب تو وہ رات بھی قریب تھی جس کا بھیانک نقشہ اس کے دوستوں نے کھینچا تھا۔ وہ بے انتہا خوفزدہ تھا۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا تھا۔

لگن والی رات اس کے دوستوں نے گھس کر اسے کمرے سے نکالا تھا اور زبردستی تیار کر کے اسے منڈپ تک لائے تھے پھیرے پڑھوائے گئے منگل ستر پہنایا گیا ہار پہنایا اور اس کے علاوہ بہت سی رسم ہوئیں پر اسے کسی میں بھی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے پہلو میں بیٹھی دلہن کو دیکھا تھا۔ چہرے پر ہی بے زاریت طاری تھی۔ جسے دوستوں نے دیکھ کر بہت لطف اٹھایا اور طرح طرح کے فقرے کسے تھے پر پنڈت رام داس کو پروا کہاں تھی اسے پروا تھی تو صرف اپنی اور اپنی جان کی۔ دلہن رخصت ہو کر گھر آ گئی اور کمرے میں تنہا رہ گئی جبکہ پنڈت رام داس کو کمرے کے باہر ہی دوستوں نے روک لیا اور اپنے مفید مشورے دینے لگے کس طرح دلہن پر حاوی ہونا ہے کب گھونگھٹ اٹھانا ہے اور کب بستر پر لیٹانا ہے۔ دوستوں نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کردیا تھا پر پنڈت رام داس حواس میں کب رہا تھا۔

''ہماری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا، ایسا نہ ہو کہ ہماری ناک ہی کٹوا دے پنڈت۔'' اس کے ایک دوست نے کہا تھا جبکہ اس نے صرف سر ہلایا تھا۔ خوف بری طرح اس پر طاری تھا اور اسی خوف کے ساتھ دوستوں کی باتیں سنتا وہ کمرے میں آ گیا تھا جہاں دلہن اس کا انتظار کررہی تھی اور خاموشی ہی خاموشی تھی اور اس خاموشی میں ہر چیز بیدار ہوتی ہے۔ پر پنڈت رام داس کا صرف خوف بیدار تھا اور باقی تمام خواہش سوگئی تھی۔ وہ سست روی سے چلتا مسہری تک آیا تھا اور دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے اپنا ناڑا کھولنے لگا۔

دلہن نے چونک کر اسے دیکھا تو رام داس کے ہاتھ سے پاجامہ چھوٹ گیا۔ اب کہاں کا پنڈت اور کہاں کے مشورے دلہن کی ایک مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ پنڈت رام داس کو لگا جیسے وہ اس پر حاوی ہونا چاہتی ہو اور اپنی فتح پر مسکرائی ہو۔ طیش میں پنڈت رام داس دلہن کو مارنے لگا اور وہ اپنا بچاؤ کرنے لگی اور اسی بچاؤ پر رام داس کو دھکا پڑا تھا اور اس کا سر مسہری کے پائے سے ٹکرایا تھا جس کے باعث وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ دلہن نے پہلے اپنا حلیہ درست کیا اس کے بعد بستر پر پڑ کر سوگئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو رام داس کمرے کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ دلہن رادھا کو رات ہونے والی لڑائی یاد آئی تو وہ نظر چرا کر جلدی سے واش روم میں چلی گئی اسے پنڈت رام داس سے خوف آرہا تھا۔ وہ یہ بھی کہ شاید وہ اسے مارنا چاہتا ہے یا پھر اس سے فوراً سب کچھ چھیننا چاہتا ہے پر وہ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی پتا نہیں لوگ کیا سمجھتے اور میکہ تک بات جاتی تو اور بدنامی ہوتی یہ ہی سوچ کر اس نے پنڈت رام داس سے بات کرنے کی ٹھانی تاکہ جو بھی بات ہو وہ کھل کر سامنے آئے اب وہ اس کی بیوی تھی اس کی ملکیت جسے وہ جیسے چاہے استعمال کرسکتا تھا پر اس کے کچھ طریقہ بھی تو تھے منہ اٹھا کر اب ہر کوئی تو گھر میں گھسنے سے رہا۔ ادب آداب بھی کوئی معنی رکھتے ہیں۔ ایسے کیسے وہ اپنا سب کچھ کسی اور کے حوالے کردیتی یہ ہی سوچ کر وہ رات کا انتظار کرنے لگی تھی۔

رات ہوتے ہی جب پنڈت رام داس کمرے میں آیا تو پھر وہ خوف کے زیر اثر تھا۔ رادھا نے بھی موقع دیکھ کر اس سے کچھ کہنا چاہا تھا پر پنڈت رام داس نے کچھ سنے بغیر ہی ایک بار پھر ناڑا کھول کر اس کو پیٹنا شروع کردیا تھا اور وہ اپنا بچاؤ کرنے لگی تھی۔ نتیجتاً وہی ہوا جو کل ہوا تھا اور اس کے بے ہوش ہوتے ہی رادھا سوگئی تھی۔ یہ اب روز کا معمول بن گیا تھا کبھی وہ اس کو پیٹتا اور کبھی موقع سے فائدہ اٹھا کر رادھا ہی اس کو ایسی ضرب لگا دیتی کہ لڑنے کی نوبت ہی نہ آتی اور وہ سکون سے سوجاتی تھی۔ اس لڑنے اور بچنے میں کافی دن گزر گئے تھے اور اب وہ دن آ گیا جب ساس شک کی نظر سے بہو کو دیکھتی ہے۔

.....☆☆.....

راکھی مشرا کو دیر ہونے پر تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ خود بھی شادی کے تیسرے مہینے ہی امید سے ہوگئی تھی پر یہاں تو دن گزرتے ہی جارہے تھے اور رادھا کی طرف سے کوئی اچھی خبر نہیں آرہی تھی۔ معاملہ کیا تھا وہ اس کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام تھیں۔ دلہن نے سب کچھ ٹھیک ہے کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی پر پنڈت رام داس خاموش

نظریں بچا کر گزر جاتا تھا اور سارا دن کہاں کی خاک چھانتا تھا اس بات سے وہ بے خبر تھیں۔ دوست یار تو خود اس کا پتا کرنے گھر آتے تھے جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ ان سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایسے میں اس کی کیا مصروفیات تھیں کن لوگوں سے ملنا جلنا تھا اس کا انہیں معلوم نہیں تھا۔ رادھا سے پوچھتی تو وہ بھی لاعلمی کا اظہار کرتی تھی۔ انہیں اب کسی کل چین نہیں تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں پنڈت رام داس بھی ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا جس سے وہ کھل کر بات کرتیں اور اس خواہش کا اظہار کرتیں۔

''رام داس ہم کو تم سے بات کرنی ہے۔'' اس دن پنڈت صبح سویرے ہی گھر سے نکلنے لگا تو راکھی مشرا نے دروازے پر ہی اسے روک لیا۔ وہ اپنی جگہ ٹھہر گیا پر ان کی طرف دیکھا نہیں انداز ایسا تھا کہ جلدی کہیں دیر ہو رہی ہے۔

''رام داس ہم تمہاری طرف سے آبادی میں اضافہ کے منتظر ہیں یہ خوشخبری ہم کو جلد از جلد سناؤ۔'' وہ پلٹ گئی تھیں اور رام داس وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ اب وہ ماں سے کیا کہتا کہ وہ تو کوشش کرنا چاہتا ہے پر بیوی ہی تعاون نہیں کرتی۔ اب اسے کون بتاتا کہ ناڑا کھول کر بیوی کو تشدد کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ میاں بیوی کو تو زندگی کے ہر معاملے میں ایک دوسرے کا تعاون درکار ہوتا ہے جب ہی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ ورنہ زندگی مشکل ہو جاتی ہے اور یہ بات رام داس نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے اندر تو صرف عورت کا خوف تھا اور پھر پنڈت تھا ہر برائی سے دور اس لیے بھی بہت سی باتوں سے ناواقف تھا دوستوں نے بھی بجائے مدد کرنے کے اسے ڈرا دیا تھا۔

رام داس نے رات میں رادھا سے بات کی تو وہ بہت ہنسی اس کے پاس ہنسنے کے علاوہ کچھ تھا بھی نہیں۔ اتنے عرصے کا غبار اس کی ہنسی میں ہی نکلا۔ رام داس تلملا گیا اس نے غصہ میں آ کر رادھا کو مارنا شروع کر دیا اور اس بار رادھا نے خاموشی سے مار کھائی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی قسمت میں صرف مار کھانا ہی لکھا ہے اگر وہ پنڈت سے کچھ کہے گی تو بری بنے گی اس لیے چپ رہی اور اس چپ نے ہی اس کا نقصان کر دیا تھا۔ پنڈت رام داس کا ہاتھ کھل گیا۔ اب وہ رات کا انتظار نہیں کرتا تھا جب بھی موقع ملتا اسے مارتا تھا اور بہت مارتا تھا غالباً وہ اپنے اندر کے خوف کو کم کر رہا تھا جو کسی صورت کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

رادھا سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ وہ پہلے ہی اسے آرام سے سب سمجھا دیتی پر وہ ہنس دی تھی۔ اس کا بھی تو کوئی نہیں تھا جس سے وہ دکھ کہتی اور اپنا غم ہلکا کرتی۔ ماں باپ پہلے ہی مر گئے تھے چچا نے سر سے بوجھ سمجھ کر اتار پھینکا تھا کہ شادی کے بعد کی زندگی کے حوالے سے وہ زیادہ نہیں جانتی تھی پر اس کی سہیلیوں نے اسے تھوڑی بہت آگاہی دے رکھی تھی۔ پر یہاں تو سب کچھ الٹا تھا اور اس سب میں وہ بلا وجہ پس رہی تھی۔

پنڈت رام داس کا غصہ اب بڑھنے لگا تھا وہ گنوار عورتوں کی طرح اسے طعنے بھی دینے لگا تھا کہ وہ بانجھ ہے اولاد پیدا نہیں کر سکتی بدچلن ہے نیچ ذات کی ہے جس سے بھگوان بھی خوش نہیں ہے اور یہ باتیں سن کر وہ تھک گئی تھی یا پھر فرار ڈھونڈ رہی تھی۔ جب ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مندر جائے گی پراتھنا کرے گی اس کی گود بھی بھر جائے۔

.....☆☆.....

اس نے سنا تھا کہ گھر کے پیچھے جو میدان ہے وہاں سے گزر کر ایک جنگل آتا ہے اس جنگل میں ایک ہنومان کا مندر ہے وہاں سب کی مراد پوری ہوتی ہے۔ جو مانگو مل جاتا ہے۔ رادھا نے بھی وہی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''ماں، میں مندر جا رہی ہوں'' ایک تھالی میں پرساد کی چیزیں لے کر وہ راکھی مشرا کو بتا کر گھر سے نکل آئی ابھی میدان میں ہی تھی کہ اسے جنگل سے جنگلی جانوروں کی آواز کے ساتھ مندر کی گھنٹیاں بھی سنائی دی تھیں۔ وہ تیز تیز چلنے لگی تھی کیونکہ اپنی مراد جلد از جلد پانا چاہتی تھی۔ دل میں جانوروں کا خوف بھی تھا پر وہ مضبوط ارادوں کے ساتھ چلتی بالآخر مندر میں پہنچ گئی تھی۔ پوجا کرنے کے بعد پرساد غریبوں میں دے کر وہ گھر لوٹ آئی تھی۔ پر جو سکون اس نے مندر میں محسوس کیا تھا وہ گھر میں نہیں تھا۔ اس نے بے چینی سے دن کاٹا تھا اور دوسرے دن پھر مندر چلی آئی تھی اس بار کچھ زیادہ وقت اس نے مندر میں گزارا تھا اور پھر یہ ہونے لگا کہ ہر روز مندر میں وقت بڑھنے لگا اور پوجا میں اس کا دل لگنے لگا۔ پوجا کرنے کے بعد بھی وہ مندر کے صحن میں بیٹھی رہتی اور اسے نیند آنے لگتی تو وہ گھر آ جاتی تھی۔

راکھی مشرا کا دباؤ پنڈت رام داس پر بڑھنے لگا تھا اسے

ہر حال میں اب پوتا چاہیے تھا وہ گھر میں بچے کی کلکاریاں سننا چاہتی تھیں۔ اسے چھاتی سے لگانا چاہتی تھیں پر وقت گزر رہا تھا اور ان کی خواہش ادھوری تھی۔

''رام داس۔'' راکھی مشرا نے اسے باہر جاتے دیکھا تو پکار لیا وہ رک گیا۔

''کچھ کہا تھا تم نے۔''

''جی۔'' وہ سمجھا نہیں۔

''بچہ چاہیے۔'' وہ غصہ سے بولیں وہ خاموش رہا۔

''نہیں دے سکتے تو بتا دو ہم تمہاری دوسری شادی کر دیں گے۔'' رادھا کو دیکھ کر وہ بولی تھیں اور رادھا کو اس کی دوسری شادی سے کیا فرق پڑنا تھا جو وہ تڑپتی ہاں یہ گھر ضرور چھین جاتا دو وقت کی روٹی کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں خوف آ گیا تھا۔ پنڈت رام داس گھر سے نکل گیا تو رادھا بھی مندر جانے کا کہہ کر گھر سے نکل گئی۔ پر آج مندر جانے کا دل نہیں تھا۔ کتنے دن سے ناریل چڑھا رہی تھی۔ غریبوں میں پرشاد بانٹ رہی تھی پھر بھی ابھی تک خالی ہاتھ تھی۔ بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ پھر اٹھ کر وہ ناچنے لگی تھی شاید اسی طرح ہی بھگوان خوش ہو کر اس کی مراد پوری کر دیتا۔ وہ تھکنے لگی پر ناچتی رہی یہاں تک کہ پسینے سے اس کے کپڑے اس کے جسم سے چپک گئے بال کھل گئے دوپٹا زمین پر آ گرا کتنی بار اپنا ہی ہاتھ اس کے اپنے ہی منہ پر پڑا پر وہ ناچتی رہی اور آخر کار وہ بھکرا کر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اس کی قمیص پیٹ پر سے اٹھ کر سینہ پر آ گئی اور اس کی شلوار اس کی ران سے چپک گئی۔ اس وقت مندر میں صرف رادھا موجود تھی یا پھر بھگوان۔

.....☆☆.....

اسے ہوش آیا تو اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا لیکن ایک عجیب سا احساس اسے ہوا تھا جیسے کچھ ہوا تھا اس کے ساتھ کچھ ایسا جس کا احساس اسے بے ہوشی میں بھی ہوا تھا۔ ایک انوکھا احساس وہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ پر کیا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر آ گئی اور اپنے کمرے میں آ کر مسہری پر لیٹ کر اس حوالے سے سوچنے لگی کہ آخر کیا ہوا تھا جو اسے یہ احساس بخش رہا تھا۔ اس کے مکمل ہونے کی یقین دہانی کرا رہا تھا۔ وہ یہ ہی سوچتی ہوئی سو گئی۔ اٹھی تو پنڈت رام داس کو کمرے میں دیکھ کر اسے ایک لمحے کو خوف آیا پھر سر جھٹک کر اس کے کام کرنے لگی۔ وہ بھی زیادہ دیر گھر نہیں رکا تھا۔ وہ چلا گیا تو وہ ساس کے پاس آ گئی پر وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ جبکہ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے لیکن اسے لیٹتے دیکھ کر وہ الٹے پاؤں واپس کمرے میں آ گئی تھی۔ اور اب یہ روز ہونے لگا تھا کہ وہ مندر جاتی بھگوان کی پوجا کرتی اور اس کے سامنے ناچنے لگتی تھی اور ناچتے ناچتے بے ہوش ہو جاتی اور اس کے بعد ہوش آتا تو وہ کمزوری محسوس کرتی دنیا گول گول گھومتی محسوس ہوتی تھی اور اس حالت میں وہ تقریباً خود کو گھسٹتی گھر آتی تھی۔ پھر ابھی مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کے دروازے پر خوشی چلی آئی تھی۔

وہ امید سے تھی اور ساس کے ساتھ پنڈت رام داس بھی بہت خوش تھا ہر طرح سے اس کا خیال رکھا جا رہا تھا اور اس کی اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا تھا کیا بھگوان کو اس پر رحم آ گیا تھا جو ایک دم سے یہ خوشی اسے مل گئی تھی یہ سب کچھ اس کے لیے اچھا تھا پر وہ خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ نجانے کیوں ہر گزرتی گھڑی اسے مزید خوف میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس کو لگتا کہ یہ سب وقتی ہے پنڈت رام داس کی خوشی محض ڈھونگ ہے وہ اسے پھر سے مارے گا اور اب کے جان سے ہی مار دے گا یہ باتیں اسے خوفزدہ کر رہی تھیں۔ پر وہ وقت نہیں آیا بلکہ اس کی جگہ وہ وقت آ گیا جب وہ اذیت سے گزرتی ایک بچے کی ماں بنی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھی آنکھیں بھی اس سے ٹھیک سے کھولی نہیں جا رہی تھیں۔ درد بڑھتا جا رہا تھا جب اس کی سماعت میں آواز آئی تھی۔

''ارے یہ بچہ تو ہنومان دیوتا کی شکل ہے اس کے گھر تو بھگوان جی آئے ہیں۔'' نجانے کون کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ ساتھ ہی اسے ہنومان مندر میں اپنے بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر یاد آیا تھا جب اس کی آنکھ ادھ کھلی تھی ایک بندر اس کے قریب آ رہا تھا اس نے خوف سے بچہ کی طرف دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ بندر جیسا تھا اور پھر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھی۔

(قسط نمبر2)

بساط گر

وحید سلطان

ایک طاقت ور بااثر جاگیردارنی کی روداد، وہ اپنے شوہر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے قاتل کی منکوحہ بن گئی

دنیا کے مسترد کردہ جاگیردارانہ معاشرے کی ایک جھلک جو اب بھی ہمارے خطے میں اپنی تمام تر توانائیوں اور برائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ جہاں زمین کو ماں کا درجہ دے کر معصوم انسانوں کا خون بہا کر اسے سیراب کیا جاتا ہے۔ جہاں گھوڑی کی چوری کو بیٹی کے اغوا کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔

ایک لڑکی کی محبت میں مبتلا دو دوستوں کی سازشی لڑائی کا ایک دلچسپ احوال۔ سمجھوتے کے تحت شادی کرنے والے جوڑے کی نفرت اور محبت کی کہانی۔ شوہر کی موت کا دشمن سے بدلا لینے کا انوکھا طریقہ اختیار کرنے والی بیوی کی داستان، محبت کرنے والوں کی کہانی دشمن ان کے پیچھے موت کی طرح تعاقب میں تھے۔ دو ایسے بااثر افراد کا قصہ خاص جو مزاج میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔

دلچسپ کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص ہر لحہ رنگ بدلتی ایکنا قابل فراموش کہانی

ایس ایچ او منیر ملک ہشام کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ وہ وارڈ روم کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اسپتال کے ایک کوریڈور میں ایس ایچ او منیر اور ملک ہشام کی ملاقات ہوگئی۔ ایس ایچ او منیر نے سلام دعا کے بعد ملک ہشام کی طبعیت دریافت کی۔

''مجھے گولی چھو کر گزر گئی تھی جبکہ میری بیگم کو دو گولیاں لگیں' گولیاں آپریشن کے ذریعے نکالی گئی تھیں' ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ چند ماہ تک چل نہیں سکیں گی۔'' ملک ہشام نے ایس ایچ او منیر کو بتایا۔

''آپ کے فارم ہاؤس پر ہونے والے حملے کی تحقیقات انسپکٹر کامران کرے گا' ہم بہت جلد حملہ آور کا سراغ لگالیں گے۔'' ایس ایچ او منیر نے کہا۔

''مجھے مہرو اور شہرناز بھی چاہیے۔'' ملک ہشام نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''میں دو چار دنوں میں ان دونوں کو آپ کے قدموں میں لے آؤں گا۔''

''اگلے بہتر گھنٹوں میں حملہ آور نہ ملا تو اپنا ٹرانسفر پکا سمجھو۔'' ملک ہشام نے دھمکی خیز لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا جبکہ ایس ایچ او منیر اسے ناگوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

ملک ہشام جیپ کی عقبی سیٹ پر سوار ہوا جبکہ بخشو فرنٹ سیٹ پر سوار ہوگیا۔

''کیا مہرو کا تعاقب جاری ہے؟'' ملک ہشام نے بخشو سے پوچھا۔

''اس کا تعاقب اسد کر رہا ہے' تازہ ترین اطلاع کے مطابق مہرو ابھی تک اکیلا ہے اور وہ دوسرے شہر پہنچ چکا ہے۔'' بخشو نے ملک ہشام کو بتایا۔

''بخشو! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے گاؤں کے اردگرد چھے دیہات ہیں اور ان دیہات میں مجھے طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن کسی نے مہرو کو مہرہ بنا کر میری طاقت کو للکارا ہے۔'' ملک ہشام نے فرنٹ سیٹ کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''دیہات چھے ہوں یا سات' ملک ہشام! تمہیں

پورے علاقے میں طاقت کی نہیں بلکہ ظلم اور دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔'' بخشو نے ملک ہشام کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوچا۔

''ملک صاحب! مہرو آپ کے گھر سے ایک لڑکی کو اغواء کر کے لے گیا یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔'' بخشو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''بخشو! میرے فارم ہاؤس میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا' حملے کی وجہ سے میرا اثر ورسوخ کم ہو گیا ہے اور.....'' ملک ہشام نے جملہ ادھورا چھوڑا تو بخشو نے گردن موڑ کر ملک ہشام کو تجسس نگاہوں سے دیکھا۔

''بخشو! حملے کے ذمہ دار تم ہو' تمہاری غفلت کی وجہ سے حملہ ہوا تھا۔'' ملک ہشام نے کرخت مگر دھیمے لہجے میں کہا تو بخشو نے جب محسوس کیا کہ ملک ہشام اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس نے بات چیت کا موضوع ہی بدل دیا۔

''ملک صاحب! عدالت نے نوٹس بھیجا ہے۔ اس مہینے کی انیس تاریخ کو آپ کو اور ناہید بیگم کو طلب کیا ہے۔'' بخشو نے کہا۔

''عدالت نے ہم دونوں کو کیوں طلب کیا ہے؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

''مہرالنساء نے ناہید بیگم اور آپ کے خلاف ہتک عزت کا دعوی دائر کیا ہے' مہرالنساء کے خیال میں ناہید بیگم نے آپ کے ساتھ نکاح کر کے زرشاد چوہدری کے خاندان کی عزت و ناموس کو نقصان پہنچایا ہے۔'' بخشو نے عدالتی نوٹس کے بارے میں تفصیلات سے ملک ہشام کو آگاہ کیا۔

''مہرالنساء نے مقدمہ دائر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فارم ہاؤس پر حملے کے پیچھے وہ ہے اور مہرو کو میرے خلاف استعمال کرنے والی بھی وہ ہی ہے۔'' ملک ہشام نے حیران ہوتے ہوئے سوچا۔

''ملک ہشام! ہوشیار ہو جا' مہرالنساء تمہارے خلاف بساط پھیلا رہی ہے' وہ تمہارا اثر ورسوخ کم کرنے اور تمہیں کمزور کرنے کے لیے چالیں چل رہی ہے۔'' ملک ہشام خود سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑبڑایا اور پھر سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

❖❖❖❖

مہرالنساء ایڈووکیٹ حمیرا کے آفس میں بیٹھی تھی۔ وہ چائے پی رہی تھی اور بار بار مشرف کا فون نمبر ڈائل کر رہی تھی لیکن وہ ہر بار اس کا فون کاٹ رہا تھا جبکہ ایڈووکیٹ حمیرا کسی فائل کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

''یہ مشرف کو کون سا سانپ سونگھ گیا ہے' وہ میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہا۔'' مہرالنساء نے فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ادیبہ میری بہترین دوست ہے' آپ اس سے ملاقات کروا دو اور اسے بتانا کہ اس کے پاس میں نے آپ کو بھیجا ہے تو وہ آپ کی ہر ممکن مدد کرے گی۔'' ایڈووکیٹ حمیرا نے مہرالنساء سے کہا اور ایک پرچی پر ادیبہ کا فون نمبر لکھ کر پرچی مہرالنساء کی طرف بڑھا دی۔ مہرالنساء نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے ایڈووکیٹ حمیرا کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے چلی گئی۔

''اب مجھے مشرف کے آفس جانا ہے۔'' کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مہرالنساء نے گل خان سے کہا تو اس نے سر ہلایا اور کار چلا دی۔ چند منٹوں بعد کار مشرف کے آفس کے سامنے رکی۔ مہرالنساء کار سے اتری اور آفس کی طرف بڑھ گئی۔ آفس کے باہر ایک گارڈ کھڑا تھا۔

''بی بی! آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' گارڈ نے سنجیدگی سے کہا تو مہرالنساء کے تیور بدل گئے۔ اس نے گارڈ کو دھکا دیا اور غصے سے تن فن کرتی آفس میں چلی گئی۔ مشرف کے سامنے میز پر شوربے کا پیالہ پڑا تھا اور وہ آلو والا نان کھا رہا تھا۔ مہرالنساء نے شوربے کا پیالہ دیوار پر پٹخ دیا تو مشرف کا قہقہہ چھوٹ گیا جبکہ مہرالنساء اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''جب میں تمہارے گاؤں گیا تھا اور تم سے ملاقات کرنا چاہتا تھا' تم نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اب معلوم ہوا کہ جب کوئی دوست بے اعتنائی اور ناروا سلوک کرے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔'' مشرف نے مسکراتے ہوئے کہا تو مہرالنساء نے گہری سانس لی اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''گاؤں کے ماحول اور شہر کے ماحول میں بہت فرق ہے' گاؤں میں اگر کوئی لڑکی کسی اجنبی کو ملاقات کے لیے گھر

بلائے تو ایسی لڑکی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔'' مہرالنساء نے کہا تو مشرف کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''مطلب میں کوئی اجنبی ہوں۔'' مشرف نے حیران ہوتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''ویسے اب میں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے اور سٹی میں شفٹ ہوگئی ہوں' آج شام تمہیں ضیافت کے لیے مدعو کرنا چاہتی ہوں۔'' مہرالنساء نے نہایت ہی شائستگی سے کہا تو مشرف نے اسے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ لمحہ بھر میں مہرالنساء کا لہجہ اور رویہ کیوں بدل گیا۔

''میرا خیال ہے اب کی بار تمہیں مجھ سے کوئی بڑا مطلب ہے۔'' مشرف نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں کنسٹرکشن کا بزنس شروع کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے' جو لوگ میرے پاپا کے دشمن تھے اور جو ان سے حسد کرتے تھے ان کو بتانا چاہتی ہوں کہ چوہدری زرشاد ابھی زندہ ہے۔'' مہرالنساء بات تو مشرف سے کر رہی تھی لیکن اس کا دماغ تصورات کی دنیا میں تھا۔

''کنسٹرکشن کا کاروبار بہت مشکل کام ہے' ایک ناتجربہ کار لڑکی تو الجھ کر رہ جائے گی۔'' مشرف نے طنزیہ لہجے میں کہا تو مہرالنساء کرسی پر بیٹھ گئی اور آنکھیں سکیڑ کر مشرف کو دیکھنے لگی۔

''مجھے ناتجربہ کار مت سمجھو' میرے پاپا اپنے بزنس کی ساری باتیں مجھ سے شیئر کیا کرتے تھے اور میں اس بزنس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں میری مدد کیوں درکار ہے؟'' مشرف نے پوچھا۔

''اگر تم میری مدد نہیں کرنا چاہتے تو آج کی ضیافت کینسل سمجھو۔'' مہرالنساء نے غصے سے کہا اور کرسی سے اٹھ کر چلی گئی۔ مہرالنساء کے جانے کے بعد مشرف کا گارڈ نبیل آفس میں داخل ہوا۔

''گل خان سے تمہاری بات ہوئی؟'' مشرف نے نبیل سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''گل خان نے بتایا ہے کہ مہرالنساء ہاسٹل سے عبایا والی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لائی تھی اور اسے ایم کیو فلیٹ میں اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے' اسی لڑکی نے ملک ہشام پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔'' نبیل نے وہ ساری تفصیل مشرف کو بتا دی جو گل خان نے اسے بتائی تھی۔

''ایم کیو فلیٹ۔'' مشرف نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ایم سے مہرالنساء اور کیو سے قاسم۔'' مشرف نے دونوں کہنیاں میز پہ ٹکاتے ہوئے سوچا۔

''مہرالنساء نے ملک ہشام پر قاتلانہ حملہ کروایا اور اب ملک ہشام مہرالنساء پر جوابی حملہ کرے گا' کھیل تو بہت اچھا شروع ہوا ہے' اس کھیل کا بہت مزا آئے گا لیکن مہرالنساء کی جان کو خطرہ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' دونوں ہاتھوں کی شہادت والی انگلیاں ہونٹوں پر رکھے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

❖❖❖❖

مہرالنساء کی کار ایڈووکیٹ حمیرا کی دوست ادیبہ کی رہائشگاہ کے سامنے رکی۔ گل خان کار سے باہر نکلا اور کار کی دوسری جانب گیا۔ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تو مہرالنساء کار سے باہر آئی۔ گیٹ پر ایک ملازمہ نے خوش آمدید کہا۔ اب مہرالنساء اس ملازمہ کے ہمراہ پھولدار پودوں کی دو قطاروں کے درمیان راہداری سے گزرتے ہوئے ایک بڑے سے لاؤنج میں چلی گئی۔ وہاں پر خود ادیبہ نے اسے خوش آمدید کہا اور ایک عالیشان صوفے پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور خود اس کے ساتھ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ کو کس معاملے میں میری مدد چاہیے؟'' رسمی گفتگو کے بعد ادیبہ نے پوچھا

''آپ بس ایس پی شکیل صاحب سے میری ملاقات کروا دیں تو آپ کی بے حد مشکور ہوں گی۔'' مہرالنساء نے گزارشانہ انداز میں کہا۔

''جی میں ابھی فون کر کے شکیل صاحب سے ملاقات کا ٹائم پوچھتی ہوں۔'' ادیبہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ادیبہ کے جانے کے بعد ملازمہ نے یہ کہتے ہوئے لسی کا بڑا سا گلاس مہرالنساء کو پیش کیا کہ ہم گاؤں سے آنے والے مہمان کی تواضع لسی سے کرتے ہیں۔

❖❖❖❖

''خیریت ہے آپ مجھے تلاش کر رہے تھے؟'' مہرو ایک ساؤنڈ پروف مفروشات سے پرمزین کمرے میں

داخل ہوا تو آفاقی صاحب نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بشارت نے آپ کے پاس بھیجا ہے' کام اور نوکری کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' مہرو نے آفاقی صاحب سے کہا۔

''مجھے ویسے بھی ایک آدمی کی ضرورت تھی۔'' آفاقی نے کہا

''کیسی ضرورت تھی؟'' مہرو نے پوچھا۔

''ماربل مارکیٹ اور اس کے اردگرد کے بازاروں میں میری جگہ تم کام سنبھالو گے۔'' آفاقی نے کہا۔

''مطلب بھتہ لینا ہے۔'' مہرو نے کہا۔

''ایسا نہ کہو' ہم بھتہ نہیں لیتے' بیروزگاروں کو روزگار دیتے ہیں اور بدلے میں وہ ہمیں ہمارا حصہ دیتے ہیں۔'' آفاقی نے کہا۔

''مجھے سوچنے دیں ذرا۔'' مہرو نے واپس مڑتے ہوئے کہا تو آفاقی نے اسے بازو سے پکڑ کر جانے سے روک لیا۔

''بات ابھی مکمل نہیں ہوئی' میں تمہیں شراکت داری کی پیشکش کرتا ہوں' کچھ عرصہ میں یہاں نہیں ہوں گا' تم جیسے معتبر شخص کی ضرورت ہے مجھے۔'' آفاقی نے کہا۔

''شراکت داری؟'' مہرو نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں..... شراکت داری..... وصول کردہ رقم کا بیس فیصد تم لو گے اور باقی مجھے دے دینا' راضی ہو؟'' آفاقی نے مہرو کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''راضی ہوں..... راضی ہوں آفاقی صاحب۔'' مہرو نے آفاقی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

❖❖❖❖

شام کے وقت ادیبہ مہرالنساء کو ایس پی شکیل کی رہائشگاہ پر لے گئی۔ ایس پی شکیل نے ادیبہ اور مہرالنساء کو خوش آمدید کہا تو ان دونوں نے ایس پی شکیل کا شکریہ ادا کیا۔

''اب مدعے پر بات کریں' میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' رسمی گفتگو کے بعد ایس پی شکیل نے مہرالنساء سے کہا تو مہرالنساء نے ادیبہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' ادیبہ میری دوست اور کزن ہے اسے سب راز رکھنے آتے ہیں۔'' ایس پی شکیل نے ادیبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ بات کرلو میں ذرا اپنی آنٹی سے ملاقات کرلوں۔'' ادیبہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا اور باری باری ایس پی شکیل اور مہرالنساء کی طرف دیکھا۔

''میں ملک ہشام کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں' ملک ہشام ایک ظالم شخص ہے' ہمارے علاقے کے بہت سے لوگ اس کے ظلم کا شکار بن چکے ہیں' لوگوں کی پراپرٹی اور زمینوں پر غاصبانہ قبضہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور اب وہ بلدیاتی الیکشن لڑنے کی تیاری کررہا ہے۔'' مہرالنساء نے ایس پی شکیل کو بتاتے ہوئے کہا۔

''اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' ایس پی شکیل نے پوچھا۔

''میں ملک ہشام کی طاقت کو ختم کرنا چاہتی ہوں' اس کے خلاف بساط بچھا رہی ہوں' جو لوگ اس کی طاقت کا ذریعہ ہیں انہیں میں ملک ہشام سے دور کرنا چاہتی ہوں' مسئلہ ایس ایچ او منیر ہے' وہ ملک ہشام کا دایاں بازو بنا ہوا ہے' اگر ممکن ہو تو آپ ایس ایچ او منیر کا تبادلہ کروا دیں۔'' مہرالنساء نے رطب اللسان بولتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے آپ محض لوگوں کو ملک ہشام کے ظلم سے بچانے کی خاطر تو یہ بساط نہیں بچھا رہی نا؟'' ایس پی شکیل نے پوچھا۔

''اصل میں ملک ہشام نے میری والدہ کے ساتھ نکاح کرلیا ہے اور اب وہ میرے بابا کی جائیداد اور پراپرٹی کا کچھ حصہ ہتھیانا چاہتا ہے اور اسی وجہ سے میں پریشان ہوں۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''میں پہلے ملک ہشام کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا پھر فیصلہ کروں گا کہ آپ کی مدد کرنی چاہیے یا نہیں۔'' ایس پی شکیل نے دوٹوک انداز میں کہا اور چلا گیا۔

''عجیب شخص ہے اس نے تو بالکل لحاظ نہیں رکھا' آخر میں اس کی کزن کی وساطت سے آئی ہوں اسے مدد کی ہامی بھرنی چاہیے تھی۔'' مہرالنساء نے سوچا تو ایس پی شکیل کے جانے کے بعد ادیبہ وہاں آئی۔

''آنٹی اصرار کررہی ہیں' اب اب ہمیں یہاں پر ڈنر

کرنا ہوگا۔'' ادیبہ نے مہرالنساء کو بتایا تو اس نے مشرف کا نمبر ڈائل کردیا۔

''مشرف! میں فلیٹ میں نہیں ہوں اس لیے آج ڈنر کا پروگرام کینسل سمجھو' میں کل تم سے ملاقات کرتی ہوں۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی مہرالنساء نے کہا اور کال منقطع کردی۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم اس وقت فلیٹ میں نہیں ہو۔'' مشرف نے سوچا اور فون جیب میں ڈال لیا۔

''نبیل! کچھ اسلحہ لے لو' ہم مہرالنساء کے ایم کیو فلیٹ جائیں گے۔'' مشرف نے کہا تو نبیل نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''مہرالنساء اپنے فلیٹ میں نہیں ہے اور یہی مناسب وقت ہے کہ ہم اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کریں جسے مہرالنساء نے اس فلیٹ میں رکھا تھا۔'' مشرف نے نبیل سے کہا۔

''اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟'' نبیل نے پوچھا۔

''مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ مہرالنساء کی ایک کمزوری میرے ہاتھ لگ جائے گی اور میں آسانی سے اسے ڈرا دھمکا سکوں گا۔'' مشرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

❖❖❖❖

کاشف کا فون پر مہرو سے رابطہ ہو چکا تھا۔ مہرو نے کاشف کو بتایا کہ شہزاد نامی ایک شخص پولیس کی گاڑی میں آئے گا اور شہرناز اور کاشف کو بحفاظت دوسرے شہر لے جائے گا۔ رات کے دو بجے شہزاد نامی شخص نے فون پر کاشف سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ انہیں شہر سے باہر لے جانے کے لیے تیار ہے۔ دو گھنٹوں کا سفر طے کرنے کے بعد کاشف اور شہرناز ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں پر ان کی مہرو سے ملاقات ہوئی۔ مہرو ان دونوں کو کرائے کے کسی فلیٹ میں لے گیا۔ یہ فلیٹ ایک روم' لاؤنج' کچن اور دو باتھ رومز پر مشتمل تھا۔ لاؤنج میں بیٹھ کر انہوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد شہرناز کمرے میں جا کر سو گئی جبکہ مہرو اور کاشف لاؤنج میں ہی صوفوں پر لیٹ گئے۔ چند منٹوں بعد مہرو نے کاشف کا جائزہ لیا اور تسلی کی کہ کاشف سو چکا ہے یا نہیں۔ کاشف واقعی سو چکا تھا۔ اب مہرو کمرے کے دروازے کی طرف گیا لیکن دروازہ اندر سے لاک تھا۔ مہرو دوبارہ واپس آ کر لیٹ گیا۔ وہ بار بار گھڑی پر ٹائم دیکھ رہا تھا۔ دو گھنٹوں بعد مہرو نے کاشف کو جگایا۔

''کاشف! میرے ساتھ آؤ' تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' مہرو نے کہا تو کاشف فوری طور پر اٹھ گیا۔ کاشف چہرہ دھو کر آیا تو مہرو نے اسے ایک چھوٹا ڈبہ تھما دیا۔ فلیٹ سے کچھ دور جانے کے بعد مہرو نے فون کان سے لگا لیا اور ایک تنگ سی گلی میں داخل ہونے کے بعد کاشف کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود فون پر بات کرتے ہوئے تنگ گلی سے نکل کر دور چلا گیا۔ کاشف اسی تنگ گلی میں کھڑا تھا اور مہرو کو دور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہاں تین پولیس اہلکار آ گئے اور انہوں نے کاشف کو گرفتار کرلیا۔

''سر! میرا قصور کیا ہے؟ مجھے کیوں گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں؟'' کاشف نے پوچھا۔

''تجھے پولیس اسٹیشن جا کر سب معلوم ہو جائے گا۔'' ایک پولیس اہلکار نے کاشف کے ہاتھ سے چھوٹا ڈبہ لیتے ہوئے کہا اور اسے پولیس وین میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پولیس اسٹیشن پہنچتے ہی کاشف کو ایس ایچ او کے سامنے پیش کیا گیا۔

''سر! اس لڑکے سے نشہ آور چیز برآمد ہوئی ہے۔'' ایک پولیس اہلکار نے ایس ایچ او سے کہا۔

''اسے لاک اپ میں بند کردو اس سے بعد میں تفتیش کریں گے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

''سر! میری بات تو سن لیں۔'' کاشف نے کہا۔

''اسے لے جاؤ' بعد میں اس کی بات سنیں گے۔'' ایس ایچ او نے غراتے ہوئے کہا تو دو پولیس اہلکار زبردستی کاشف کو وہاں سے لے گئے۔

''سر! یہ آفاقی صاحب نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔'' پولیس اہلکار نے والٹ ایس ایچ او کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

❖❖❖❖

مہرو فلیٹ میں واپس آ چکا تھا۔ وہ اب شہرناز کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔

''مجھے اپنے دوست کے ساتھ یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا' شہرناز! میں نے کاشف کو تمہاری خاطر جیل بھجوا دیا تاکہ تم میری ہو سکو۔'' مہرو نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ چند منٹوں بعد دروازہ کھلا تو

شہرناز آنکھیں مسلتے باہر آئی۔

''''کاشف کہاں ہے؟'' شہرناز نے مہرو سے پوچھا۔

''میں سو گیا تھا جب میری آنکھ کھلی تو کاشف یہاں نہیں تھا۔'' مہرو نے وضاحت دیتے ہوئے کہا تو شہرناز نے مشکوک نگاہوں سے مہرو کو دیکھا۔

''میں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا نمبر آف جا رہا ہے۔'' مہرو نے فون شہرناز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو شہرناز نے بار بار کاشف کا نمبر ڈائل کیا لیکن کاشف کا نمبر آف تھا۔ اب شہرناز مہرو کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم نے میرے کاشف کے ساتھ کیا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ..... کاشف کہاں ہے؟'' شہرناز گھگھیائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''شہرناز! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ کاشف کہاں گیا ہے؟'' وہ تنک کر بولا تو شہرناز کی آنکھوں سے نمکین پانی بہنے لگا اور مہرو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا بولے اور شہرناز کو کیسے تسلی دے۔

❖❖❖❖

مہرالنساء صبح ہوتے ہی مشرف کے آفس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مشرف کا انتظار کر رہی تھی۔ بالآخر مشرف کی کار آفس سے کچھ فاصلے پر رکی۔

''آج تو صبح صبح چڑیا ہمارے دروازے پر آ گئی۔'' کار سے اترتے ہی مشرف نے نبیل کے کان میں طنزیہ انداز میں سرگوشی کی۔

''صاحب! محتاط رہیے گا چڑیا آج غصے میں ہے۔'' نبیل نے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور پھر آفس کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مشرف اور مہرالنساء کے درمیان رسمی گفتگو ہوئی۔ مہرالنساء کا لہجہ غصیلہ اور تلخ تھا۔ آفس کا دروازہ کھلتے ہی مشرف اور مہرالنساء ایک ساتھ اندر چلے گئے۔

''میں نے کل رات ڈنر کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا تو پھر میری غیر موجودگی میں میرے فلیٹ میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔'' مہرالنساء غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔

''پہلے بیٹھو تو سہی۔'' مشرف نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''مجھے خبر ملی تھی کہ تم نے کسی لڑکی سے ملک ہشام پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا لیکن ملک ہشام زندہ بچ گیا' مجھے یہ بھی خبر ملی تھی کہ حملہ آور لڑکی ایم کیو فلیٹ میں ہے اور تمہاری غیر موجودگی میں میرا اس لڑکی سے ملنا بہت ضروری تھا۔'' مشرف نے کہا تو مہرالنساء نے اسے ناگوار نظروں سے دیکھا۔

''تمہیں یہ ساری خبریں کہاں سے ملیں اور بھلا تمہارا اس لڑکی سے ملنا کیوں ضروری تھا؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''مجھے ساری خبریں گل خان نے دی تھیں اور مجھے تمہاری کسی بڑی کمزوری کی تلاش تھی اور اجالا سے ملاقات کے بعد تمہاری بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھ لگ گئی اور اب میں تم سے اپنی محبت کا اظہار کروں تو تم مجھ سے ناراض نہیں ہو سکو گی اور مجھ سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم نہیں کرو گی۔'' مشرف نے رطب اللسان بولتے ہوئے کہا جبکہ مہرالنساء اب تک اسے ناگوار نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''آئی لو یو مہرالنساء۔'' مشرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں قاسم سے محبت کرتی ہوں اور تم کچھ بھی کر لو لیکن تم اس حقیقت کو نہیں بدل سکتے' تمہارا اور میرا رشتہ صرف دوستی تک محدود ہے۔'' مہرالنساء نے مشرف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اس بات پر مجبور نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے محبت کرو لیکن تمہارا نفرت آمیز رویہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا اور ملک ہشام کو بتا دوں گا کہ اس پر حملہ کس نے کروایا تھا۔'' مشرف نے دھمکی خیز لہجے میں کہا۔

''تم دوستی کے نام پر دھبہ ہو' تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گی کہ تم آئندہ کسی بھی دوست کو دھمکانے کے قابل نہ رہو گے۔'' مہرالنساء نے مشرف کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا جبکہ مشرف مہرالنساء کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''آج شام میں تمہارے فلیٹ میں تمہارے ساتھ ڈنر کروں گا۔'' مشرف نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو مہرالنساء اس کی بات کا جواب دیئے بنا ہی چلی گئی۔

اپنے فلیٹ میں پہنچتے ہی مہرالنساء نے سب سے پہلے گل خان کو نوکری سے فارغ کیا اور پھر اپنے روم میں گئی تو اجالا اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''ملک ہشام پر حملے کے بارے میں گل خان نے مشرف کو سب کچھ بتا دیا تھا اس لیے میں نے اسے نوکری سے فارغ کر دیا ہے۔'' مہرالنساء نے اجالا کو بتاتے ہوئے کہا۔

''مشرف جب یہاں میرے پاس آیا تھا تو اس نے مجھ سے چند باتیں ایسی بھی کی تھیں جن کے بارے میں گل خان کچھ نہیں جانتا۔'' اجالا نے مہرالنساء کو بتایا تو وہ حیران ہوگئی اور اجالا کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''جب مشرف کمرے میں آیا تو اس نے مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کیا اور مجھے بتایا کہ جب میں دارالامان میں تھی تو میرا نام عزیزہ تھا' وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ دارالامان سے مجھے آفاقی صاحب لائے تھے اور انہوں نے مجھے نیا نام دیا تھا۔'' اجالا نے مشرف سے ہوئی بات چیت کی ساری تفصیل مہرالنساء کو بتا دی۔ اجالا کی باتیں سن کر مہرالنساء چند لمحوں کے لیے حیرتوں کے سمندر میں جیسے ڈوب گئی ہو۔ مہرالنساء نے سر جھٹکا اور کسی گہری سوچ سے باہر آئی اور اجالا کی طرف دیکھا۔

''آفاقی کون ہے؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''بارہ سال کی عمر میں آفاقی صاحب مجھے دارالامان سے اپنے فلیٹ میں لائے تھے' مجھے پڑھنا لکھنا اور بہت سے ہنر سکھائے' آخر میں مارشل آرٹ اور اسلحہ چلانا سکھایا۔'' اجالا مہرالنساء کو بتا رہی تھی کہ مہرالنساء نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مطلب آفاقی صاحب پروفیشنل کلر تھے اور ان کی مہربانیوں سے تم بھی ایک کلر بن گئی۔'' مہرالنساء نے اجالا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اب آفاقی صاحب کہاں ہیں؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''اس شہر میں آفاقی صاحب کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی اور پولیس بھی ان کو تلاش کرنے لگی تھی اس لیے وہ روپوش ہوگئے۔'' اجالا نے کہا۔

''میں نے اپنے پاپا کی ڈائری سے اعجاز ٹونی کا پتہ نوٹ کیا تھا اور جب میں اس پتہ پر پہنچی تو وہاں اعجاز ٹونی کی بجائے تم سے ملاقات ہوگئی اور پھر تم سے ڈیل ہو گئی۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''اعجاز ٹونی آفاقی صاحب کا بہت اچھا دوست تھا' بدقسمتی سے وہ پولیس مقابلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔'' اجالا نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جانتی کہ مشرف کس نوعیت کا شخص ہے اس لیے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا' تمہارے لیے کرائے کے مکان کا بندوبست کر دیا ہے تم وہاں پر شفٹ ہو جاؤ اور جب بخشو کو تلاش کر لو تو مجھے اطلاع کر دینا۔'' مہرالنساء نے ایک پرچی اجالا کو دیتے ہوئے کہا۔

❖❖❖❖❖

بخشو نے ملک ہشام کو انسپکٹر کامران کی آمد کے بارے مطلع کیا تو ملک ہشام نے بخشو کو اشارہ کیا کہ اس کو اندر بلا لو۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے ملک ہشام کو سلام کیا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد حملے کی ابتدائی تحقیقات کے بارے میں ملک ہشام کو آگاہ کیا۔

''آپ کے مالی کے بیان کے مطابق حملہ آور ایک خاتون تھی جس نے عبایا پہن رکھا تھا' فارم ہاؤس کی شمالی دیوار میں پانچ بڑے سوراخ کیے گئے تھے اور انہی سوراخوں میں پاؤں رکھتے ہوئے قاتلہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی تھی' حملہ آور کا پستول باغیچے سے برآمد ہوا ہے لیکن پستول پر انگلیوں کے جو نشان پائے گئے ہیں نادرا نے ان کی تصدیق نہیں کی' نادرا کے ریکارڈ میں حملہ آور کے متعلق کوئی ڈیٹا موجود نہیں ہے۔'' انسپکٹر کامران نے تحقیقات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! حملہ آور کا سراغ لگاؤ گے تو تمہیں تمہاری سوچ سے زیادہ کیش ملے گا اور دوسری صورت میں تمہاری نوکری.....'' ملک ہشام نے دھمکی خیز لہجے میں کہا اور انسپکٹر کامران کو جانے کے لیے اشارہ کیا۔

''مغرور بوڑھا..... پولیس کو اپنا نوکر سمجھ رکھا ہے۔'' انسپکٹر کامران نے ملک ہشام کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر وہاں سے چلا گیا تو بخشو دوبارہ کمرے میں آیا۔

''ملک صاحب! مشرف نامی ایک نوجوان آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔'' بخشو نے کہا۔

''اسے اندر بھیج دو۔'' ملک ہشام نے کہا۔

بخشو کے جانے کے بعد مشرف اندر آیا اور ملک ہشام سے رسمی گفتگو کی تو ملک ہشام نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ملک صاحب! اخبار میں آپ کے فارم ہاؤس پر ہونے والے حملے بارے میں خبر دیکھی تو آپ کی بہت فکر ہوئی اور آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' مشرف نے کہا تو ملک ہشام کے چہرے پر جیسے ہوائیاں اڑنے لگی۔

''حملے کی خبر اخبار میں شائع ہوگئی؟ کس اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے؟'' ملک ہشام ہکلاتے ہوئے بولا۔

''پانچ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے اور اخبارات والوں نے تھانہ کوتوالی کو خبر کا ذریعہ قرار دیا ہے۔'' مشرف نے ملک ہشام کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ملک ہشام کے چہرے پر گھبراہٹ اور پشیمانی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

''امید ہے کہ حملے کے دوران کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا ہوگا؟'' مشرف نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا؟'' ملک ہشام نے مشرف کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ملک صاحب! میرا نام مشرف ہے اور میں پراپرٹی ڈیلر ہوں۔'' مشرف نے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

''مجھے کیسے جانتے ہو؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ کو شہر کا ہر پراپرٹی ڈیلر جانتا ہے' چند بڑے پراپرٹی ڈیلرز سے آپ کے بارے میں سن رکھا تھا' اخبار پر آپ کی تصویر دیکھی تو آپ سے ملاقات کا اشتیاق ہوا۔'' مشرف نے ملک ہشام کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مطلب تم پراپرٹی ڈیلر ہو۔'' ملک ہشام نے مشرف کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ملک صاحب! اسپتال سے بہرام صاحب کا فون آیا ہے' ناہید بیگم کو ہوش آگیا ہے۔'' بخشو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً کہا تو ملک ہشام بخشو کی طرف متوجہ ہوا۔

''تیاری کرو' ہم اسپتال جائیں گے۔'' ملک ہشام نے بخشو سے کہا اور پھر مشرف کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دے دو' میں تم سے رابطہ کر کے تمہارے آفس آؤں گا۔'' ملک ہشام نے مشرف سے کہا تو اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ملک ہشام کو دیا اور اس سے اجازت طلب کی۔

ملک ہشام سے ملاقات کے بعد مشرف اپنی رہائش گاہ پر پہنچا۔ خارجی دروازہ کھولنے کے بعد وہ بڑے کمرے سے گزر کر ایک چھوٹے کمرے میں گیا۔ چھوٹے کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر مشرف کے والد محترم آفتاب چوہدری اور والدہ رخشندہ بیگم کی تصویر آویزاں تھی جبکہ سائیڈ دیوار پر مہرالنساء کی دو تصویریں آویزاں تھیں۔ مشرف اپنے والد آفتاب کی تصویر کے روبرو کھڑا ہوگیا۔

''پیارے بابا جان! آپ نے جو مشن' جو کام ادھورا چھوڑا تھا وہ میں پورا کروں گا پھر چاہے اس کے لیے مجھے اپنی محبوبہ مہرالنساء کو قربان کرنا پڑے' میں مہرالنساء کو قربان کر سکتا ہوں لیکن آپ کا مشن ادھورا نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اس مشن سے بہت سے لوگوں کی بھلائی وابستہ ہے۔'' مشرف اپنے والد آفتاب صاحب کی تصویر کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا تو اسے جینز کی جیب میں فون کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جیب سے فون نکالا اور فون پر مختصر بات کرنے کے بعد اپنے آفس کے لیے روانہ ہوگیا۔ گل خان پہلے ہی مشرف کا منتظر تھا۔ مشرف نے آفس کے اندر آتے ہی گل خان سے مصافحہ کیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مہرالنساء نے مجھے نوکری سے فارغ کر دیا ہے۔'' گل خان نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''میرے پاس تمہارے لیے کام موجود ہے' میں تمہیں معقول تنخواہ دوں گا' اب تمہیں مہرالنساء کی نظروں میں آئے بغیر خفیہ طور پر اس کی نگرانی اور حفاظت کرنا ہوگی۔'' مشرف نے گل خان سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مہرالنساء اب سب سے پہلے جو کام کرے گی وہ اجالا کو کسی خفیہ جگہ پر منتقل کرے گی' تمہیں اجالا کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہوگا۔'' مشرف نے کہا تو گل خان نے اثبات میں سر ہلایا اور مشرف سے اجازت لے کر چلا گیا۔

''ملک ہشام پر پہلا وار کیسے کیا جائے' وار ایسا ہونا چاہیے کہ ملک ہشام پوری طرح الجھ جائے تاکہ اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکے کہ اس کا اصل دشمن کون ہے۔'' مشرف نے میز کے ساتھ ملحقہ دراز سے پستول نکالتے ہوئے سوچا۔

❖❖❖❖

آنچل کراچی

مارچ کا شمارہ ہوگیا شائع

سانسوں کے اس سفر میں — اُم ایمان قاضی کا سلسلے وار ناول

اکائی — عشنا کوثر سردار کا سلسلے وار ناول

عشقے دی ماری میں جھلی — صائمہ قریشی کا مکمل ناول

محبت فاتح عالم — اُم زویا کا مکمل ناول

اس کے علاوہ

صباء ایشل، کنزہ ظفر
اریشہ غزل کی خوب صورت تحریریں

مستقل سلسلوں میں پڑھیے

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

Naeyufaq.com

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں / (021-35620771/2)

Pakistanipoint.com

اجالا نئے کمرے میں شفٹ ہو چکی تھی۔ یہ کمرہ روٹ جیلی ہوٹل کے انڈر گراؤنڈ سیکشن میں تھا۔ اجالا کے اردگرد شیشے کی بہت سی بوتلیں پڑی تھیں۔ وہ ان بوتلوں میں پانی اور چونے کی برابر مقدار ڈال کر بوتلوں کے ڈھکن بند کر رہی تھی۔

''اجالا! یہ کیا کر رہی ہو؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی مہرالنساء نے پوچھا۔

''میں نے بہت سوچ بچار کی ہے لیکن میں ملک ہشام کے فارم ہاؤس کے علاوہ کسی دوسری جگہ کا انتخاب نہیں کر سکی' میں فارم ہاؤس سے بخشو کو اغواء کروں گی۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے ان بوتلوں میں چونا اور پانی مکس کر دیا ہے۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء نے آنکھیں سکیڑ کر تجسس انداز میں بوتلوں کی طرف دیکھا۔ اجالا تمام بوتلوں کے ڈھکن بند کر چکی تھی۔

''ملک ہشام نے فارم ہاؤس میں گارڈز کی تعداد بڑھا دی ہوگی۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''میں نے اپنے پرانے پارٹنر قدیر سے رابطہ کر لیا ہے' وہ ان بوتلوں کو فارم ہاؤس میں پھینکے گا تو یہ بوتلیں دھماکے کے ساتھ پھٹ جائیں گی اور کسی کو کچھ سمجھ نہیں لگے گی کہ ہو کیا رہا ہے اور اسی دوران میں گن پوائنٹ پر بخشو کو اغواء کر لوں گی۔'' اجالا نے اپنی ساری منصوبہ بندی مہرالنساء کو بتا دی۔

''او کے..... جب بخشو کو لے کر آؤ تو مجھے خبر کر دینا۔'' مہرالنساء نے کہا اور پھر واپسی کے لیے مڑی تو اجالا نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تو وہ رک گئی اور پلٹ کر اجالا کی طرف دیکھا۔

''مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں نے قاسم کو کہاں دیکھا تھا۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء دوبارہ اس کے پاس آئی۔

''مجھے جلدی بتاؤ کہ تم نے قاسم کو کہاں دیکھا تھا۔'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''جب میں آفاقی صاحب کے ساتھ رہتی تھی تب قاسم بھی آفاقی صاحب کے پاس آیا کرتا تھا اور پھر ایک دن اس نے آفاقی صاحب سے ملاقات کی اور قاسم نے کسی شخص کو قتل کروانے کے لیے آفاقی صاحب کو سپاری دی تھی۔'' اجالا نے مہرالنساء کو بتایا۔

''تمہیں اس شخص کا نام یاد ہے؟'' مہرالنساء نے متحیر لہجے میں پوچھا تو اجالا نے نفی میں سر ہلایا۔

''آفاقی کو مقتول کا نام پتہ سب یاد ہوگا؟'' مہرالنساء نے پوچھا تو اجالا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم آفاقی سے میری ملاقات کروا سکتی ہو؟'' مہرالنساء نے ایک اور سوال داغا۔

''میں آفاقی صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گی اور رابطہ ہوتے ہی آپ کی ملاقات کے بارے میں بات کروں گی۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

شہرناز نے پچھلے تیس گھنٹوں سے نہ کچھ کھایا اور نہ پیا تھا۔ وہ مہرو سے شدید ناراض تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مہرو نے کاشف کو اغواء کر کے کسی خفیہ جگہ پر قید کر دیا ہے۔ مہرو ہر طرح سے شہرناز کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کاشف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ بار بار شہرناز کو بتا رہا تھا کہ اس نے کاشف کے ساتھ کوئی سازش نہیں کی لیکن شہرناز کو یقین تھا کہ مہرو اس کا یکطرفہ عاشق ہے اور وہ کاشف سے حسد کرتا ہے۔ مہرو شہرناز کی بہت منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ ضد چھوڑ دے اور کھانا کھا لے لیکن اس بار شہرناز نے چاولوں کی پلیٹ مہرو کے چہرے پر پلٹ دی اور رونے لگی۔ شہرناز روتے روتے بے ہوش ہو گئی تو مہرو چند لمحے سوچ بچار کے بعد فلیٹ سے باہر آیا۔ اس نے وہ کار اسٹارٹ کی جو اسے آفاقی نے عارضی طور پر دی ہوئی تھی۔ اب وہ دوبارہ فلیٹ میں گیا اور شہرناز کو کلائیوں پر اٹھا کر لایا۔ اس نے شہرناز کو کار کی عقبی سیٹوں پر لٹایا اور دروازہ بند کرنے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہونے کے لیے مڑا تھا کہ کسی نے اس کے سر پر کوئی ٹھوس شے مار دی تھی۔ مہرو کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے فوراً اپنا پستول نکالا اور حملہ آور کی طرف پلٹا تو اس بار حملہ آور نے اس کی پیشانی پر وار کیا تو پیشانی سے خون بہنے لگا۔ اس نے حملہ آور پر فائر کیا اور جلدی سے کار میں سوار ہوا اور کار چلا دی۔ گولی لگنے کی وجہ سے حملہ آور کی ٹانگ زخمی ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بائیک کی طرف جا رہا تھا تو مہرو نے کار اس

سے ٹکرادی اور پھر تیزی سے کار کو بیک لے گیا۔ اب مہرو نے کار کا رخ روڈ کی طرف کیا۔ کار چلاتے ہوئے اس نے اپنا جائزہ لیا۔ اس کی شرٹ خون سے تر بتر تھی۔ مہرو نے مڑ کر عقبی سیٹ کی طرف دیکھا۔ شہرناز کار میں نہیں تھی۔ وہ شاکڈ ہو گیا اور اس نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ وہ ملے نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ واپس جا کر شہرناز کو تلاش کرے یا کسی کلینک یا اسپتال سے زخم پر مرہم پٹی کروائے۔ اسے فیصلہ تو خود ہی کرنا تھا چنانچہ وہ مرہم پٹی کروانے چلا گیا۔

❖❖❖❖

کاشف جیل کے اندر مغموم حالت میں بیٹھا تھا۔ ایک قیدی اس کے پاس آیا اور بیٹھ گیا۔

''میرا نام آصف ہے۔'' آنے والے قیدی نے اپنا تعارف کروایا تو کاشف نے بھی اسے اپنا نام بتا دیا۔

''تم کس سبب سے جیل میں آئے ہو؟'' آصف نے کاشف سے پوچھا۔

''میرے دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے کسی شخص سے ملوانا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ چل پڑا' اس نے مجھے ایسا باکس تھما دیا جس میں کوئی نشہ آور میٹریل تھا اور مجھے اس طرف بھیج دیا جس طرف سے پولیس اہلکار آ رہے تھے۔'' کاشف نے آصف کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں ایگل نامی نجی تنظیم کا رکن ہوں' ہماری تنظیم بھتہ مافیا کے خلاف کام کر رہی ہے' بھتہ مافیا کے کچھ کارندے مجھے قتل کرنا چاہتے تھے تو میں حفاظت کے پیش نظر یہاں جیل آ گیا تھا۔'' آصف نے اپنے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں آپ اور آپ کی تنظیم کافی بااثر ہے' اگر میں آپ کی تنظیم کے لیے کام کرنا چاہوں تو کیا مجھے جیل سے رہائی مل سکتی ہے؟'' کاشف نے پوچھا۔

''اگر آپ کے خلاف کوئی ایف آئی آر درج نہ ہوئی تو ہماری تنظیم آپ کو ضرور رہا کروا لے گی۔'' آصف نے کہا۔

''یہ کیسے معلوم ہو گا کہ میرے خلاف کوئی ایف آئی آر ہے یا نہیں؟'' کاشف نے پوچھا۔

''میں معلوم کروا لوں گا۔'' آصف نے کاشف سے کہا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام ناہید بیگم کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ ناہید سے اس کی طبعیت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا اور اسی دوران اس نے ناہید کے پرس سے تصویروں کے دو البم نکالے تو ناہید نے پریشان ہوتے ہوئے دونوں البمز کو دیکھا اور پھر ملک ہشام کی طرف دیکھا۔

''میری جان! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' یہ وہی البم ہیں جو آپ نے میری غیر موجودگی میں میری الماری سے نکال لیے تھے لیکن مجھے بالکل برا نہیں لگا۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کے چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا تو ناہید نے اسے کوفت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''فور وائیوز۔'' ملک ہشام نے تصویروں کے چھوٹے البم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس البم میں میری پہلی بیوی حلیمہ اور دوسری بیوی مقصودہ بیگم کی تصویریں ہیں۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کو بتایا۔

''وہ دوسرے البم میں کس کی تصویریں ہیں؟'' ناہید بیگم نے بڑے البم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آفتاب اور زرشاد میرے بہترین دوست تھے' ہم نے ایک ساتھ اپنا بچپن گزارا اور پھر ہم جوان ہوئے تو ہم تینوں نے ایک ہی پکچر بک میں اپنی تصویریں جمع کرنا شروع کر دیں۔'' ملک ہشام نے ناہید کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''پھر ایک دن یوں ہوا کہ آفتاب نے زرشاد کی بہن رخشندہ کی کچھ تصویریں اسی البم میں جمع کر دیں' میں نے آفتاب سے کہا کہ زرشاد کی بہن کی تصویریں اس پکچر بک میں مت لگاؤ وہ تم سے ناراض ہو جائے گا تو آفتاب نے مجھے جواب دیا کہ زرشاد جانتا ہے میں اس کی بہن سے محبت کرتا ہوں۔'' ملک ہشام نے ناہید کو بتایا تو ناہید بیگم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس سے اگلے روز میں نے تمہاری تصویریں پکچر بک میں لگا دیں' میں نے زرشاد اور آفتاب کو بتایا کہ میں بھی ناہید سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' ملک ہشام نے ناہید سے کہا تو ناہید بیگم اسے متحیر نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

''زرشاد نے تمہاری تصویریں یہ کہہ کر پھاڑ دیں کہ

میں ناہید سے محبت کرتا ہوں اور ناہید صرف میری ہے اور پھر اسی دن زرشاد مجھ سے ناراض ہوگیا۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کو بتایا۔

''پھر زرشاد مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگیا اور آپ نے مجھے حاصل کرنے کے لیے زرشاد کو قتل کر دیا۔'' ناہید بیگم ایک ایک لفظ چبا کر بول رہی تھی۔

''ناہید بیگم! آج سے پچیس سال پہلے مجھے آپ سے محبت ہوئی تھی اور پچھلے پچیس سالوں میں میری محبت ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوئی۔'' ملک ہشام نے کہا تو ناہید نے اسے ناگوار نظروں سے دیکھا۔

''ناہید بیگم! مجھے آپ کے سر کی قسم' مجھے آپ سے جو محبت ہے اس محبت کی قسم' میں نے زرشاد کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی زرشاد کے قتل سے میرا کوئی تعلق ہے۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ناہید بیگم نے جھٹکے سے ملک ہشام کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا دیا۔ ناہید بیگم کی آنکھوں میں ملک ہشام کے لیے شدید نفرت واضح دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے شک ہے کہ آفتاب کے بھائی عابد نے زرشاد کو قتل کیا تھا۔'' ملک ہشام نے آنسو صاف کرنے کے بعد ناہید بیگم کو بتایا۔

''عابد' زرشاد کو قتل کیوں کرے گا۔'' ناہید بیگم نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''جب آفتاب نے زرشاد کی بہن رخشندہ سے شادی کر لی تھی تو زرشاد نے آفتاب کو اپنا بزنس پارٹنر بنا لیا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آفتاب کا لالچ بڑھتا گیا' وہ بزنس کے علاوہ زرشاد کے دیگر معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگا تھا' زرشاد اسے اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا اور آخرکار زرشاد نے آفتاب کو قتل کروا دیا تھا۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کو ساری تفصیل بتا دی تھی لیکن ناہید بیگم ملک ہشام کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے شک ہے کہ عابد نے اپنے چھوٹے بھائی آفتاب کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے زرشاد کو قتل کیا ہوگا۔'' ملک ہشام نے کہا۔

''بہت من گھڑت کہانی گڑی ہے آپ نے۔'' ناہید بیگم نے کہا تو ملک ہشام تلملا اٹھا۔ اس نے پکچر بک ناہید کے پرس پر پھینکی اور غصیلی نگاہوں سے ناہید کو گھورتے ہوئے چلا گیا جبکہ ناہید کی نفرت بھری نگاہوں نے کمرے کے خارجی دروازے تک ملک ہشام کا تعاقب جاری رکھا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام اسپتال سے باہر نکلا اور سگریٹ پیتے ہوئے اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ جیپ کے پاس اکرم کھڑا تھا۔ ملک ہشام نے اسے غصیلی نگاہوں سے گھورا۔

''ملک صاحب! میرے پاس آپ کے لیے دو خبریں ہیں' ایک اچھی خبر ہے اور ایک بہت بری خبر ہے۔'' اکرم نے کہا تو ملک ہشام کی گردن کا تناؤ بڑھ گیا اور اس نے دائیں آبرو اوپر تک کھینچتے ہوئے اسے دیکھا۔

''پہلے اچھی خبر سناؤ۔'' ملک ہشام نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اسد نے شہرناز کو پکڑ لیا ہے اور اسے گول پلازے کے سامنے والی عمارت کے تہہ خانہ میں رکھا گیا ہے۔'' اکرم نے ملک ہشام کو بتایا۔

''شہرناز' ناہید بیگم کی بیٹی ہے اس لیے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے' اس کی خدمت پر ایک ملازمہ مامور کر دو۔'' ملک ہشام نے اکرم کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تو اکرم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بری خبر یہ ہے کہ فارم ہاؤس پر دوبارہ حملہ ہوا ہے' حملہ انتہائی خطرناک قسم کا تھا' تمام گارڈز بری طرح زخمی ہیں جبکہ بخشو کو اغواء کر لیا گیا ہے۔'' اکرم نے بتایا تو ملک ہشام کا پارہ ایک بار پھر چڑھ گیا۔ اس نے غضب ناک انداز میں سگریٹ زمین پر پھینکا اور جیپ میں سوار ہوگیا تو ڈرائیور نے جیپ چلا دی جبکہ اکرم اپنی کار میں سوار ہوگیا۔ ملک ہشام کی جیپ تھانے کے سامنے رکی۔ ملک ہشام جیپ سے باہر نکلا اور تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تو ایک پولیس اہلکار نے اسے بتایا کہ ایس ایچ او منیر صاحب تھانے میں موجود نہیں ہیں۔ ملک ہشام دوبارہ جیپ کی طرف مڑا۔ جیپ میں سوار ہوتے ہی اس نے ایس ایچ او منیر کا نمبر ڈائل کیا اور فون ڈرائیور کو پکڑا دیا۔

''منیر صاحب آپ کے فارم ہاؤس میں ہیں۔'' فون پر بات کرنے کے بعد ڈرائیور نے ملک ہشام کو بتایا تو ملک

ہشام نے اسے فارم ہاؤس جانے کے لیے کہہ دیا۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی ملک ہشام پورے جاہ وجلال کے ساتھ ایس ایچ او منیر کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔

''ملک صاحب! مجھے شک تھا کہ فارم ہاؤس پر دوبارہ حملہ ہوسکتا ہے اس لیے میں نے اپنے دو آدمی یہاں رکھے تھے' وہ دونوں حملے کے وقت چھپ گئے تھے لیکن اب وہ حملہ آور کا مسلسل تعاقب کررہے ہیں۔'' ایس ایچ او منیر نے صورت حال سے آگاہ کیا تو ملک ہشام نے اسے عصیلی نگاہوں سے گھورا اور انسپکٹر کامران کی طرف بڑھ گیا۔

''ملک صاحب! تحقیقات جاری ہیں لیکن اب تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شیشے کی بوتلوں میں چونا اور پانی بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے بوتلوں میں گیس کا دباؤ زیادہ ہوگیا تھا' یہ بوتلیں محافظوں کے پاؤں میں پھینکی گئیں' بوتلیں زمین پر گرتے ہی دھماکے کے ساتھ پھٹتی چلی گئیں۔ دھماکوں کی وجہ سے گارڈز خوفزدہ ہوگئے تھے اس لیے وہ حملہ آور کے خلاف جوابی کارروائی نہ کرسکے' دھماکوں کی وجہ سے بوتلوں کی کرچیاں دور تک بکھرتی گئیں اور بہت ساری کرچیاں محافظوں کے جسم میں دھنس گئیں اور وہ زخمی ہوگئے۔'' انسپکٹر کامران نے ملک ہشام کو حملے کے متعلق تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''ان سب چیزوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ آور گن پوائنٹ پر بخشو کو اغواء کرکے لے گیا ہوگا۔'' ایس ایچ او منیر ملک ہشام کے عقب سے بولا تو ملک ہشام اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''تم فارم ہاؤس کے اندر اور ارد گرد پولیس کی بجائے کسی گینگ کے آدمیوں کو تعینات کردو' حملہ آور یہاں دوبارہ آئے گا اور اس بار وہ اکیلا نہیں بلکہ کئی افراد کے ہمراہ آئے گا۔'' ملک ہشام نے منیر کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے دو آدمی حملہ آور کا تعاقب کررہے ہیں مجھے یقین ہے کہ آج حملہ آور پکڑا جائے گا۔'' منیر نے کہا۔

''مجھے بالکل یقین نہیں کہ جو آدمی حملہ آور کا تعاقب کر رہے ہیں وہ اسے پکڑ سکیں گے لہٰذا تم ایک مضبوط منصوبہ بناؤ تاکہ جب حملہ آور تیسری بار فارم ہاؤس آئے تو وہ واپس نہ جاسکے۔'' ملک ہشام نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

❖❖❖❖

مہرالنساء اپنے روم میں چائے پی رہی تھی کہ اس کے فون پر رنگ ہونے لگی۔

''میں نے بخشو کو اغواء کرلیا ہے لیکن ملک ہشام کے دو کارندے مسلسل میرا تعاقب کررہے ہیں' مجھے مدد کی ضرورت ہے۔'' مہرالنساء نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف سے اجالا اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہارا پارٹنر قدیر کہاں ہے؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''وہ کار چلا رہا ہے اور میں نے بخشو کو قابو کر رکھا ہے۔'' اجالا نے مہرالنساء کو بتایا۔

''تم ان کارندوں کو الجھا کر رکھو' میں کچھ کرتی ہوں۔'' مہرالنساء نے کہا اور کال منقطع کردی۔

فون اور پرس لینے کے بعد وہ ٹیکسی کے ذریعے مشرف کے آفس پہنچی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آفس میں داخل ہوئی۔ مشرف کسی فائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ وہ مہرالنساء کے قدموں کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مہرالنساء نے اس کے سامنے پڑی فائل اٹھا کر دوسری طرف رکھ دی۔ مشرف اسے متحیر نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ مہرالنساء کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار بالکل واضح تھے۔

''مشرف! مجھے تمہاری مدد درکار ہے'' مہرالنساء نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' مشرف نے بے پرواہی سے کہا تو مہرالنساء کے دماغ میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔

''تم انکار نہیں کرسکتے۔'' مہرالنساء نے غصے سے چیختے ہوئے کرب ناک آواز میں کہا اور اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شیشے کی میز پر اس قدر زور سے مکا مارا کہ میز پر پڑی تمام چیزیں تھرتھرا گئیں۔ مشرف اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''مہرالنساء! تم بالکل نہیں بدلیں' تم آج بھی غصے میں اتنی ہی حسین نظر آتی ہو جتنی بچپن میں۔'' مشرف نے مہرالنساء کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''مشرف! اگر تم نے آج میری مدد نہ کی تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تم سے دوستی کا رشتہ بھی ختم کردوں گی'' مہرالنساء نے غراتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ' میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' مشرف نے پوچھا۔

''اجالا نے ملک ہشام کے خاص آدمی یعنی بخشو کو اغواء کیا ہوا ہے' وہ اسے میرے پاس لانا چاہتی ہے لیکن ملک ہشام کے کارندے اس کا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں'' مہرالنساء نے مشرف کو بتایا۔

''میرا خیال ہے تم بخشو سے ملک ہشام کے بارے میں چند راز جاننا چاہتی ہو؟'' مشرف نے پوچھا لیکن مہرالنساء نے مشرف کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے مشرف کو عصیلی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔

''میں دو شرائط پر تمہاری مدد کروں گا'' مشرف نے کہا۔

''کون سی دو شرطیں؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔ اس بار اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے نارمل لہجے میں بولنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لہجے کی تلخی کم نہ کر سکی۔

''پہلی شرط یہ ہے کہ بخشو جب راز اگل رہا ہو تو میں بھی وہاں موجود ہوں گا.....'' مشرف نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور دوسری شرط؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''مطلب پہلی شرط تمہیں منظور ہے؟'' مشرف نے سوال کا جواب سوال سے دیا تو مہرالنساء نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دوسری شرط یہ ہے کہ آج شام تمہیں میری گرل فرینڈ بن کر میرے ساتھ ایک پارٹی میں جانا ہو گا'' مشرف نے کہا۔

''مجھے تمہاری دوسری شرط بھی منظور ہے'' مہرالنساء نے کہا جبکہ مشرف کی نگاہیں مہرالنساء کی جھکی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔

''گل خان کا نیا نمبر ہے' یہ نمبر اجالا کو سینڈ کر دو' اسے بولو کہ گل خان سے رابطہ کر کے اسے اپنی لوکیشن بتائے'' مشرف نے ایک پرچی مہرالنساء کو دیتے ہوئے کہا تو اس نے فوری طور پر گل خان کا نمبر اجالا کو سینڈ کر دیا اور ساتھ ہی ایک ٹیکسٹ میسج اسے سینڈ کر دیا۔ اسی دوران مشرف نے گل خان کو فون کیا اور اجالا کی مدد کرنے کو کہا۔

❖❖❖❖

یہ بہت بڑا گودام تھا جہاں گندم پیسنے والی تین سے چار مشینیں نصب تھیں۔ اجالا نے اسی گودام میں بخشو کو ایک کرسی پر باندھ رکھا تھا۔ مہرالنساء بھی مشرف کے ہمراہ وہاں آ گئی۔

''یہ کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء نے مشرف کی جانب دیکھا۔ مشرف آگے بڑھا اور اس نے بخشو کو یکے بعد دیگرے کئی گھونسے مارے۔ وہ کرسی سمیت فرش پر گر گیا۔

''مشرف! خود کو ملکان مت کرو' میں ایک ڈیوائس لے کر آتی ہوں جس سے کم مقدار میں انسان کو کرنٹ لگتا ہے' انسان مرتا نہیں ہے لیکن تڑپتا ضرور ہے'' مہرالنساء نے کہا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

بیس سے پچیس منٹوں بعد مشرف کے ڈرائیور نے اسے دوبارہ اسی گودام والی عمارت کے باہر ڈراپ کیا۔ مہرالنساء جب اندر داخل ہوئی تو بخشو نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پین نما ایک الیکٹرک ڈیوائس تھی۔

''آپ جو کچھ پوچھیں گے میں بتانے کے لیے تیار ہوں'' بخشو نے کہا۔

''ملک ہشام کا کوئی راز بتاؤ جس کے ذریعے ہم اسے نقصان پہنچا سکیں اور ہمیں فائدہ حاصل ہو'' مشرف نے بخشو کو کرسی سمیت سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''ملک ہشام کے فارم ہاؤس پر شراب اور منشیات کی بہت بڑی کھیپ موجود ہے'' بخشو نے کہا تو مہرالنساء نے الیکٹرک پین کی چٹکی بخشو کے بازو پر لگائی اور اجالا کو سوئچ آن کرنے کے لیے کہا۔

''رکو..... میں کام کی بات بتاتا ہوں'' بخشو نے کہا تو مہرالنساء نے اجالا کو رکنے کے لیے اشارہ کیا۔

''ملک ہشام بہت عرصہ سے ناہید بیگم سے محبت کرتا تھا اب جب ناہید بیگم بیوہ ہو چکی تھی تو ملک ہشام نے اسے نکاح کے لیے قائل کرنے کے لیے ایک بڑا پلان بنایا' ملک ہشام نے ناہید بیگم کے بیٹے دلشاد کو اغواء کروایا اور اپنی بیٹی عفیفہ کو کسی خفیہ مقام پر چھپا دیا اور پھر یہ بات مشہور کر دی کہ دلشاد ملک ہشام کی بیٹی عفیفہ کو بھگا کر لے گیا ہے'' بخشو نے تفصیلاً بتایا تو مشرف اور مہرالنساء نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔

''دلشاد بھائی کو معاف کرنے کے بدلے ملک ہشام نے مجھ سے نکاح کا مطالبہ کیا تھا'' مہرالنساء نے کہا۔

''وہ ایک ڈرامہ تھا' ملک ہشام ناہید کی دونوں بیٹیوں

کو ناہید سے دور کرنا چاہتا تھا تاکہ جب وہ ناہید بیگم سے نکاح کا مطالبہ کرے تو اس کی بیٹیاں نکاح میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔'' بخشو نے مزید بتایا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ ملک ہشام نے دلشاد بھائی اور عفیفہ کو کہاں چھپا رکھا ہے؟'' مہرالنساء نے پوچھا تو بخشو نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''اگر تم مجھے دلشاد بھائی اور عفیفہ کا پتہ بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔'' مہرالنساء نے بخشو سے کہا تو بخشو راضی ہو گیا۔

❖❖❖❖

شام ہونے والی تھی۔ مہرالنساء مشرف کے ہمراہ پارٹی میں جا رہی تھی۔ نبیل کار ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ مشرف مہرالنساء کے ساتھ عقبی سیٹ پر براجمان تھا۔

''ایم این اے محمود صاحب کے بیٹے تیمور نے اپنے ڈیرے پر ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا ہے' تیمور نے اس پارٹی میں بہت سے دوستوں کو مدعو کیا ہے۔'' مشرف نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''اب وہاں ہر کسی کو یہ مت بتانا شروع کر دینا کہ میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں ورنہ میں اسی وقت تردید کر دوں گی' بعد میں مت کہنا کہ بھرے مجمع میں تمہاری بے عزتی ہو گئی۔'' مہرالنساء نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اگر تمہیں میری بے عزتی کر کے خوشی ملتی ہے تو میں تم سے شکوہ نہیں کروں گا'' مشرف نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

''مطلب تم باز نہیں آؤ گے۔'' مہرالنساء نے منہ سا بناتے ہوئے کہا تو مشرف بے اختیار مسکرا پڑا۔

''لگتا ہے تیمور کا ڈیرا آ گیا ہے'' مہرالنساء نے کار کے ونڈ شیلڈ سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈیرے کی چار دیواری ایک ایکڑ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیرے کے جنوبی حصے میں وسیع عریض عمارت تھی جبکہ شمالی حصہ مختلف قسم کے درختوں پر مشتمل تھا۔ نبیل نے عمارت سے کچھ فاصلے پر کار پارک کی جہاں پر پہلے سے کچھ گاڑیاں موجود تھیں۔ عمارت کے داخلی دروازے پر تیمور خود کھڑا تھا۔ وہ آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ جب مشرف اور مہرالنساء مرکزی ہال میں داخل ہوئے تو تیمور نے انہیں خوش آمدید کہا۔

''تیمور! میرے پیارے دوست..... کیسے ہو تم؟'' مشرف نے تیمور سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا تو تیمور نے اسے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

''مسٹر تیمور! آپ کا بہت شکریہ۔'' مہرالنساء نے مسکراتے ہوئے کہا تو مشرف نے ناگواری سے مہرالنساء کو گھورا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

جب تمام مہمان اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے تو تیمور مائیک پکڑے اسٹیج پر آیا۔

''دوستو! چند دن پہلے میں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا ہے اور یہ پارٹی اسی خوشی میں دی جا رہی ہے' پارٹی کا انعقاد شہر کے کسی ہوٹل میں ہونا تھا لیکن کچھ دوستوں نے شراب کی فرمائش کر دی تھی تو اس وجہ سے یہ پارٹی یہاں آبادی سے دور اس ڈیرے پر رکھی گئی۔'' تیمور نے مائیک پر بولتے ہوئے کہا اور پھر مائیک بند کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا تو مہرالنساء اپنی نشست سے کھڑی ہوئی۔

''مسٹر تیمور! آپ بہت اچھے انسان ہیں' میں آپ سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔'' مہرالنساء نے بلند آواز میں کہا۔ چونکہ مشرف مہرالنساء کی برابر والی نشست پر بیٹھا تھا تو اس نے اپنا بایاں پاؤں مہرالنساء کے پاؤں کی طرف بڑھایا۔ اس نے مہرالنساء کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر مسلا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مہرالنساء تیمور سے بات کرے۔

''محترمہ! کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیوں متاثر ہوئی ہیں'' تیمور مہرالنساء سے مخاطب ہوا۔

''یہاں کچھ لوگ اپنے ساتھ کرائے کی گرل فرینڈ ساتھ لائے ہیں اور ایک صاحب یہاں ایسے بھی جنہوں نے کسی لڑکی کو بلیک میل کر کے اس لڑکی کو گرل فرینڈ کے طور پر ساتھ لائے ہیں.....'' مہرالنساء کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشرف اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سٹپٹاتے ہوئے مہرالنساء کو دیکھا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

''مسٹر تیمور! میں آپ سے متاثر نہیں ہوئی' مجھے تو مشرف کے کرتوت سب کے سامنے بیان کرنے کا بہانہ چاہیے تھا اس لیے میں نے آپ کو موضوع بنا کر گفتگو کا آغاز کیا ہے۔'' مہرالنساء نے مسکراتے ہوئے کہا تو تیمور کو بہت غصہ آیا لیکن وہ اپنا غصہ ضبط کر گیا۔ پارٹی میں موجود تمام لڑکے افسردہ ہو گئے جبکہ دو لڑکیاں مسکرا رہی تھیں۔

''آپ لوگ کھانا شروع کریں' میں مشرف کو واپس لے کر آتا ہوں۔'' تیمور نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور ہال سے چلا گیا۔ مہرالنساء نے فون پر اجالا کا نمبر ڈائل کیا۔

''بخشو کو لے کر گودام سے چلی جاؤ' میں کچھ دیر میں تمہارے پاس آتی ہوں تب تک تم بخشو سے دلشاد بھائی اور عفیفہ کا پتہ معلوم کرلو۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی مہرالنساء نے اجالا سے کہا اور کال منقطع کردی۔

جب تیمور مشرف کے پاس پہنچا تو وہ پارکنگ ایریا میں کھڑا تھا۔

''مشرف میرے دوست! تم ایک لڑکی کی وجہ سے پارٹی چھوڑ کر مت جاؤ' پارٹی کا مزا خراب مت کرو۔'' تیمور نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا

''یار! وہ کئی سالوں سے میری دوست ہے' اس نے جان بوجھ کر مجھے تکلیف دینے کے لیے میری بے عزتی کی ہے۔'' مشرف نے روہانسا ہو کر کہا۔

''جو کچھ بھی ہوا ہے میری خاطر نظر انداز کردو۔'' تیمور نے کہا تو مشرف اس کے ساتھ واپس ہال میں چلا گیا۔ اب وہ مہرالنساء کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے تیمور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ مشرف کے فون کی اسکرین ایک جھماکے کے ساتھ آن ہوئی۔ اس نے اسکرین کو دیکھا۔ گل خان کی کال آرہی تھی۔ مشرف نے کال اٹینڈ کی۔

''بخشو گودام سے نکل چکا ہے' میرے خیال میں اجالا نے اسے آزاد کردیا ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''تم اسے قابو کرلو اور کسی خفیہ جگہ پر باندھ دو۔'' مشرف نے فون پر بات کرتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور کال منقطع کرنے کے بعد کھانا کھانے لگا۔

❖❖❖❖

رات کے دس بجے کے قریب مہرالنساء اجالا کے پاس پہنچی۔

''اجالا! تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟'' مہرالنساء نے اجالا سے پوچھا تو اجالا نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔

''بخشو کہاں ہے؟'' مہرالنساء نے ایک اور سوال داغا۔

''اسے میں نے چھوڑ دیا ہے۔'' اجالا نے جواب دیا تو مہرالنساء حیران ہوگئی۔

''مگر میں نے تمہیں نہیں بولا تھا کہ اسے چھوڑ دو' دلشاد بھائی اور عفیفہ کا پتہ معلوم کرلیا تھا؟'' مہرالنساء نے پوچھا تو اجالا نے کرنسی نوٹوں کی تھیلی مہرالنساء کی طرف بڑھادی۔

''میں آپ کی رقم واپس کر رہی ہوں' مجھے آپ کے لیے کام نہیں کرنا۔'' اجالا نے کہا تو مہرالنساء کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''مگر کیوں؟'' مہرالنساء نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''میں وجہ بتانے پر مجبور نہیں ہوں۔'' اجالا نے کرنسی نوٹوں کی تھیلی مہرالنساء کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور واپس جانے کے لیے دوسری جانب مڑی تو مہرالنساء نے اپنے پرس سے پستول نکال کر اس کی نال اجالا کے کندھے پر رکھ دی۔

''تم کام نہ کرنے کی وجہ بتائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتی۔'' مہرالنساء نے دھمکی خیز لہجے میں کہا۔

''کوئی مجھ سے وہ کام نہیں کروا سکتا جو میں کرنا نہیں چاہتی۔'' اجالا تنک کر بولی اور پھر تیزی سے مہرالنساء کی جانب پلٹی۔ اس نے پلٹتے ہی مہرالنساء کے پیٹ میں لات ماردی۔ مہرالنساء کے ہاتھ سے پستول گر گیا اور وہ کمر کے بل فرش پر گر گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا تھا۔

''اجالا کو اچانک کیا ہوگیا ہے؟ اس نے اچانک معاہدہ ختم کیوں کردیا۔'' مہرالنساء نے سوچا اور اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھی۔ اس نے پستول اٹھا کر پرس میں رکھا اور کمرے سے چلی گئی۔ اب وہ روڈ پر آچکی تھی اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو فون کرنے کے بعد مشرف کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے مشرف کو تین بار فون کیا لیکن وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

''اجالا نے بخشو کو چھوڑ دیا ہے اور اس نے میرے ساتھ کیا ہوا معاہدہ بھی ختم کردیا ہے' وہ اب ملک ہشام کے خلاف کام نہیں کرے گی۔'' مہرالنساء نے موبائل فون پر ٹیکسٹ میسج ٹائپ کی اور مشرف کے نمبر پر سینڈ کردیا۔

''اگر بخشو ملک ہشام کے پاس پہنچ گیا تو وہ اسے بتا دے گا کہ اس کے خلاف سازشوں میں تم بھی میرے ساتھ شامل ہو اور یوں ملک ہشام تمہیں بھی اپنا دشمن سمجھ لے

گا۔'' مہرالنساء نے مشرف کو دوسرا میسج سینڈ کیا تو مشرف کا فوری ری پلائی آیا۔

''بخشو میرے پاس ہے' جب اجالا نے اسے چھوڑا تھا تب گل خان نے گن پوائنٹ پر بخشو کو قابو کر لیا تھا۔'' مشرف کا میسج پڑھ کر مہرالنساء نے گہری سانس لی اور پھر چاند کی دودھیا روشنی میں اپنے قریب لمبا سا سایہ دیکھ کر وہ ہڑبڑا گئی۔

''میم! میں ہوں گل خان۔'' گل خان نے کہا تو وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی تو ٹیکسی کے ہارن کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ مہرالنساء نے ٹیکسی والے کو انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

''میم! مشرف صاحب نے مجھے آپ کی حفاظت اور نگرانی کرنے کا بولا تھا' جب آپ نے مجھے نوکری سے نکالا تھا تب سے آپ کی نگرانی اور حفاظت پر مامور ہوں' اگر آپ میری مدد کر دیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔'' گل خان نے مہرالنساء سے کہا۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''مشرف صاحب مجھ سے بہت ٹیڑھے ٹیڑھے کام لیتے ہیں' اگر میں کسی دوسری جگہ نوکری کروں گا تو وہ میرا دشمن ہو جائے گا لیکن اگر آپ کے پاس دوبارہ نوکری کروں گا تو مشرف صاحب رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔'' گل خان نے رطب اللسان بولتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے مشرف گل خان کے ذریعے میرے ساتھ کوئی نئی چال چل رہا ہے لیکن اس بار نقصان مشرف کا ہوگا' گل خان اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' مہرالنساء نے گل خان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ نے بخشو کو اغواء کر لیا ہے' اگر آپ مشرف کو خبر دیئے بغیر بخشو سے میرے بھائی دلشاد اور ملک ہشام کی بیٹی عفیفہ کا پتہ معلوم کر کے وہ پتہ مجھے لا دیں تو میں آپ کو دوبارہ نوکری پر رکھ لوں گی۔'' مہرالنساء نے گل خان سے کہا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

❖❖❖❖

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد مشرف اس مکان میں پہنچ گیا جہاں پر گل خان نے بخشو کو ایک ستون کے ساتھ رسی سے باندھ رکھا تھا۔ گل خان نے چند دنوں کے لیے یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ بخشو کو شدید زخمی حالت میں دیکھ کر مشرف گل خان کی طرف متوجہ ہوا۔

''رات کو مہرالنساء سے ملاقات ہو گئی تھی' وہ جانتی تھی کہ میں نے بخشو کو اغواء کر لیا ہے اسی وجہ سے اس نے بولا تھا کہ اگر میں نے بخشو سے دلشاد اور عفیفہ کا پتہ اگلوا لیا تو وہ مجھے دوبارہ نوکری پر رکھ لے گی۔'' گل خان نے مشرف سے کہا۔

''اس نے دلشاد اور عفیفہ کا پتہ بتا دیا؟'' مشرف نے بخشو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو گل خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم نے مہرالنساء کو دلشاد اور عفیفہ کا پتہ بتا دیا؟'' مشرف نے گل خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے پوچھا تو گل خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بیوقوف انسان! تمہیں پہلے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا' مہرالنساء نے کل میری بہت بے عزتی کی تھی اگر وہ مجھے سوری بولتی تو تب اسے دلشاد اور عفیفہ کا پتہ بتانا تھا۔'' مشرف نے گل خان کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا تو گل خان نے اپنے گریبان پر موجود مشرف کے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر بائیں آبرو اوپر تک کھینچتے ہوئے مشرف کو غصے سے دیکھا تو مشرف نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''اب کوئی ایسا موقع پیدا کرو کہ مہرالنساء مجبور ہو کر میرے پاس آئے اور مجھے سوری بولے۔'' مشرف نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اوکے۔'' گل خان نے اوکے کہا اور چلا گیا۔ مشرف بخشو کے پاس آیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھورنے لگا۔

''تم نے اجالا سے ایسا کیا کہا تھا کہ اس نے مہرالنساء کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔'' مشرف نے بخشو سے پوچھا تو بخشو مشرف کو گھورنے لگا۔ مشرف نے مڑا ہوا گھٹنا مسلسل تین بار بخشو کے پیٹ میں مارا تو وہ درد کی شدت سے چیخنے لگا تھا۔

''اجالا ملک ہشام کی بیٹی ہے' اسے میں نے یہی بات تفصیل سے بتائی تھی اور اب وہ پہلے اس بات کی تصدیق کرے گی کہ وہ واقعی ملک ہشام کی بیٹی ہے اور اس سلسلے میں اسے کافی ثبوت مل جائیں گے۔'' بخشو نے درد سے

کراہتے ہوئے کہا تو مشرف نے اسے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

''جب اس بات کی تصدیق ہو جائے گی اور اجالا کو یقین ہو جائے گا کہ وہ ملک ہشام کی بیٹی ہے تو وہ تمہیں اور مہرالنساء کو اپنا دشمن تصور کرنے لگے گی' وہ تمہیں اور مہرالنساء کو ختم کر دے گی'' بخشو نے دھمکی خیز لہجے میں کہا تو مشرف نے بخشو کے منہ پر گھونسا مارا اور غصے سے لال پیلا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ کار میں بیٹھتے ہی مشرف نے بوتل سے پانی پیا اور خود کو پرسکون کرنے کے لیے میوزک آن کیا اور ٹیبل کو کار چلانے کے لیے اشارہ کیا۔ کار جب آفس کے سامنے رکی تو آفس کی طرف جاتے ہوئے مشرف نے مہرالنساء کو کال نمبر ڈائل کیا۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اجالا نے تمہارے لیے کام کرنے کا معاہدہ کیوں چھوڑا ہے۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی مشرف نے مہرالنساء سے کہا۔

''مجھے بھی بتاؤ۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''میرے آفس آ جاؤ' یہاں بیٹھ کر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔'' مشرف نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ اب اس نے موبائل فون پر پکچر گیلری کھولی اور ایک پکچر آئیکان کو انگوٹھے سے ٹچ کر دیا۔ فون اسکرین پر مہرالنساء کی تصویر نمودار ہو گئی۔ مشرف نے تصویر کو زوم آؤٹ کیا اور تصویر میں مہرالنساء کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ کافی دیر تک مہرالنساء کا چہرہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ مہرالنساء آفس میں آ گئی۔ مہرالنساء نے اسے السلام وعلیکم اور صبح بخیر بولا۔

مہرالنساء نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مشرف کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا جبکہ اس کے مسکرانے کے سبب مہرالنساء تھوڑی حیران تھی۔

''تم وجہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ اجالا نے تمہارے ساتھ کیا ہوا معاہدہ کیوں توڑ دیا؟'' مشرف نے پوچھا تو مہرالنساء نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اگر تمہیں راز چاہیے تو پھر تمہیں پہلے سوری بولنا پڑے گا۔'' مشرف نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''کس بات کے لیے سوری؟'' مہرالنساء نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کل پارٹی میں جو تم نے میری بے عزتی کی تھی اس کے لیے تم سوری بولو گی تو میں راز دوں گا۔'' مشرف نے مشروط انداز میں کہا تھا۔

''میں سوری نہیں بولوں گی۔'' مہرالنساء نے لفظ سوری چبا کر بولا تھا۔

''راز بہت قیمتی ہے' اس کے بغیر تم تدبیر نہیں کر سکو گی۔'' مشرف نے کہا۔

''سوری بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اوکے' تمہاری مرضی۔'' مشرف نے بے پرواہی سے کہا۔

''تم بتا رہے ہو کہ اجالا نے معاہدہ کیوں توڑا؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''سوری بولو گی تو بتاؤں گا۔'' مشرف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا سوری بولنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔'' مہرالنساء نے دھمکی خیز لہجے میں کہا اور پھر ہاتھوں کو اپنے کانوں کی طرف لے گئی۔

''مشرف! آئی ایم سوری' میں نے تمہاری بے عزتی کی تھی پلیز مجھے معاف کر دو۔'' مہرالنساء نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اجالا' ملک ہشام کی بیٹی ہے' اسے بخشو نے یہی بات تفصیل سے بتائی تھی اور اب وہ پہلے اس بات کی تصدیق کرے گی کہ وہ واقعی ملک ہشام کی بیٹی ہے اور اس سلسلے میں اسے کافی ثبوت مل جائیں گے۔'' مشرف نے مہرالنساء کو بتایا تو نبیل نے مشرف اور مہرالنساء کے درمیان پڑی شیشے کی میز پر ایک ٹرے میں چائے اور بسکٹ رکھ دیئے۔

❖❖❖❖

کاشف کو آصف کی کوششوں کے نتیجے میں جیل سے رہائی مل چکی تھی اور اب وہ ایگل نامی نجی تنظیم کا رکن بن چکا تھا۔ یہ تنظیم بھتہ خوروں کے خلاف برسرپیکار تھی۔ کاشف کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اور اب اسے جیل میں آصف صاحب سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ملاقات کے دوران آصف سلاخوں کے پیچھے جبکہ کاشف سلاخوں کے باہر کھڑا تھا۔ کاشف نے آصف کو سلام پیش کیا اور پھر بتایا

کہ اسے ہدایات وصول کرنے کے لیے آصف کے پاس بھیجا گیا ہے۔

''آفاقی کا بھتہ خوری کا سابقہ گروپ ختم ہو گیا تھا اور اب اس نے جو نیا گروپ بنایا ہے اس میں مہرو اور ذونیا کا نام سرفہرست ہے۔'' آصف نے کاشف کو بتایا۔

''تمہیں مہرو اور ذونیا کی تصویریں دی جائیں گی' تم ان کو دیکھنے کے بعد ان کا تعاقب کرو گے اور ان کے کام کرنے کا طریقہ کار اور اوقات معلوم کرو گے۔'' آصف نے کاشف سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔

❖❖❖❖

''میرے خیال میں ہمیں آپس کی ضد بازی چھوڑ کر متحد ہو جانا چاہیے اور اجالا کا کام تمام کر دینا چاہیے۔'' مشرف نے مہرالنساء سے کہا۔

''ایسا ممکن نہیں' میں نے تمہیں سوری بولا ہے تو اس سوری کی قیمت تو تمہیں ادا کرنی پڑے گی اور رہی بات اجالا کی تو اس سے میں خود نمٹ لوں گی اس کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار نہیں ہے۔'' مہرالنساء نے کہا اور چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد کپ میز پر رکھا۔ وہ مشرف کو گھورتے ہوئے کرسی سے اٹھی اور اس نے میز سے اپنا پرس اٹھایا۔

مہرالنساء آفس سے باہر آئی تو گل خان نے کار کا دروازہ کھولا۔ مہرالنساء فرنٹ سیٹ پر سوار ہوئی تو گل خان نے دروازہ بند کیا اور کار کی دوسری طرف گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہوا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور مہرالنساء کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے ایم این اے محمود صاحب کے بیٹے تیمور سے ملاقات کرنی ہے۔'' مہرالنساء نے گل خان سے کہا۔

''ہم محمود صاحب کے عوامی دفتر جائیں گے اور وہاں سے تیمور کا فون نمبر لے کر اس سے رابطہ کریں گے۔'' گل خان نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''او کے جیسا آپ بہتر سمجھو۔'' مہرالنساء نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تو گل خان نے کار چلا دی۔

گل خان نے دفتر سے تیمور کا فون نمبر لیا۔ مہرالنساء نے تیمور سے فون پر بات کی اور اسے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ مشرف کی دوست مہرالنساء بول رہی ہوں اور تیمور صاحب سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ تیمور نے مہرالنساء کو اپنے گھر کا پتہ بتایا اور لنچ ٹائم اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ مہرالنساء لنچ سے آدھا گھنٹہ پہلے گل خان کے ہمراہ تیمور کی رہائشگاہ پہنچ گئی۔ تیمور کا ایک ملازم ان دونوں کو سٹنگ روم میں لے گیا۔ مہرالنساء سنگل صوفے پر بیٹھی اور اس نے ایک فائل اور اپنا پرس سامنے پڑی میز پر رکھا جبکہ گل خان میز دوسری جانب بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تیمور کو مہرالنساء کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ بھی سٹنگ روم آ گیا۔ تیمور نے مہرالنساء کو خوش آمدید کہا تو مہرالنساء نے تیمور کا شکریہ ادا کیا۔

''مشرف اور آپ کے درمیان جو ناراضگی تھی وہ ختم ہو گئی؟'' رسمی گفتگو کے بعد تیمور نے مہرالنساء سے پوچھا۔

''ہاں' آج صبح ہم نے ایک ہی میز پر چائے پی تھی۔'' مہرالنساء نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

''کل ہم نے پارٹی میں کھانے کے بعد بہت ہلا گلا کرنا تھا لیکن آپ دونوں کی ناراضگی کی وجہ سے ہم ہلا گلا نہ کر سکے۔'' تیمور نے شکوہ سا کیا تو مہرالنساء شرمندہ ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ساری غلطی اس کی تھی۔

''میں آپ سے کاروباری معاملے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔'' مہرالنساء نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا تو تیمور نے اسے متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

''نئی گندم منڈی کی شمال کی جانب چار کلومیٹر کے فاصلے پر شہاب صاحب کی نوے ایکڑ زمین ہے' میں وہ زمین خرید کر وہاں پلاٹنگ کرنا چاہتی ہوں۔'' مہرالنساء نے زمینوں کا نقشہ تیمور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے آپ کیا چاہتی ہیں؟'' تیمور نے نقشے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ زمین میں اکیلے نہیں خرید سکتی' مجھے ایک پارٹنر چاہیے جو شراکت داری کی بنیاد پر میرے ساتھ سرمایہ کاری کر سکے'' مہرالنساء نے تیمور سے کہا۔

''مجھے زمینوں کی خرید و فروخت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا تو مہرالنساء سمجھ گئی کہ تیمور دبے لفظوں میں اس کے ساتھ سرمائے کی شراکت داری سے انکار کر رہا ہے لیکن وہ طے کر چکی تھی کہ وہ تیمور کو ہر صورت میں شراکت داری کے لیے قائل کرے گی۔

''میں آپ کو ساری معلومات دوں گی امید ہے کہ اس

کے بعد آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔'' مہرالنساء نے کہا تو تیمور نے زمینوں کا نقشہ میز پر رکھا اور مہرالنساء کی جانب متوجہ ہوا۔

''شہاب صاحب سے میری ملاقات ہو چکی ہے' ہم کل رقم کا تیس فیصد شہاب صاحب کو پیشگی ادا کریں گے تو وہ چالیس ایکڑ زمین ہمارے نام رجسٹر کر دیں گے' ہم چالیس ایکڑ زمین کی پلاٹنگ کریں گے تو پلاٹس کے خریدار ہمیں جو رقم پیشگی ادا کریں گے اس ساری رقم کا مجموعہ ہم شہاب صاحب کو ادا کر کے مزید چالیس ایکڑ زمین کی رجسٹری کروالیں گے اور اس کے بعد ہمارے ذمے پانچ ایکڑ زمین کی قیمت ہوگی جبکہ شہاب صاحب پانچ ایکڑ زمین مفت میں دیں گے۔'' مہرالنساء نے زمین کی خریداری کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''شہاب صاحب پانچ ایکڑ زمین مفت کیوں دیں گے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہم نے ساری زمین کی پلاٹنگ کرنی ہے تو پلاٹس کے درمیان سڑکوں اور راہداریوں کے لیے جو زمین مختص ہو گی وہ شہاب صاحب مفت میں دیں گے۔'' مہرالنساء نے تیمور کو بتایا۔

''شہاب صاحب کو کل رقم کی ادائیگی کتنے عرصہ میں کرنا ہوگی؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ایک ماہ کے دوران۔'' مہرالنساء نے مختصر جواب دیا۔

''میں اس سلسلے میں پاپا سے بات کروں گا اگر اجازت ملی تو میں آپ کے ساتھ پارٹنر شپ ضرور کروں گا'' تیمور نے کہا۔

''اگر ممکن ہو تو محمود صاحب سے میری ملاقات ضرور کروایئے گا'' مہرالنساء نے تیمور سے کہا۔

''او کے' پاپا جونہی اسلام آباد سے واپس آتے ہیں تو میں پاپا سے آپ کی ملاقات کروادوں گا'' تیمور نے کہا۔

''ایک اور اہم بات ہے جو میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی'' مہرالنساء نے کہا تو تیمور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''زمین کی پیمائش مرلہ کی بنیاد پر ہوتی ہے اور مرلہ کی تین اقسام ہیں

پہلی قسم: 275 مربع فٹ فی مرلہ

دوسری قسم: 250 مربع فٹ فی مرلہ

تیسری قسم: 225 مربع فٹ فی مرلہ۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''جب ہم زمین کی خریداری کریں گے تو 275 مربع فٹ فی مرلہ کے حساب سے زمین خریدیں گے اور 225 مربع فٹ فی مرلہ کے حساب سے زمین فروخت کریں گے۔'' مہرالنساء نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟'' تیمور نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''جی بالکل ایسا ہوتا ہے' یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مرلہ تین قسم کا ہوتا ہے' آپ دیکھیں گے کہ جب ہماری پلاٹنگ اسکیم اختتام پذیر ہوگی تو ہم زمین کی اصل قیمت کا دوگنا کما چکے ہوں گے۔'' مہرالنساء نے تیمور کو بتایا۔

''آپ نے تو جھوٹ کہا تھا کہ آپ مجھ سے متاثر ہوئی ہیں لیکن میں سچ میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ کام کر کے میں بہت منافع کماؤں گا۔'' تیمور نے مہرالنساء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تب ملازمہ سیٹنگ روم میں آئی اور اس نے تیمور کو بتایا کہ کھانا بالکل تیار ہے۔ تیمور صوفے سے اٹھا تو مہرالنساء اور گل خان تیمور کے ہمراہ لاؤنج میں چلے گئے جہاں میز پر کھانا پورے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔

❖❖❖❖

کاشف لالہ زار بازار میں پہنچ چکا تھا۔ آصف صاحب نے کاشف کو بتایا تھا کہ مہرو ہفتے میں دو دن لالہ زار بازار کا چکر لگاتا ہے اور دو کانداروں سے بھتہ لیتا ہے۔ کاشف کے علاوہ ایگل تنظیم کے دیگر کارندے بھی لالہ زار بازار میں موجود تھے۔ کاشف کی نظریں مہرو کو تلاش کر رہی تھیں۔ مہرو لالہ زار بازار سے نکل رہا تھا کہ اس نے کاشف کو دیکھ لیا۔

''یہ جیل سے باہر کیسے آ گیا؟ کیا اسی نے شہناز کو اغواء کیا ہے؟'' کاشف کو دیکھ کر مہرو کے ذہن میں دو سوالات ابھرے تھے۔ مہرو کاشف کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایگل تنظیم کے کارندوں نے مہرو کو گھیر لیا۔ مہرو خوفزدہ نظروں سے اپنے اطراف میں مسلح آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔

کاشف اور ایگل تنظیم کے کارندے مہرو کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے کہ آفاقی کے ہمراہ ذونیا وہاں آ گئی۔ انہوں نے مخصوص پستول سے ایگل تنظیم کے کارندوں پر

ربر کی گولیاں چلا دیں۔ اسی دوران مہرو وہاں سے بھاگ نکلا۔ کاشف نے مہرو کا بازو پکڑا تو کاشف کے سر میں ربر کی دو گولیاں لگیں اور وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور مہرو کا تعاقب جاری رکھا۔ مہرو ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ وہ دو منزلہ عمارت کے ساتھ ملحقہ بیرونی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چھوٹے کمرے کا لاک کھول کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں ذونیا آئی اور اسی کمرے میں چلی گئی۔ کاشف سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اسی کمرے کے دروازے کے باہر رک گیا کیونکہ دروازہ اب اندر سے بند تھا۔ کاشف نے دروازے کے ساتھ کان لگا لیا اور اندر ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''وہ لڑکا کون تھا..... تم اس کے پاس کیوں جا رہے تھے؟'' ذونیا نے مہرو سے پوچھا۔

''وہ میرا دوست ہے' جس لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں اسی لڑکی سے وہ بھی محبت کرتا ہے اس لیے مجھے لگا میری محبوبہ کو اسی نے اغواء کیا ہوگا'' مہرو نے ذونیا کو بتایا تو دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ مہرو ایک بار پھر خوفزدہ ہو گیا جبکہ ذونیا بھی گھبرا گئی۔

''میں کاشف ہوں اور میں نے شہرناز کو اغواء نہیں کیا۔'' کاشف کی زوردار آواز مہرو کی سماعت سے ٹکرائی جبکہ ذونیا بھی حیران سی ہوگئی۔

''دروازہ کھولو اور مجھے تفصیل بتاؤ کہ شہرناز کیسے اغواء ہوئی؟'' کاشف نے کہا تو مہرو نے بنا سوچے سمجھے دروازہ کھول دیا۔ کاشف نے مہرو کے سینے پر پستول تان لیا۔

''ذونیا سے بولو کہ اپنا اسلحہ پھینک دے ورنہ گولی تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔'' کاشف نے غراتے ہوئے کہا اور مہرو کے سینے پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھا دیا تو مہرو نے ذونیا کی طرف دیکھا۔ ذونیا نے دونوں پستول فرش پر رکھ دیئے۔

''کیا تم اپنے دوست پر گولی چلاؤ گے؟'' مہرو نے کاشف سے پوچھا۔

''اگر تم سازش کر کے اپنے دوست یعنی مجھے جیل بھیج سکتے ہو تو میں بھی بغیر ہچکچائے تم پر گولی چلا سکتا ہوں۔'' کاشف نے کہا اور اسی دوران ذونیا نے چپکے سے دو قدم کاشف کی طرف بڑھا دیئے جبکہ کاشف کو بالکل احساس تک نہ ہوا۔

''میں نے تمہارے ساتھ کوئی سازش نہیں کی' ملک ہشام کے آدمیوں نے تمہارے ساتھ سازش کر کے تمہیں جیل بھجوایا اور پھر مجھ پر حملہ کر کے مجھے شدید زخمی کر دیا اور مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ کب وہ شہرناز کو اغواء کر کے لے گئے۔'' مہرو نے کاشف کو بتایا تو ذونیا نے چپکے سے مزید چند قدم کاشف کی طرف بڑھا دیئے جبکہ کاشف اس بات سے بے خبر تھا کہ خطرہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

''تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری جھوٹی باتوں پر یقین کر لوں گا؟'' کاشف نے استفہامیہ لہجے میں کہا تو ذونیا نے اس کی جانب مزید قدم بڑھا دیئے۔

''اگر شہرناز کو بازیاب کروانا ہے تو تمہیں میری بات پر یقین کرنا ہوگا اور میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' مہرو نے کاشف سے کہا تو ذونیا جھکی اور اس نے دائیں ٹانگ ایک فٹ کی بلندی پر گھمائی تو اس کا پاؤں کاشف کی پنڈلیوں سے ٹکرایا تو وہ کمر کے بل فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ ذونیا نے قلابازی ماری اور اپنا پستول اٹھا کر کاشف پر تان لیا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدموں سے اس کے قریب آئی اور پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔

''اب چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔'' ذونیا نے کاشف سے کہا تو مہرو نے فرش سے کاشف کا پستول اٹھایا اور اس کی پشت پر تان لیا تو کاشف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور ان دونوں کے ساتھ چلا گیا۔

❖❖❖❖

تیمور کے ہاں لنچ کرنے کے بعد مہرالنساء اب اپنے فلیٹ واپس جا رہی تھی۔ گل خان کار ڈرائیو کر رہا تھا تو مہرالنساء اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''آپ مشرف کو فون کرو گے اور اسے بتاؤ گے کہ میں نے تیمور سے ملاقات کی تھی اور اس کے ساتھ لنچ کیا تھا تاکہ مشرف کو یقین ہو جائے کہ تم اس کے لیے کام کر رہے ہو اور میری نگرانی بھی کر رہے ہو'' مہرالنساء نے گل خان سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اب مجھے اس عمارت میں لے جاؤ جہاں ملک ہشام نے دلشاد بھائی کو چھپا رکھا ہے'' مہرالنساء نے گل خان سے کہا۔

''میم! وہاں لازمی طور پر ملک ہشام کے کارندے ہوں گے اور ان کے پاس اسلحہ بھی ہوگا۔'' گل خان نے کہا۔

''ہم باہر سے عمارت کا جائزہ لیں گے اور واپس آجائیں گے۔'' مہرالنساء نے کہا تو گل خان نے سڑک کے کنارے کار روک دی اور اپنی جیب سے ایک پیپر نکالا۔ اس پیپر پر وہ ایڈریس لکھے ہوئے تھے جو بخشو نے گل خان کو بتائے تھے۔ پورا پیپر پڑھنے کے بعد گل خان نے کار دوبارہ چلا دی۔ کار ایک بہت بڑی کالونی میں ہاؤس نمبر پانچ سو تینتیس کے سامنے رکی۔ مہرالنساء کار سے باہر آئی اور گھر کی ڈور بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے بیرونی دروازہ کھولا تو مہرالنساء نے اسے سلام کیا۔

''یہ آپ کے ساتھ والی کوٹھی میں کون رہتا ہے؟'' سلام کا جواب ملنے کے بعد مہرالنساء نے پوچھا۔

''بیٹی بہت عجیب شخص ہے' اس کے ساتھ پانچ افراد ہر وقت اسلحے اٹھائے گھومتے رہتے ہیں' محلے والوں نے پولیس والوں سے شکایت کی تو اس شخص نے پولیس والوں کو اپنا دوست بنا لیا۔'' بوڑھی عورت نے مہرالنساء کو بتاتے ہوئے کہا۔

''آپ اس شخص کا نام جانتی ہیں؟'' مہرالنساء نے پوچھا تو اس عورت نے نفی میں سر ہلایا۔ مہرالنساء نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ کار میں سوار ہوگئی۔

''آپ مجھے ایم کیو فلیٹ ڈراپ کرو گے' اس کے بعد میرے گاؤں جاؤ گے اور میری دوست تبسم کو پک کرو گے۔'' مہرالنساء نے گل خان سے کہا تو اس نے ''اوکے'' کہہ دیا۔

❖❖❖❖

مہرالنساء اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اپنی ملازمہ کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ ملازمہ لاؤنج میں فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر خراشیں تھیں البتہ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

''تانیہ! کیا ہوا؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''اجالا آئی تھی' اس نے جن چیزوں کو استعمال کیا تھا وہ ساری چیزیں لے گئی' میں نے اس کے خلاف مزاحمت کی اور اسے روکنے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے بہت پیٹا۔'' ملازمہ نے مہرالنساء کو بتایا۔

''وہ گھر میں داخل کیسے ہوئی تھی؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''وہ پہلے چھت پر آئی تھی اور پھر سیڑھیوں کے دروازے کا لاک توڑ کر اندر آگئی تھی'' ملازمہ نے مہرالنساء کے سوال کا جواب دیا۔

''مطلب اجالا وہ ساری چیزیں لے گئی جن پر اس کے فنگر پرنٹس تھے۔'' مہرالنساء بڑبڑائی اور پھر اپنے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ قاسم کی تصویر بھی غائب تھی۔

''مہرالنساء! تمہیں گھبرانے کی بجائے ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا' دشمن چاہے کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو لیکن تمہاری ہمت اور ذہانت سے وہ ضرور شکست کھائے گا۔'' مہرالنساء نے کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے سوچا۔

''مہرالنساء! تم بساط گر ہو اور ایک بساط گر ہمیشہ جیتتا ہے' تم بھی بہت جلد جیتو گی' ہار تمہارے دشمنوں کا مقدر ہو گی'' مہرالنساء اپنی سوچوں میں خود سے مخاطب تھی کہ اس کی سماعت سے تبسم کی آواز ٹکرائی تھی۔ تبسم نے چہکتی آواز میں السلام وعلیکم کہا تھا۔ مہرالنساء اس سے لپٹ گئی اور اس کا حال احوال دریافت کیا۔

''تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟'' رسمی گفتگو کے بعد تبسم نے مہرالنساء سے پوچھا تو مہرالنساء نے اجالا کے متعلق ساری تفصیل بتا دی۔

''اجالا اب ملک ہشام کے پاس جائے گی اور اسے بتا دے گی کہ میں نے فارم ہاؤس پر دو حملے کروائے تھے۔'' مہرالنساء نے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ملک ہشام سے ڈر رہی ہو؟'' تبسم نے مہرالنساء سے پوچھا۔

''میں ملک ہشام سے نہیں ڈرتی لیکن خوف اس بات کا ہے کہ ملک ہشام اجالا کو اب میرے خلاف استعمال کرے گا اور اجالا کا مقابلہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔'' مہرالنساء نے تبسم کو بتاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں عشرت کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے' جب اجالا ملک ہشام کے گھر جائے تو شاید عشرت اس سے نمٹ لے یا اس کا کام تمام کر

دے۔'' تبسم نے مہر النساء کو تجویز دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے پچھلی ملاقات میں عشرت سے کہا تھا کہ اگر کوئی ضروری اطلاع ہو تو وہ تم سے رابطہ کرے گی مگر اس نے تم سے رابطہ نہیں کیا۔'' مہر النساء نے تبسم سے کہا۔

''میں کوشش کر کے اس سے رابطہ کرلوں گی اور اسے صورت حال سے آگاہ کردوں گی۔'' تبسم نے کہا۔

''تم یہاں بیٹھو' میں تانیہ کو کھانا تیار کرنے کا کہہ دوں۔'' مہر النساء نے تبسم سے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

دو دن بعد ناہید بیگم کو اسپتال سے چھٹی مل چکی تھی۔ ملک ہشام نے کوٹھی کی تمام چھوٹی بڑی دیواروں پر چراغ روشن کیے تھے۔ ناہید بیگم کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں قدرتی پھول بچھائے گئے تھے جبکہ راہداری کی دیواروں کو مصنوعی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ کمرے کو رنگ برنگی چھوٹی لائٹوں سے روشن کیا گیا تھا۔ جب ناہید بیگم صحن اور راہداری سے گزر کر اپنے کمرے میں پہنچی تو اس کی حیرت انتہا پر تھی۔ ناہید بیگم بیڈ پر بیٹھ گئی اور ملک ہشام کی طرف دیکھا۔ ملک ہشام مسکرا رہا تھا۔ ناہید بیگم تندرست ہو چکی تھی اور ملک ہشام ناہید بیگم کی صحت یابی پر بہت خوش تھا۔ ملک ہشام کی بیٹی عبیدہ ناہید کے پاس بیٹھ گئی جبکہ عشرت بیڈ کراؤن کے ساتھ فرش پر کھڑی تھی۔ وہ ملک ہشام اور عبیدہ کو کوفت سے دیکھ رہی تھی۔ ایک ملازمہ آئی اور ملک ہشام اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''ایک لڑکی آئی ہے وہ اپنا نام اجالا بتا رہی ہے' وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔'' ملازمہ نے ملک ہشام سے کہا۔

''اسے مہمان خانے میں لے جاؤ' ہم اپنی بیگم کی خیریت دریافت کر کے آتے ہیں۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ملازمہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

''بیٹی! ناہید بیگم کی پسند کے کھانے تیار کراؤ میں مہمان خانے میں جو لڑکی آئی ہے اس سے ملاقات کرلوں۔'' ملک ہشام نے اپنی بیٹی عبیدہ سے کہا۔

''امی جان! آپ کو پاپا کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' عبیدہ نے ناہید بیگم سے پوچھا۔

''اگر کھانا ملازمہ تیار کرے گی تو میں ملک صاحب کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی اور اگر بیٹی عبیدہ خود کھانا تیار کرے گی تو پھر مجھے ملک صاحب کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' ناہید بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی جان! آپ کی خواہش بہت عجیب ہے لیکن ایسی بھی بات نہیں ہے کہ مجھے کھانا بنانا نہ آتا ہو۔'' عبیدہ نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ملک ہشام اور عبیدہ کے جانے کے بعد ناہید بیگم نے عشرت کی طرف دیکھا تو وہ بھی کمرے سے باہر گئی اور دو سے تین منٹوں بعد وہ دوبارہ کمرے میں واپس آئی۔

''ملک صاحب کے کمرے کے آس پاس کوئی بھی نہیں ہے اور کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔'' عشرت نے ناہید بیگم کو بتاتے ہوئے کہا تو ناہید بیگم بیڈ سے اٹھی اور کپڑوں والی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بیوٹی باکس کھولا اور اس میں سے مربعی شکل کے تین چھوٹے باکس دیئے۔

''ان کو ملک صاحب کے کمرے میں خفیہ جگہوں پر لگا دو۔'' ناہید بیگم نے چھوٹے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو عشرت نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے چلی گئی۔ چند منٹوں بعد عشرت دوبارہ ناہید بیگم کے کمرے میں واپس آگئی۔ اس نے سر کے اشارے سے ناہید بیگم کو بتایا کہ کام ہوگیا ہے۔

❖❖❖❖

ملک ہشام مہمان خانے میں پہنچا تو اجالا نے اسے سلام پیش کیا۔

''آپ کون ہو اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟'' رسمی گفتگو کے بعد ملک ہشام نے پوچھا۔

''آپ نے برسوں پہلے حلیمہ نامی ایک عورت سے شادی کی تھی اور حلیمہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا تو آپ نے اپنی اس بیٹی کا نام عزیزہ رکھا تھا۔'' اجالا نے کہا۔

''لڑکی! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے'' ملک ہشام نے تلخ لہجے میں اجالا سے کہا۔

''آپ پہلے میری بات تو مکمل ہونے دیں' میری بات مکمل ہونے کے بعد آپ کو سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں

پڑے گی۔'' اجالا نے مغموم لہجے میں کہا تو ملک ہشام نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنی بات مکمل کرے۔

''آپ مقصودہ بیگم کے ساتھ کراچی گئے اور جب آپ واپس آئے تو آپ کو بتایا گیا تھا کہ حلیمہ اپنی بیٹی کے ساتھ میکے جا رہی تھی اور راستے میں اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی' آپ کو بتایا گیا تھا کہ فائرنگ کی وجہ سے حلیمہ اور اس کے ڈرائیور کی موت ہوگئی تھی جبکہ عزیزہ کو گمشدہ قرار دیا گیا تھا' آپ کو جو کچھ بتایا گیا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔'' اجالا نے ملک ہشام کو بتایا۔

''تو پھر سچ کیا تھا؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

❖❖❖❖

عشرت ہاتھ میں فون پکڑے ناہید بیگم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے فون کی اسکرین جگمگانے لگی۔ تبسم کی کال آ رہی تھی۔ عشرت نے کال اٹینڈ کی اور ناہید کے کمرے میں جانے کی بجائے دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''عشرت! اپنا پرانا فون چیک کرو' مہر النساء نے تمہیں بہت اہم میسجز سینڈ کیے ہیں۔'' تبسم نے کہا اور کال منقطع کر دی تو عشرت ایک پرانے صندوق کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک پرانا سا فون نکالا۔ فون آن کیا تو اس پر بہت سے ٹیکسٹ میسجز آئے تھے' اس نے پہلا میسج کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ ملک ہشام کے گھر میں اجالا نامی لڑکی آئی وہ ملک ہشام کی بیٹی ہے۔

دوسرے میسج میں لکھا تھا کہ اجالا کے پاس تمہاری عزیز دوست کے کچھ راز ہیں' اجالا وہ راز ملک ہشام کو بتانا چاہتی ہے' تم اجالا کو قتل کر دو یا اغواء کر کے اپنی عزیز دوست کے پاس لے جاؤ تاکہ وہ ملک ہشام کو کوئی راز نہ بتا سکے۔

تیسرے میسج میں لکھا تھا کہ اگر تم اجالا کو اغواء کر لو تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اگلا میسج کچھ یوں تھا۔ جامع مسجد' ٹیکسی نمبر چھ سو نو

باقی کے تین میسجز خالی تھے۔

عشرت نے صندوق سے ایک بڑا سا خنجر نکالا اور اپنے دوپٹے کے پلو کے نیچے چھپا لیا۔ اپنا پرس لینے کے بعد وہ ناہید بیگم کے کمرے میں گئی۔ ناہید بیگم بیڈ پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھی۔

''جو میں کرنے جا رہی ہو یہ فون ثابت کرے گا کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' عشرت نے نوکیا کا فون ناہید کی طرف پھینکتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گئی۔ ناہید بیگم نے متعجب نگاہوں سے اس کی پشت کو دیکھا۔ عشرت کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ ناہید نے تسبیح تکیے کے پاس رکھی اور عشرت کا پھینکا ہوا فون لے کر تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلی گئی۔

❖❖❖❖

''تو پھر سچ کیا تھا؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

''سچ یہ تھا بخشو نے حلیمہ کو مقصودہ بیگم کے کہنے پر قتل کیا تھا اور حلیمہ کی دو سالہ بیٹی عزیزہ یعنی مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ دیا تھا۔'' اجالا نے ملک ہشام کو بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخشو تو میرا وفادار تھا۔'' ملک ہشام نے تبصرہ کیا۔

''وہ آپ کا نہیں بلکہ مقصودہ بیگم کا وفادار تھا' بخشو نے مجھے ساری حقیقت خود بتائی تھی۔'' اجالا نے کہا۔

''بخشو نے یہ سب تمہیں کب بتایا تھا؟'' ملک ہشام نے پوچھا تو عشرت کمرے میں داخل ہوئی تو ملک ہشام اس کی جانب متوجہ ہوا۔ عشرت اجالا کے پہلو میں بیٹھی تو ملک ہشام کو لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ عشرت نے انتہائی چستی سے اجالا کی بائیں کلائی پکڑی اور اسے پیچھے کر کے لے گئی جبکہ اجالا کا چہرہ دیوار کی طرف مڑ گیا۔ اجالا نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو عشرت نے اس کی گردن پر خنجر رکھ دیا۔

''ملک صاحب! اگر ایک قدم میری طرف بڑھایا تو تمہاری اس بیٹی کی گردن کاٹ دوں گی۔'' عشرت نے غراتے ہوئے کہا۔ اجالا نے کلائی چھڑوانے کی کوشش کی تو عشرت نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا اور اجالا کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ اگلے لمحے ناہید بیگم کمرے کے اندر آئی اور اس نے صورت حال کا جائزہ لیا۔

''عشرت! یہ کیا کر رہی ہو' تم پاگل ہوگئی ہو' چھوڑو اس لڑکی کو۔'' ناہید بیگم نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تو ملک ہشام نے گارڈز کو بلا لیا۔ گارڈز نے بندوقیں عشرت کی جانب تان لیں۔

''ملک صاحب! ہتھیار ڈلوایئے ورنہ میں اس کی

گردن کاٹ دوں گی۔'' عشرت ایک بار پھر غرائی جبکہ اجالا کی چیخ سن کر ملک ہشام اور ناہید بیگم خوفزدہ ہوگئے اور ملک ہشام نے گارڈز کو ہتھیار پھینکنے کے لیے اشارہ کیا تو گارڈز نے اپنا تمام اسلحہ فرش پر رکھ دیا جبکہ اجالا نے خود کو عشرت کی گرفت سے آزاد کروانے کی بھرپور کوشش کی لیکن عشرت کی گرفت پہلے سے مضبوط ہوگئی اور اجالا کی گردن سے خون رسنے لگا تھا۔

''میرے ساتھ چل ورنہ تجھے ذبح کر دوں گی۔'' عشرت نے اجالا کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''بابا! آپ پریشان مت ہونا' میں بہت جلد آپ کے پاس واپس آؤں گی۔'' اجالا نے ملک ہشام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جبکہ عشرت اجالا کو دھکیلتے ہوئے لے گئی۔ جونہی وہ کمرے سے باہر گئی تو گارڈز نے اپنا اسلحہ اٹھایا اور وہ بھی کمرے سے نکل گئے۔ ملک ہشام کی کوٹھی سے نکلنے کے بعد عشرت اجالا کو گاؤں کی جامع مسجد کی طرف لے گئی جہاں پر ایک کار موجود تھی۔ ملک ہشام کے گارڈز عشرت کے پیچھے آرہے تھے۔ کار کے پاس کھڑے نقاب پوش شخص نے ایک گیند نما گولہ گارڈز کی طرف پھینکا۔ گولہ زمین پر گرتے ہی بغیر آواز کے پھٹ گیا اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ عشرت اجالا کو کار کے پاس لے گئی تو نقاب پوش نے اجالا کے منہ پر رومال رکھا اور وہ چند سیکنڈز میں بے ہوش ہوگئی۔ جب دھواں ختم ہوا تو گارڈز نے دیکھا کہ کار جا چکی تھی۔

❖❖❖❖

مہرالنساء بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

''مہرالنساء! تم فکر مت کرو' سب اچھا ہوگا۔'' تبسم نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''تبسم! اجالا پیشہ ورانہ اور خطرناک قاتلہ ہے وہ عشرت کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے اور پھر گل خان کا فون بھی بند ہے۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''میں عشرت کو فون کروں؟'' تبسم نے پوچھا تو مہرالنساء نے منع کر دیا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام بہت غصے میں تھا تو اس کی بیٹی عبیدہ نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ جب وہ بیٹھا تو ملازمہ نے پانی کا گلاس ملک ہشام کی جانب بڑھایا۔ ملک ہشام نے ملازمہ کو غصے سے دیکھا اور پانی کا گلاس سامنے والی دیوار پر پھینک دیا تو ناہید بیگم ملک ہشام کے پاس بیٹھ گئی۔

''جو کچھ ہوا ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' ناہید نے کہا تو ملک ہشام نے اسے عصیلی نگاہوں سے گھورا۔

''یہ فون اس بات کا ثبوت ہے کہ جو کچھ عشرت نے کیا اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے' اس فون میں کچھ میسجز ہیں جو ہمیں عشرت کو استعمال کرنے والے تک پہنچا سکتے ہیں۔'' ناہید بیگم نے کہا تو ملک ہشام نے ناہید بیگم سے فون لے لیا۔

''آپ کو یہ فون کہاں سے ملا؟'' ملک ہشام نے ناہید بیگم سے پوچھا۔

''عشرت نے دیا تھا۔'' ناہید نے جواب دیا تو ملک ہشام انباکس کھول کر میسجز پڑھنے لگا تھا۔ اب اس کا غصہ بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

''میسجز بھیجنے والا آپ کا بھی دشمن ہے۔'' ملک ہشام نے انباکس میں آئے تمام میسجز پڑھنے کے بعد ناہید بیگم سے کہا تو ناہید نے ہشام کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے صرف وہ میسجز پڑھے ہیں جو آج بھیجے گئے ہیں لیکن انباکس میں اور بھی بہت سے میسجز ہیں۔'' ملک ہشام نے کہا اور فون دوبارہ ناہید بیگم کو دے دیا۔ ناہید میسجز پڑھنے میں مصروف ہوگئی جبکہ ملک ہشام نے ایس ایچ او منیر کا نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگا لیا۔

❖❖❖❖

عشرت اور گل خان اجالا کو مہرالنساء کے پاس لے آئے تھے۔ مہرالنساء اب اجالا کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ گل خان نے اجالا کو صوفے پر لٹا کر اسے زنجیروں سے جکڑ دیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اجالا کو ہوش آیا تو مہرالنساء نے تبسم' عشرت اور گل خان کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور خود کرسی کھینچ کر اجالا کے روبرو بیٹھ گئی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

نجات دہندہ

مونا شہزاد

حدیث ہے کہ اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو، اگر ہم اپنے ارد گرد کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت واضح نظر آتی ہے ہم ہر شعبے میں کیوں زوال پذیر ہیں۔
فرسودہ نظام کا ایک بھیانک چہرہ جو معاشرے میں ایک ناسور کی شکل اختیار کرے ہمارے چہروں پر ہمیشہ سیاہی مل دیتا ہے۔

ایک بہادر عورت کی روداد جس نے اپنے عزم سے دنیا کی غلیظ مافیا کو شکست سے دوچار کر دیا تھا

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج بین الاقوامی حقوق نسواں کی تنظیم ''ہم ایک ہیں'' کو ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر سرٹیفکیٹ ایوارڈ اور مالی مدد سے نوازا جا رہا تھا۔ پچیس سال کے طویل عرصے میں اس تنظیم نے دنیا کے ہر حصے میں عورتوں کے حقوق کے لیے بے مثال خدمات سرانجام دی تھیں۔ دنیا بھر میں کئی عورتوں کے تعلیمی ادارے، اسپتال، این جی اوز، روزگار کی ایجنسیز ان کے بینر تلے کام کر رہی تھیں۔ کشمیر کی عورت ہو یا روہنگیا کی یہ تنظیم بلا تعصب سب کے لیے آواز بلند کرتی تھی۔ یہ تنظیم دنیا کے ہر حصے میں جنسی استحصال کا شکار عورتوں، بکنے والی غلام عورتوں کے حقوق کے لیے بلکہ گویا صنف نازک پر کی جانے والی ہر زیادتی کے خلاف آواز اٹھاتی تھی۔ ان کا نعرہ ہم ایک ہیں تھا۔ آج جب تنظیم کی روح رواں گلوریا واٹسن کو اسٹیج پر بلا کر ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ دیا گیا تو اس باوقار خوبصورت خاتون کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے تالیاں بجاتے اور اس کے احترام میں کھڑے حاضرین کو دیکھا اور مائک پکڑ کر بولی۔

''آج اس ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ کی وصولی صرف میری فتح نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی عورتوں کی فتح ہے۔ صنف نازک کو دنیا میں ہر دور میں استحصال کا سامنا رہا ہے۔ آج میں آپ سے اپنی ذاتی زندگی کا وہ واقعہ شیئر کرتی ہوں جس نے مجھے عورتوں کی لیڈر گلوریا واٹسن میں تبدیل کیا۔ پچیس سال پہلے مجھ پر اور کئی عورتوں پر گزری وہ قیامت جس نے ہمیں تراش کر ہیرے میں تبدیل کر دیا۔''

گلوریا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے فلیش بیک چل پڑا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ پچیس سال پیچھے چلی گئی ہو۔

''اس موضوع پر بات کرنا آج بھی اتنا ہی مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ جتنا پچیس سال پہلے دشوار تھا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اس وقت میرے کیا محسوسات تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تھا تو میرا سانس ایک لمحے کے لیے بے ترتیب سا ہو گیا تھا۔ مجھے بس اتنا یاد آیا تھا کہ میں خلا میں معلق تھی۔ اس وقت میرے حواس اس قدر منتشر اور پریشان تھے کہ میں دن رات کی تمیز بھول گئی تھی۔ مہیب اندھیرا مجھے نگلنے کو بے تاب تھا۔ اندھیرے میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی کھائے ہوئے اڑتالیس گھنٹے سے بھی شاید زیادہ ہی ہو چکے تھے۔ میرے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، زبان سوکھ کر چمڑا بن چکی تھی۔ مجھے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ میری پانی کی بوتل شاید ابھی بھی میرے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے بے تابی سے اپنے گلے میں لٹکی پانی کی بوتل کو منہ لگایا مگر اس میں بھی پانی ختم ہو چکا تھا۔

مجھے اس لمحے میں کھانے اور پانی کی قدر ہوئی تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ خوراک اور پانی خداوند کی عطا کردہ کتنی بڑی نعمتیں تھیں۔ میرا دل بری طرح متلا رہا تھا تاریک قبر کا تلاطم بتا رہا تھا کہ میں شاید سمندر میں سفر کر رہی تھی یا کسی دریا

Pakistanipoint.com

میں۔ مگر میں کیسے یہاں تک پہنچی تھی اس کا اندازہ مجھے ہرگز نہیں تھا۔ میرا دماغ ابھی بھی کیف وسرور کے مرغولوں میں گم تھا مجھے پتا تھا کہ اس کی وجہ وہ نشہ تھا جو مجھے زبردستی دیا گیا تھا۔ میرا جسم اکڑ کر تختہ ہو چکا تھا۔ میں نے ٹانگیں سیدھی کرنی چاہیں تو وہ ایک اور انسانی جسم سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی میری جیسی ایک عورت ہی تھی۔

ہاں عورت..... یہ سارا عذاب اس جنس کا ہی تو تھا' مجھے پتا تھا کہ مجھے عورت ہونے اور پھر خوبصورت ہونے کی سزا دی جارہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میری زندگی اب ایسے بھیانک خواب میں بدلنے والی تھی جس سے میں بار ہا جاگنے کی تمنا کروں گی مگر جاگ نہیں پاؤں گی۔ میرے دماغ پر ابھی بھی نشے کا اثر تھا مگر میری جبلت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ گلوریا! کچھ عملی قدم اٹھالے اس سے پہلے کے بہت دیر ہو جائے۔ مجھے پتا تھا کہ اس تاریک قبر میں میرے علاوہ بھی کافی ساری عورتیں موجود تھیں میں پچھلے کئی گھنٹوں سے ان عورتوں کی سسکیاں اور آہیں سن رہی تھی مگر ان کی شکلوں سے ناواقف تھی۔ اب تو عورتیں بھی رو رو کر ادھ موئی سی ہو چکی تھیں۔

اس تاریک قبر کی فضا میں سخت تعفن تھا۔ شاید دو یا تین دن گزر چکے تھے اور یہاں حوائج ضروریہ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اس باعث کئی فطری تقاضوں کے حادثات اس ڈبے میں رونما ہو چکے تھے۔ میرا دماغ دھیرے دھیرے ہیروئین کے نشے کے زائل ہونے کے باعث سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں ٹیچر تھی اور اپنی اسکول کی نوکری ختم کر کے باہر نکلی ہی تھی کہ ایک گاڑی میرے پاس رکی تھی۔ اس میں بیٹھا ہوا شخص بہت وجیہہ و شکیل تھا اس نے بہت شائستگی سے مجھ سے پوچھا تھا۔

''مس! آپ مجھے یہ ایڈریس سمجھا سکتی ہیں؟''

میں ایڈریس سمجھانے کے لیے جھکی ہی تھی کہ کسی نے اچانک مجھے پیچھے سے پکڑ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا تھا۔ میں نے چیخنا چاہا تو میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا' میں بہت مچلی اور تڑپی تھی۔ میں جوڈو کراٹے کی ماہر تھی مگر اس اچانک حملے نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے سامنے انجیکشن میں ہیروئین بھری گئی تھی' میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر میرے انکار میں سر ہلانے کے باوجود وہ زہر میری رگوں میں اتار دیا گیا تھا۔

میرے ہوش جاتے رہے تھے اور اب جب سے ہوش آئی تھی تو میں قبر میں کئی اور عورتوں کے ساتھ قید تھی۔ میں اس وقت صرف تیئس سال کی تھی اور میرا شمار بہت ہی حسین وجمیل لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ میں دو دفعہ مس اٹلی بھی رہ چکی تھی۔ میری جلد چمکدار سنہری رنگت کی تھی۔ آنکھیں اور بال بہت سیاہ تھے۔ جسم انتہائی متناسب اور لچکیلا تھا۔ مجھے دیکھ کر صنف مخالف کے دل تھم سے جاتے تھے مگر میں صرف اور صرف شادی کے بعد کے پیار پر یقین رکھتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس وقت تک کنواری تھی۔ میں اچھی بیلے ڈانسر بھی تھی۔ کئی مرد میرے ساتھ کے متمنی تھے مگر میں صرف اور صرف اپنے خوابوں کے شہزادے کی منتظر تھی۔ اس وقت میرا

رنگ وروپ مجھے کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا میں سوچوں کے مدوجزر میں ڈوب ابھر رہی تھی کہ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا میرے قریب کہیں بیٹھی کسی لڑکی نے چیختے ہوئے کہا۔

''دیکھیں اس لڑکی کا سانس بند ہوگیا ہے۔''

تمام عورتوں نے اونچی آواز میں رونا دھونا شروع کردیا۔ کئی تو ہسٹریائی انداز میں چیخیں بھی مار رہی تھیں۔ مختلف زبانیں اور لب ولہجے سن کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ عورتیں مختلف قومیتوں اور رنگ نسل سے تعلق رکھتی تھیں مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ زندان کی ہر روزن تیزی سے بند ہوتی جارہی تھی۔ مجھے پتا چل چکا تھا کہ اگر میں نے جلد ہی کوئی قدم نہیں اٹھایا تو میں ہمیشہ کے لئے باندی بن کررہ جاوں گی۔ میں نے اندازے سے مرنے والی لڑکی کا جسم ٹٹولا اور سی پی آر شروع کردی۔ مگر دس منٹ کی کوشش کے باوجود اس لڑکی کا دل نہیں چلا۔ اس مشقت کے باعث مگر میرے اعصاب مکمل طور پر بیدار ہوچکے تھے۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم سب کو کسی سیکس ٹریفکنگ کرنے والے گروہ نے مختلف ملکوں سے اغوا کیا تھا۔ اب یا تو بین الاقوامی عیاش منڈی میں ہماری نیلامی ہونی تھی یا کسی بڑے سنڈیکیٹ کو ہمیں سپلائی کردیا جانا تھا جو ہمیں نشے کا عادی بنا کر ہمیں جنسی باندیاں بنا کر رکھتا۔ مجھے خوف سے جھرجھری سی آگئی۔ مجھے وہ تمام دستاویزی فلمیں یاد آگئیں جن میں سیکس سینڈیکیٹ کے ظلم وستم اور اس کے شکار خواتین کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ میں جانتی تھی کہ پچھلے کچھ سالوں سے یورپ کے بڑے ممالک میں یہ کاروبار بہت ترقی پارہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان سنڈیکیٹ میں کام کرنے والی عورتوں کی زندگی بھیڑ بکریوں سے بھی بدتر بنا دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے انھیں نشے کی لت لگا کر ان کی قوت ارادی توڑ دی جاتی تھی۔ پھر انھیں ایک شے کی طرح روز نت نئے گاہکوں کو بیچا جاتا تھا ان کی کمائی سے لے کر ان کی سانسوں تک کسی پر بھی ان عورتوں کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ جب کبھی ان عورتوں کو کوئی موذی بیماری یا ایڈز لاحق ہوجاتی تھی تو ان کو کسی ویرانے میں مار کر دبا دیا جاتا تھا۔ یہ سب سوچ کر مجھے خوف سے جھرجھری سی آگئی۔ میں نے اونچی آواز میں انگریزی میں کہا۔

''خدارا......! ماتم کرنا بند کرو۔ یوں رونے دھونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ خدا بھی ان کی مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے۔''

تمام عورتوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایک عورت ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی۔

''ہم کیا کرسکتی ہیں؟''

میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی اچانک میرے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی میں نے اسے اٹھایا وہ ایک پرس تھا۔ میں نے بے تابی سے اس میں ہاتھ مارا تو مجھے ایک پینسل فلیش لائٹ ملی۔ میں اسے جلایا گھپ اندھیرے میں روشنی کی پتلی سی لکیر بھی کافی تھی۔ میں نے اپنے سر کے بالوں سے پن اتاری اور مشاقی سے کنٹینر کے دروازے کے تالے کو کھولنے پر جت گئی۔ پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا اور اپنی ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب لڑکھڑاتی ہوئی' کانپتی ہانپتی میرے پیچھے پیچھے باہر نکل آئیں۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر ہی مجھے اپنا لیڈر مان لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہم سب ایک بحری جہاز پر موجود تھے۔ جہاز پر بے شمار کنٹینرز لدے ہوئے تھے۔ ملگجے اندھیرے میں میں نے اپنی ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ مختلف رنگ ونسل کی خواتین میرے سامنے موجود تھیں۔ سب عورتوں کی حالت بھوک اور پیاس کے باعث خراب تھی مگر ان سب عورتوں میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ بلاشبہ حسین وجمیل عورتیں تھیں۔ ان کا حسن وشباب بہت بھرپور تھا۔ میں نے ان عورتوں کو اکٹھا کیا اور بولی۔

ہم بے شک ایک دوسرے کے لیے اجنبی سہی مگر ہمیں مشکل صورت حال نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ ہماری بقا کا انحصار ہمارے اکٹھے ہونے میں ہے۔ اگر ایک دفعہ یہ جہاز خشکی پر پہنچ گیا اور ہمارے خریدار تک ہم پہنچ گئے تو پھر آزادی کا خواب ہماری آنکھوں سے نوچ لیا جائے گا۔ یہ جہاز ہماری راہ فرار کا ذریعہ ہے۔ ایک باہمت عورت آگے آکر بولی۔

''بتاؤ! ہم کیا کرسکتی ہیں؟''

''ہم آخری سانس تک اپنی آزادی کے لیے لڑیں گی۔''

''میں نے ٹھنڈا سانس لیا اور پوچھا۔تم میں سے کتنی عورتیں جوڈو کراٹے جانتی ہیں؟''

دس کے قریب عورتوں نے ہاتھ بلند کیے۔ میں نے انھیں دو گروہوں میں تقسیم کردیا۔ پھر میں نے پوچھا۔

''تم میں سے کتنی ہتھیار چلانا جانتی ہیں؟''

آٹھ عورتوں نے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے انھیں بھی دو گروہوں میں تقسیم کردیا۔ میں نے تمام عورتوں کو چند اہم ہدایات دیں۔ کچھ عورتوں نے اردگرد پڑے بھاری ڈنڈے' زنجیریں اور رسیاں پکڑلیں۔ اب میری سربراہی میں تمام عورتیں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر عرشے پر آپہنچیں۔ دو ملاح سامنے عرشے پر کھڑے باتیں کررہے تھے۔ جوڈو کراٹے جاننے والی ٹیم نے انھیں بے خبری میں جالیا اور بے دست و پا کرکے زینے کی طرف کھینچ لائیں۔ کچھ عورتوں نے عرشے پر پڑی رسی سے ان کی مشکیں کس دیں۔

میرے دو تھپڑ کھا کر وہ فرفر طوطے کی طرح بول پڑے۔ پتا چلا کہ جہاز میں آٹھ کے قریب لوگ مزید موجود تھے۔ جہاز کی منزل امریکا تھی۔ جہاز کا عملہ اغوا شدہ عورتوں کے وجود سے واقف تھا مگر انھیں اس کنٹینر کو کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے انھیں ٹھوکر مار کر پوچھا۔

''امریکا پہنچنے میں کتنی دیر ہے؟''

ملاحوں نے بتایا کہ صبح تک وہ ہیوسٹن پہنچ جائیں گے۔ میرے اشارے پر عورتوں نے ان ملاحوں کو اسی کنٹینر میں بند کردیا جہاں سے خود انھیں آزادی ملی تھی۔ میں نے اپنی ساتھی عورتوں کو مختلف ٹولیوں میں بانٹا اگلے دو گھنٹے میں ہم تمام عملے کو گرفتار کرچکی تھیں۔ اب جہاز کے کپتان کے علاوہ باقی کا عملہ اسی اندھیری قبر میں قید تھا جہاں ہم نے اڑتالیس گھنٹوں سے بھی زیادہ کا وقت گزارا تھا۔

میرے اشارے پر کپتان کی مشکیں باندھ دی گئی تھیں۔ اسی اثناء میں ایک ریڈیو آپریٹر خاتون نے جہاز سے SOS کا پیغام بھیج دیا۔

دوسری طرف سے یقین دہانی کروائی گئی کہ مدد جلد پہنچ رہی ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ تمام عورتوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کیسے کھل سے گئے تھے۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ ابتلا کی رات گزر چکی ہے۔ میں نے تمام عورتوں کو مخاطب کرکے کہا۔

''آج ہم تو امداد باہمی اور قسمت کی یاوری سے بچ گئے اور سیکس سینڈیکیٹ کی غلامی میں نہ آسکے۔ مگر ہماری جیسی لاتعداد عورتیں اس سے بھی بدترین غلامی کا شکار ہیں' کہیں ان کو عورت ہونے کے باعث تعلیم اور صحت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ تو کسی ملک میں انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح صرف شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے۔ کہیں عورت اغوا ہوکر قحبہ خانوں کی زینت بنادی جاتی ہے تو کہیں صرف اسے بچے پیدا کرنے کی مشین بنا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وقت آگیا ہے کہ ہم بین الاقوامی حقوق نسواں تنظیم کی بنیاد رکھیں اور دنیا بھر کی مظلوم عورتوں کی آواز بنیں کیونکہ ہمارا رنگ و نسل' قد و قامت' مذہب و ثقافت چاہے علیحدہ علیحدہ کیوں نہ ہو اس کے باوجود ہم ایک ہیں کیونکہ ہم صنف نازک ہیں۔

تمام عورتوں نے میرے ساتھ نعرے لگائے اور ہامی میں سر ہلائے۔ جلد ہی مدد آپہنچی۔ ساحل پر پہنچ کر اپنے حواس بحال کرنے کے بعد ہم سب نے تمام تفصیلات انٹرپول کے گوش گزار کردیں جو جہاز کے کپتان سے ہمیں ملی تھیں۔ عینی گواہوں اور شواہد کی مدد سے بین الاقوامی سطح پر بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عملدرآمد میں آئیں اور پتا چلا کہ اس قبیح فعل کے پیچھے کئی بڑے بڑے نام اور کئی ملکوں کے لیڈران بھی ملوث تھے۔ اس روز میں نے اور میرے ساتھ اغوا ہونے والی خواتین نے ''ہم ایک ہیں'' نامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ ہم نے عورتوں کے حقوق کی بحالی کے لیے کام شروع کردیا۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ ہمارے مالی وسائل اور پراجیکٹس میں اضافہ ہوتا گیا اور آج اسی تنظیم کو اقوام متحدہ کی اس کانفرنس میں ایوارڈ' سرٹیفکیٹ اور معاشی امداد سے نوازا گیا ہے۔

گلوریا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ ضرور تھی مگر اس کا سر فخر سے بلند تھا۔

اس کی تقریر کے اختتام پر تالیوں کی گونج سے ہال گونج اٹھا۔ کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آج صنف نازک اپنے حقوق منوانے میں عالمی سطح پر کامیاب جو ہوگئی تھی۔

ناقابل فراموش

شہزاد خان

رات کے سناٹے میں سامنے نظر آنے والے منظر نے ان کے جسموں کو منجمند کردیا تھا اور وہ آنکھیں جھپکنا بھول گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شہر سے دور دراز اس ویران قبرستان میں ایسا منظر بھی دیکھنے کو ملے گا۔

زیر نظر کہانی بھی ایسی ہی ہے جس کی ہر سطر آپ کو لمحہ بہ لمحہ خوف طاری کردے گی تو وہیں خون کو مجنمد کردینے والے پے در پے واقعات خوف کی سرد لہر آپ پر لرزہ طاری کردینے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔

ایک ایسے شہر کی داستان جہاں خوف کا ایسا راج تھا کہ ہر انسان ایک دوسرے سے خوف زدہ تھا

صبح سے ہی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے ان کے تیور بتا رہے تھے کہ آج ضرور جل تھل ہوگا۔ شہر میں صفائی کا یہ حال تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی بارش ہوجاتی تو ہر طرف گندگی اور کیچڑ ہی نظر آتا۔ شہر چھوٹا ہونے کی وجہ سے آبادی بھی زیادہ نہیں تھی صرف ایک اکلوتا بازار تھا جس میں ضروریات زندگی کی تقریباً ہر چیز دستیاب تھی۔ عورتیں اور مرد حضرات اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء کی خریداری کے لئے سارا دن شہر کے اکلوتے بازار میں گھومتے نظر آتے۔ ایک مڈل اسکول تھا جس میں بچے تعلیم حاصل کرتے تھے مزید تعلیم کے لئے شہر کے ضلع کے اسکول یا کالج کا رخ کیا جاتا۔ ایک چھوٹا سا پوسٹ آفس، ایک بنک، ایک ڈسپنسری جس میں ایک ڈاکٹر کی بجائے ایک کمپاؤنڈر خدمات سرانجام دیتا تھا۔ شہر کا واحد کونسلر چوہدری مشتاق ایک میٹرک پاس نوجوان تھا جس کی نوعمری میں شادی ہونے کی وجہ سے اس کا بیٹا اس کا بھائی ہی لگتا تھا۔

شادی کے بعد اس کے نصیب میں ایک بیٹا قاسم اور ایک بیٹی فاطمہ آئی تھی جس کو اس نے اپنے تئیں زندگی کی ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ قاسم اور فاطمہ کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے ان دونوں میں خوب بنتی تھی۔ قاسم شہر کے مڈل اسکول سے تعلیم مکمل کر کے ضلع کے ایک ہائی اسکول میں داخلہ لے کر میٹرک کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب کالج میں ایڈمیشن کے لیے کوشش میں تھا۔ فاطمہ ابھی میٹرک میں ہی تھی اور ان دونوں کو روزانہ ضلع کے بڑے اسکول میں لانے لے جانے کے لئے چوہدری مشتاق نے ایک آٹو رکشہ لگوادیا تھا جس پر وہ دونوں روزانہ آتے جاتے تھے۔ قاسم کا چونکہ ابھی تک کالج میں داخلہ نہیں ہو پایا تھا اس لئے وہ اپنی بہن فاطمہ کے ساتھ روزانہ آٹو رکشہ میں اسے چھوڑنے اسکول جاتا تھا۔

☆---☆---☆

شہر سے تقریباً پچانوے میل کی مسافت پر گاؤں مختار گڑھ تھا۔ چوہدری مشتاق کے بڑوں نے اپنی زمینوں کی باگ ڈور اس کے حوالے کر کے ابدی زندگی کو گلے لگالیا تھا۔ چوہدری مشتاق چونکہ خود شہر میں رہتا تھا اس لئے اس نے اپنی زمینیں اپنے ایک دوست رحمت کے حوالے کردی تھیں صرف اس شرط پر کہ وہ اس کی زمینوں کو آباد رکھے گا اور اس کے عوض اسے اس سے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ رحمت نے بھی اپنا وعدہ خوب نبھایا تھا وہ اس کے انکار کے باوجود ہر فصل پر اس کے لئے اناج اور گڑ شکر وغیرہ باقاعدگی سے بھجواتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے ان زمینوں کو اپنے خون پسینے سے سینچا تھا اور اس کی اس محنت کا منہ بولتا ثبوت سرسبز اور لہلہاتی فصلیں تھیں۔ گاؤں کا ہر شخص اس کی محنت کی داد دیتا تھا۔ رحمت کی ایمانداری کی وجہ سے گاؤں کا ہر شخص حتیٰ کہ

وہاں کا نمبردار بھی اس کی عزت کرتا تھا۔ کبھی کبھار چوہدری مشتاق بھی گاؤں کا چکر لگالیتا اور اس طرح رحمت کو ملنے کے ساتھ ساتھ اپنی زمینوں کو بھی دیکھ آتا اور ہر بار اس کے چہرے پر ایک خوشی پھیلی صاف نظر آجاتی جو اسے اپنی زمینیں دیکھ کر ہوتی۔ رحمت نے اپنا وعدہ بخوبی نبھایا تھا اور جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بہت مطمئن تھا۔

☆---☆---☆

ایک روز قاسم اپنی بہن فاطمہ کو اسکول چھوڑ کر واپس آٹو رکشہ میں گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ ایک ہجوم سا دکھائی دیا لوگ ایک دائرے کی صورت میں گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور کافی شور برپا تھا۔ قاسم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی آٹو رکشے والے نے یکدم بریک لگا کر رکشہ ایک جانب کھڑا کیا اور جلدی سے نیچے اتر کر ہجوم کی جانب دوڑا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آکر قاسم کو کچھ بتایا جسے سن کر قاسم بھی جلدی سے اتر کر اس ہجوم کی جانب لپکا۔ نیچے زمین پر ایک پندرہ سولہ سالا لڑکا بری طرح زخمی حالت میں تڑپ رہا تھا اور لوگ اسے ڈسپنسری لیجانے کی بجائے کھڑے شور شرابا کرنے میں مصروف تھے۔ قاسم نے آٹو رکشے والے کی مدد سے جلدی سے اسے زمین سے اٹھا کر رکشے کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور خود بھی پیچھے بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا گو اس طرح کرنے سے اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے تھے لیکن اس نے اس کی کوئی پروانہ کی بلکہ اسے اس لڑکے کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر بہت فکر ہو رہی تھی کافی دیر تک زمین پر پڑا رہنے کی وجہ سے اور خون بہنے کی وجہ سے اب اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔

شہر چھوٹا ہونے کی وجہ سے جلد ہی وہ اس کی اکلوتی ڈسپنسری پر پہنچ گئے۔ آٹو رکشے والا جلدی سے رکشہ اس کے سامنے کھڑا کر کے اندر کی جانب بھاگا اور کچھ ہی دیر میں وہ ڈسپنسر کو ساتھ لیے رکشے کی جانب بڑھتا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر اس نے اس کی حالت دیکھتے ہی اسے فوراً ڈسپنسری کے اندر لیجانے کے لئے کہا اور خود بھاگتا ہوا ایک جانب بنے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ قاسم اور آٹو رکشے والے نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور ڈسپنسری کے اندر لیجا کر ایک بیڈ پر لٹا دیا۔ چھوٹی سی ڈسپنسری میں اس کمپاؤنڈر کے علاوہ ایک عیسائی نرس بھی تھی جس کی عمر تقریباً پینتالیس سال کے لگ بھگ ضرور ہو گی۔ اس نرس نے جلدی سے اس کی نبض چیک کی اور ایک طرف رکھی کپاس سے اس کے زخم صاف کرنے لگی۔ زخم زیادہ گہرے نہیں تھے لیکن مسلسل خون نکلنے کہ وجہ سے اس کا لباس تقریباً خون سے بھر چکا تھا۔ زخم صاف کرنے کے بعد اس کی مرہم پٹی کر کے نرس ان کی طرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی۔

''یہ پولیس کیس ہے ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہو گی۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی اور کچھ ہی دیر میں اسی کمپاؤنڈر کیساتھ دوبارہ برآمد ہوئی۔

وہ دونوں اس کی جانب بڑھتے آرہے تھے اور اس دوران قاسم اپنے ذہن میں ایک کہانی بنا چکا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا چاہا اور اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی قاسم نے اسے بتایا کہ یہ لڑکا اس کا عزیز ہے اور دوسرے شہر میں رہتا ہے آج چھت پر سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔ اس لیے مہربانی فرما کر اس کے لیے پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس کے یقین دلانے کے بعد کمپاؤنڈر اس کی بات مان گیا اور پھر مرہم پٹی کروانے کے بعد وہ اسے لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆---☆---☆

ریحان، رحمت کا اکلوتا بیٹا تھا یکے بعد دیگرے تین بہنوں کی پیدائش اور ان کے مرنے کی وجہ سے وہ ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ اس کی بہنیں کسی موروثی بیماری کی وجہ سے بچ نہیں پائی تھیں اس لئے پیدائش کے فوراً بعد اس دنیا سے کوچ کر جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کے والدین نے پیروں، فقیروں کے در کھٹکھٹائے اور وہاں جا کر جا کر اپنی حاجت کے لیے وسیلہ بنانے سے اللہ تعالیٰ نے اس غریب کی سن لی اور اس طرح تین بہنوں کے مرنے کے بعد ریحان نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اسکول کو خیر باد کہہ کر اپنے باپ رحمت کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا اور اپنے والد رحمت کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اس نے کبھی بھی اپنے باپ کو اکیلے ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس کی لگن اور فرمانبرداری کو دیکھ دیکھ کر اس کے ماں باپ اس پر جان چھڑکتے تھے اور ہر وقت اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے۔

ریحان کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی اور اس کا ایک دوست

بشیر شہر میں رہتا تھا جس کے والد کا ایک چھوٹا سا کریانہ اسٹور تھا جس میں بمشکل تیس چالیس ہزار روپے کے لگ بھگ سامان موجود تھا اس سے اس کے دوست کے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ بشیر ریحان کا دوست تھا اور ایک روز اس کے بڑے بھائی کی شادی طے پانے پر بشیر نے اسے شہر میں شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی اور اسی سلسلے میں وہ ایک ہفتے سے شہر میں اپنے اس دوست کے گھر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ شادی کے ہنگامے سے فراغت ملتے ہی آج اسے واپس اپنے گاؤں لوٹنا تھا اور اسی سلسلے میں اس نے اپنی ضرورت کی چند اشیاء خرید کر واپسی کی راہ لی۔ بس آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اس لئے اس نے بشیر کو بس اسٹاپ سے یہ کہہ کر واپس گھر بھجوا دیا تھا کہ اس کے گھر والوں کو اس کی ضرورت ہوگی اور وہ خود ہی گاؤں چلا جائے گا۔ چونکہ بس میں کچھ وقت باقی تھا اس لئے اس نے اپنی ضرورت کی چند اشیاء خریدنے میں کچھ وقت گزارا اور دوبارہ واپس بس اسٹاپ کی جانب چل دیا۔

وہ اپنے ماں باپ کے متعلق سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ اچانک ایک جانب سے ایک تیز رفتار کار جن کی طرح نمودار ہوئی اور تیزی سے اسے ٹکر مارتی ہوئی یہ جا وہ جا۔ اچانک اور زوردار ٹکر سے ریحان اچھل کر ایک جانب گرا اور اس کا سر ایک زوردار آواز سے زمین سے ٹکرایا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں موجود پایا۔ اس کے سر اور جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کا سر تکلیف کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ ابھی وہ گزرے حالات کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک نوجوان داخل ہوا جس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک ٹرے میں دودھ کا ایک گلاس او رایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ تھے۔

اسے ہوش میں دیکھ کر اس نوجوان کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ تھی وہ قریب آ کر اس کے پاس بیٹھا اور ٹرے اس کے بیڈ پر رکھ دی۔ تعارف کروانے پر جب ریحان نے اسے اپنے گاؤں اور اپنے والد کے متعلق بتایا تو یہ سن کر کمرے میں آنے والا نوجوان جو قاسم تھا چونک گیا وہ چونکہ خود تو کبھی گاؤں نہیں گیا تھا لیکن اپنے والد چوہدری مشتاق سے یہ ضرور سن چکا تھا کہ گاؤں میں ان کی زمین کی دیکھ بھال رحمت نامی ایک شخص کرتا ہے اور آج جب اس زخمی نوجوان نے بتایا کہ رحمت اس کے والد ہیں تو اسے حیرانی کے ساتھ ساتھ ایک انجانی خوشی بھی ہوئی کہ وہ اس نوجوان کو اپنے گھر لے آیا اور پھر اس نے اپنے والد کو بھی اس کے متعلق بتا دیا یہ سن کر اس کے والد نے اسے اس کا مزید خیال رکھنے کا کہہ کر خود اس کے والد رحمت کو اطلاع دینے کا بندوبست کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

ڈسچارج کے وقت جو ادویات ملی تھیں وہ اس کو باقاعدہ استعمال کروانے سے اسے کچھ افاقہ ہو رہا تھا۔ اس کے والدین کو اطلاع دی جا چکی تھی۔ دوسرے روز اس کا والد رحمت اور اس کی ماں روتے دھوتے ان کے گھر آ پہنچے۔ قاسم کے والدین نے انہیں دلاسہ دیا اور بتایا کہ اب ان کا بیٹا جلدی سے صحت یاب ہو رہا ہے اس لیے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں بار بار ہاتھ اٹھا اٹھا کر قاسم اور اس کے تمام گھر کے افراد کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے جو ان کے اکلوتے بیٹے کے لیے رحمت بن کر آئے ورنہ اس اجنبی شہر میں ان کے بیٹے کا نجانے کیا حال ہوتا۔ ریحان کے زخم چونکہ ابھی مکمل طور پر بھرے نہیں تھے اس لیے چوہدری مشتاق نے اس کے والدین کو دو تین روز کے بعد یہ کہہ کر واپس گاؤں بھجوا دیا کہ صحت یاب ہوتے ہی وہ قاسم کے ساتھ اسے گاؤں بھجوا دے گا۔ اس کے والدین نہ چاہتے ہوئے بھی واپس لوٹ گئے۔

☆---☆---☆

ریحان کو مکمل صحت یاب ہونے میں مزید ایک ہفتہ اور لگا اور اس دوران قاسم اور اسے کے گھر کے تمام افراد نے اسے اپنے گھر کا فرد سمجھ کر اس کا اچھی طرح سے خیال رکھا۔ ریحان ان کے سلوک کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور ان سب کے لیے اس کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔ ایک روز ریحان کے کہنے پر کہ اب وہ مکمل ٹھیک ہو چکا ہے اور اسے اپنے گھر لوٹ جانا چاہیے تو اس کے لاکھ انکار کرنے کے باوجود چوہدری مشتاق نے قاسم کو سختی سے تاکید کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے اور اس کے گاؤں چھوڑ آئے۔ قاسم چونکہ پہلی بار اپنے گاؤں جا رہا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ ریحان کو اس کے گھر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی زمینیں بھی ایک نظر دیکھ لے گا یہ سوچ کر اس نے اپنی تیاری کر لی۔ گاؤں جانے کے لیے انہوں نے بس کی بجائے

Pakistanipoint.com

ٹرین کے سفر کو ترجیح دی۔

ٹرین کا سفر محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس لیے بھی فائدہ مند تھا کہ وہ بس میں مسلسل بیٹھ کر سفر کرنے کی کوفت سے بچنا چاہتے تھے اور ٹرین کا سفر بس کے سفر کی نسبت کہیں زیادہ پرکشش تھا اس لیے وہ ایک انجانی خوشی سے سرشار تھے۔ قاسم کے گھر والوں نے ریحان کو کچھ نئے کپڑے اور کھانے پینے کا کچھ سامان بھی دے دیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کے لیے بھی چند لباس دے دیئے تھے جو ریحان نے اپنے بیگ میں حفاظت سے رکھ لئے تھے۔ قاسم کو ایک اچھی رقم دے کر اس کے گھر والوں نے جلدی واپس آنے کی تلقین بھی کردی۔ قاسم نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ریحان کو چھوڑ کر جلد لوٹنے کی کوشش کرے گا۔

☆---☆---☆

شہر سے گاؤں کا فاصلہ تقریباً پچانوے میل تھا۔ ایک لوکل ٹرین جو تین بوگیوں پر مشتمل تھی وہاں سے سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ روانہ ہوتی تھی اس ٹرین میں سفر کرنے والے زیادہ تر مسافر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو روزانہ اپنے کام کاج کے سلسلے میں گاؤں سے شہر آتے اور دن بھر محنت مزدوری یا خریداری کرنے کے بعد دوبارہ اسی ٹرین سے واپس لوٹ جاتے۔ ٹرین کیا تھی بس ایک کھٹارہ وڈبے کی صورت تھی اس کے آتے ہی مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح اس میں بھر جاتے اور ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی آگے بڑھتی جاتی۔ مسافر اترتے اور کچھ اور مسافر چڑھ جاتے اسی طرح اس ٹرین کا سفر اس کی آخری منزل پر اختتام پذیر ہوتا اور وہ دوبارہ واپسی کے لیے تیار کھڑی ہوجاتی۔ دوپہر کے تقریباً ڈھائی بجے ہونگے جب قاسم اور ریحان نے کھانا کھانے کے بعد چائے پی اور اپنے اپنے بیگ اٹھا کر اور گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر اسٹیشن کی راہ لی۔

اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا ان کے گھر سے تقریباً پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا وہ دونوں باتیں کرتے اسٹیشن جانے والے راستے کی جانب بڑھتے گئے۔ جلد ہی وہ اسٹیشن پہنچ گئے قاسم نے اسے ویٹنگ روم میں بیٹھنے کو کہا اور خود جلدی سے ٹکٹ گھر کی جانب بڑھ گیا۔ ٹکٹ گھر کے آگے لوگ قطار بنائے کھڑے تھے اور جلد ہی اس کی باری بھی آگئی اور اس نے دو ٹکٹ مختار گڑھ کے لیے گاڑی کی روانگی میں صرف پانچ منٹ باقی بچے تھے اس نے جلدی سے ٹکٹ اپنی جیب میں ڈال کر ویٹنگ روم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆---☆---☆

ٹرین روانہ ہونے کے قریب تھی وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے یہ سیٹیں انہوں نے کیسے لی تھیں یہ ایک الگ کہانی تھی بہرحال اس وقت وہ دونوں سیٹوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ٹرین کی صرف تین بوگیاں ہونے کی وجہ سے رش کافی تھا لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں تمام لوگ اپنے پاکستانی ہونے کا ثبوت دے رہے تھے اور گالی گلوچ اور دھکم پیل بھی جاری تھی۔ ان دونوں نے ان آوازوں پر کان دھرنے کی بجائے اپنے سفر اور گاؤں کے متعلق گفتگو کو موضوع بنایا ہوا تھا۔ سامان انہوں نے سیٹوں کے نیچے محفوظ کردیا تھا۔ ٹرین ٹھیک تین بجے ایک وسل کے ساتھ پلیٹ فارم کو چھوڑ چکی تھی اور آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوچکی تھی۔

شہر سے گاؤں کا فاصلہ تقریباً دو سے تین گھنٹے پر مشتمل تھا چونکہ یہ ایک لوکل ٹرین تھی اس لیے اس کی رفتار بھی اس کے حساب سے ہی تھی کیونکہ ہر دس منٹ کے بعد ایک اسٹیشن آجاتا تھا لوکل ہونے کی بناء پر ٹرین ہر اسٹیشن پر رک کر مسافر اتارتی تھی اور کچھ نئے مسافر سوار ہوجاتے تھے۔ وہ دونوں اپنے اندازے کے مطابق شام ساڑھے چھ بجے تک گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچنے کا سوچ رہے تھے اور یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جس طرح ٹرین ہر اسٹیشن پر رکتی تھی اس کے مطابق انہیں کم از کم رات کے ساڑھے سات یا آٹھ ضرور بج سکتے تھے لیکن یہ سوچ کر کہ وہ دونوں ایک ہی جگہ اور گاؤں جارہے ہیں اس لئے گھبرانے کی کوئی وجہ نہ تھی اور ویسے بھی گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور کبھی بھی کوئی غیر مناسب واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے ان کے چہروں پر اطمینان تھا۔ راستے میں بھوک محسوس ہونے پر انہوں نے گھر سے لایا ہوا کھانا اور کچھ پھل کھالیے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے نیند آنے پر لمحہ بھر کو آنکھ لگالی تھی جس کی وجہ سے انہیں تھکن کا احساس تک نہ ہو رہا تھا۔ شام کے پانچ بج چکے تھے لیکن ابھی بھی دوسرے مسافروں سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ تقریباً سات اسٹیشن مزید رہتے ہیں جہاں یہ ٹرین رکے گی۔ انہیں اپنا اندازہ سچ ہوتا

دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اس کے مطابق وہ رات کے آٹھ بجے کے قریب اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچیں گے۔

☆---☆---☆

بخارگڑھ کا ریلوے اسٹیشن ایک سنسان اور ڈراؤنے کھنڈرات کا منظر پیش کر رہا تھا جب وہ دونوں اپنے اپنے بیگ کندھوں پر لٹکائے پلیٹ فارم پر اترے۔ ان کے اندازے کے عین مطابق ٹرین نے ٹھیک سوا آٹھ بجے کے قریب انہیں ان کی منزل مقصود پر پہنچا دیا تھا۔ چھوٹا ریلوے اسٹیشن ہونے کی وجہ سے وہاں روشنی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اکا دکا ٹمٹماتے بلب اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام نظر آتے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر گاڑی کے روانہ ہوتے ہی دوبارہ اپنے آفس میں جا گھسا تھا اور اس نے یہ تک دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی کہ اس وقت ٹرین سے کون اترا تھا شاید وہ آدم بے زار قسم کا آدمی تھا۔

ٹرین کے روانہ ہوتے ہی اسٹیشن بھوتوں کی آماجگاہ لگ رہا تھا چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا اسٹیشن کے اردگرد گھنی جھاڑیاں اور درختوں کی بہتات تھی ایک دل دہلا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تو دونوں سہمے سہمے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھتے رہے پھر ہمت کر کے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ آسمان صاف ہونے کی وجہ سے چاند اپنی دودھیا روشنی پھیلائے ہوئے تھا پورا آسمان ٹمٹماتے ستاروں سے بھرا ہوا تھا چونکہ اس وقت وہ باہر کھلی فضا میں موجود تھے اس لئے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلتے ہی جیسے انہیں آکسیجن مل گئی ہو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زمین پر چلنے والے حشرات الارض اور پرندے بھی اس حسین نظارے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

ریحان کے کہنے کے مطابق اگر وہ گاؤں جانے والے راستے سے ہٹ کر قبرستان والے راستے کو اختیار کریں تو کم از کم اس سے انہیں آدھا گھنٹہ کا فائدہ مل سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے انہیں قبرستانوں کے متعلق سنی ہوئی کہانیاں بھی بہت اچھی طرح یاد تھیں اور وہ ہمت نہیں کر پا رہے تھے کہ اس وقت وہ قبرستان کا رخ کریں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ گاؤں جانے والے راستے پر گامزن تھے۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد انہوں نے سوچا کہ الحمدللہ وہ مسلمان ہیں اور اگر وہ قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے قبرستان میں سے گزریں تو کوئی بھی موذی چیز یا بھوت پریت ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے ایک فیصلہ کیا اور اللہ کا نام لے کر قبرستان کی طرف چل دیئے۔

☆---☆---☆

گاؤں کا قبرستان ہونے کی وجہ سے اس کے اردگرد چاردیواری بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی اس لئے اس کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں دور سے ہی قبریں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کے اندر لگے پیلوؤں کے درخت دیوؤں کی مانند سر اٹھائے دکھائی دے رہے تھے۔ دور سے وہ یوں نظر آ رہے تھے جیسے بہت سے جنات آپس میں سر جوڑے سرگوشیوں میں بات چیت میں مگن ہوں۔ قبرستان کے نزدیک پہنچتے پہنچتے ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ راستے کے دونوں طرف گندم کی فصلیں تھیں جو پک کر تیار ہو چکی تھیں اور ہوا کی وجہ سے ان کے گوشے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے عجیب سی آوازیں نکال رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سے افراد فصلوں میں چھپے بیٹھے ہوں اور ہلکی ہلکی آواز میں سیٹیاں بجا رہے ہوں۔

قبرستان کے قریب پہنچنے تک انہیں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ بے فکری سے اور قدرت کے حسن سے لطف اندوز ہوتے اپنے قدموں کو قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ قبرستان میں حسب معمول سکوت طاری تھا اور سوائے جھینگروں کے کسی اور حشرات الارض کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ قبرستان لگ بھگ تین ایکٹر پر پھیلا ہوا تھا یہ اسے ریحان نے بتایا۔ قبرستان میں داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ زیادہ تر قبروں پر کتبے موجود نہیں تھے نجانے گاؤں کے لوگ کس طرح اپنے پیاروں کی قبروں کو پہچانتے ہونگے؟ یہ سوال قاسم کے دماغ میں بار بار آ رہا تھا۔ پھر سر جھٹکتے ہوئے ریحان کی طرف متوجہ ہوا جو رات کے اندھیرے میں قبروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے قاسم کو چونکنے پر مجبور کر دیا یوں لگتا تھا جیسے اس نے کوئی انہونی چیز دیکھ لی ہو۔ قاسم کو اس کی یہ حالت دیکھ کر خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن ریحان ٹکٹکی باندھے ایک جانب دیکھنے میں مگن تھا اور پھر

اچانک قاسم نے اس کا کندھا ہلایا تو اسے ہوش آیا۔ پھر قاسم کے پوچھنے پر ریحان نے بتایا کہ اس کے دائیں طرف والی چھ سات قبریں چھوڑ کر نظر آنے والی قبر سے ایک سفید رنگ کا ہاتھ قبر سے نکل کر اسی کی طرف آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا دکھائی دیا تھا یہ سب اچانک آناً فاناً ہوا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے آواز دیتا وہ ہاتھ بڑی تیزی سے دوبارہ قبر میں داخل ہوگیا اور اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود وہ کچھ نہ دیکھ پائے۔ قاسم نے اسے اس کا وہم قرار دیتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیئے۔

☆---☆---☆

قبرستان میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی دور بہت دور کبھی کبھار گیدڑوں اور لگڑ بگڑوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سنائی دیتیں تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چھوٹی بڑی قبروں پر اگی جنگلی جھاڑیوں کی وجہ سے چلنے میں ذرا مشکل پیش آرہی تھی کوئی باقاعدہ راستہ نہیں بنا ہوا تھا اور کئی بار تو انہیں قبروں کو پھلانگنے کے ساتھ ساتھ ان پر سے بھی گزرنا پڑ رہا تھا۔ جنگلی پیڑوں کی وجہ سے چاند کی روشنی نیچے زمین پر آنے سے قاصر تھی۔ وہ دونوں آنکھیں پھاڑے آگے بڑھتے جارہے تھے ابھی انہیں قبروں کے درمیان چلتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک ان کی نظر ایک پرانی قبر پر پڑی جس کے اندر سے روشنی کی ایک کرن باہر نکلتی دکھائی دی۔

وہ دونوں چونک کر رکے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے کہ جیسے یہ فیصلہ کررہے ہوں کہ قبر کے نزدیک جا کر اس پراسرار روشنی کے متعلق جاننا چاہئے یا یوں ہی آگے بڑھ جانا چاہئے پھر ایک فیصلہ کرتے ہی انہوں نے اس روشنی کا راز جاننے کا ارادہ کیا اور اپنے قدم اس پرانی قبر کی جانب بڑھا دیئے۔ قبر کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ روشنی کی ایک پتلی دھار ایک چھوٹے سے سوراخ سے باہر نکل رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ سوراخ تیز ہوا یا آندھی کی وجہ سے کسی نوکیلے پتھر وغیرہ سے خود بخود بن گیا ہو روشنی کا منبع دودھیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے قبر میں سے ایک دودھ کی دھار مسلسل باہر نکل رہی ہو۔ قاسم نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا اور ریحان کے منع کرنے کے باوجود اس نے نیچے جھک کر اپنی ایک آنکھ اس سوراخ پر ٹکا دی۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ ایک باریش بزرگ جنہوں نے سفید رنگ کا چمکدار لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا نور چھایا ہوا تھا ایک منقش تخت پوش پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت کررہے تھے ان کے منہ سے نکلنے والی مسحور کردینے والی دلکش آواز ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھی وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی انہیں یوں دیکھ رہا ہے۔

قاسم بڑی حیرت سے انہیں دیکھے چلا جارہا تھا کہ جیسے خود بخود اس کے منہ سے ایک آواز نکلی کہ جیسے کسی نے اس کی زبان کو بے اختیار کردیا ہو اور وہ یہ پوچھنے پر مجبور ہوگیا اور اس قبر میں بیٹھے بزرگ سے سوال کر بیٹھا کہ ''اے بندہ ءخدا کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ نے دنیا میں کونسا ایسا عمل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قبر میں بھی آپ کو ایسا رتبہ عطا فرمایا۔''

بزرگ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اچانک کوئی ان سے اس طرح مخاطب ہوسکتا ہے۔ اس بزرگ نے چونک کر اوپر کی جانب دیکھا اور پھر ان کی نظر اس سوراخ پر پڑی جس میں سے ایک انسانی آنکھ اندر کی جانب جھانکتی نظر آئی۔ یہ دیکھ کر بزرگ نے قرآن پاک کو بند کیا اور یوں سوال کا جواب دیا۔

''اے اللہ کے بندے تیرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں جب زندہ تھا تو دنیا میں روزانہ باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا لیکن جب میرا وصال ہوا تو اسی وجہ سے میرا حساب کتاب آسان ہوگیا اور میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب تک قیامت قائم نہیں ہوتی مجھے دنیا کی طرح قبر میں بھی قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی اجازت عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے میری درخواست کو قبول کرتے ہوئے مجھے قبر میں یہ سہولت عنایت فرمادی۔ میرے وصال کو تقریباً پانچ سال ہوچکے ہیں اور اس عرصہ میں، میں نے پچاس ہزار قرآن پاک ختم کرلیے ہیں اب چونکہ میرا بھیجا تم پر عیاں ہوچکا ہے اس لیے میری تم سے التجا ہے کہ میرا ایک کام کردو وہ یہ کہ قبر پر ہاتھ اٹھا کر میرے لیے دعا کردو اور صرف ایک بار سبحان اللہ کہہ کر اس کا ثواب مجھے بخش دو اور اس کے عوض میں اپنے ختم کیے ہوئے پچاس ہزار قرآن پاک کا ثواب اللہ تعالیٰ سے کہہ کے تمہیں بخش دونگا۔''

قاسم بڑی حیرت سے اس بزرگ کی باتیں سن رہا تھا اور پھر اس کی درخواست پر عمل کرتے ہوئے اس نے کھڑے ہو کر ریحان کو تمام بات بتائی اور پھر دونوں نے اس بزرگ کے لیے دعا مانگی اور ایک کی بجائے دس دس بار سبحان اللہ کہہ کر اس کا ثواب اس بزرگ کو بخش دیا اور دوبارہ زمین پر بیٹھ کر اسی سوراخ سے اس بزرگ کو بتا بھی دیا۔ بزرگ نے بھی اپنے تمام ختم کیے ہوئے قرآن پاک کا ثواب اسے بخش دیا اور اس سے عہد لیا کہ وہ اس کا ذکر کسی بھی فرد سے نہیں کرے گا۔ قاسم نے انہیں اس بات کا یقین دلایا اور اس سوراخ پر مٹی ڈال کر اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ریحان کو تمام حقیقت سے آگاہ کیا اور دوبارہ اپنے راستے پر چل پڑے۔

☆---☆---☆

اللہ رب العزت نے انسان کے علاوہ ایک دوسری نادیدہ مخلوق جو انسانوں کو دیکھ سکتی ہے لیکن خود نگاہ آدم سے پوشیدہ رہتی ہے اسے جنات کا نام دیا گیا ہے جبکہ شیطان یعنی ابلیس بھی اسی خاندان کا ایک فرد ہے اور یہ غیبی مخلوق جو کبھی بھوت، کبھی چڑیل یا چھل پیری کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے یہ دراصل شیطان کی اس بدبخت اولاد سے تعلق رکھتی ہے جنہوں نے خیر کی بجائے شر کو اپنا لیا۔

☆---☆---☆

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا وہ دونوں اپنے بیگ اپنے کندھوں پر لٹکائے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ اچانک دور درختوں کے جھنڈ میں انہیں روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی انہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید وہاں قبرستان کا گورکن ہوگا اور اسی نے آگ وغیرہ جلا کر روشنی کا بندوبست کیا ہوگا وہ دونوں اسی طرف بڑھنے لگے جیسے جیسے وہ اس روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے ویسے ویسے کچھ نامانوس سی آوازیں ان دونوں کو سنائی دے رہی تھیں۔

وہ دونوں خوف و حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے آگے بڑھتے رہے اور کچھ ہی دیر میں وہ اس جھنڈ کے نزدیک پہنچ کر ٹھہر گئے انہوں نے فوری طور پر سامنے آنے کی بجائے کچھ دیر وہاں رک کر حالات کا جائزہ لینا مناسب سمجھا اور ان کی یہی احتیاط پسندی نے انہیں فوراً حقیقت سے آشکارا کر دیا۔ درختوں کی آڑ میں سے سامنے نظر آنے والے منظر نے ان کے جسموں کو منجمد کر دیا تھا اور ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور وہ اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس ویران قبرستان میں ایسا منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے ایک اسٹریچر پر ایک نوجوان عورت چمڑے کی بیلٹوں سے بندھی تڑپ رہی تھی اور اس کے گرد تین چار افراد ڈاکٹروں جیسا سفید ایپرن پہنے ہاتھوں میں مختلف آلات تھامے اس اسٹریچر پر بندھی لڑکی کے جسم کو مختلف جگہوں سے کاٹ رہے تھے اور لڑکی بے پناہ تکلیف سے چیخنے کی کوشش کرتی مگر ایک ڈاکٹر جلدی سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا جس سے اس کے منہ سے یوں آوازیں نکلتی جیسے کسی ذبح ہوتے بکرے کے منہ سے خراخراہٹیں نکلتی ہیں۔

منظر سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موجود ہوں اور اپنے سامنے کسی زندہ انسان کا آپریشن ہوتا دیکھ رہے ہوں لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ اس وقت وہ شہر سے بہت دور ایک ویران قبرستان میں موجود تھے اور یہ منظر اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کی حالت یوں ہوگئی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ نجانے اسی حالت میں وہ کب تک یوں ہی کھڑے رہتے اگر اس لڑکی کے منہ سے درد بھری چیخ دوبارہ سنائی نہ دیتی۔ اس بار شاید وہ لوگ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ پر قابو پانے میں ناکام ہوگئے تھے اس لیے اس لڑکی کو چیخنے کا موقع مل گیا اور اس بار اس نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دے دیا تھا۔

رات کا وقت، قبرستان کی ویرانی اور ایسے میں اس طرح کا دل دہلا دینے والا منظر ایک مضبوط اعصاب کے مالک پر بھی لرزہ طاری کر دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے لیکن وہ چاہ کر بھی اس مظلوم لڑکی کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ اس بار لڑکی کے چیخنے سے یوں لگا جیسے اس پر جھکے ڈاکٹروں کے لباس میں ملبوس افراد نے اسے گہری ضرب لگائی ہو۔ پیپل کے نیچے جلتی آگ میں وہ یہ خونی منظر اپنی جاگتی آنکھوں سے واضح طور پر دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ڈاکٹر نے ایک اور وار کر کے اس لڑکی کا ایک بازو اس کے دھڑ سے الگ کر کے زمین پر پھینک دیا۔

لڑکی شاید پہلی ضرب پر ہی تکلیف کی شدت سے بیہوش ہو چکی تھی یا شاید مر گئی تھی کیونکہ اس بار جب اس کے دھڑ سے اس کا ایک بازو علیحدہ کیا گیا تو دوسری طرف خاموشی رہی۔ انہوں نے اس کے جسم سے اس کا دوسرا بازو اور پھر دونوں ٹانگیں بھی الگ کر کے نیچے زمین پر پھینک دیں۔ وہ دونوں جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے دہشت زدہ نظروں سے وہ خوفناک منظر دیکھ رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس ساری کارروائی کا آخر مقصد کیا ہے۔

اگر انہوں نے ایک زندہ لڑکی کے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا تو انہیں شہر سے بہت دور اس ویران قبرستان میں آنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ یہ کام تو وہ اپنے اسپتال کے آپریشن تھیٹر یا تہہ خانے میں بھی بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ اور پھر اس طرح ایک لڑکی کے جسم کو کاٹ کر اسے تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب باتیں سوچ سوچ کر دونوں کے دماغ ماؤف ہو رہے تھے اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور یہی منظر دیکھتے رہے تو ان کے سر ایک دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔

لڑکی کے زندہ بچ جانے کا تو ایک فیصد بھی امکان نہیں بچا تھا کیونکہ آگ کی ہلکی ہلکی روشنی میں انہیں اس کا کٹا پٹا دھڑ اسٹریچر پر دکھائی دے رہا تھا اور پھر انہوں نے یہ دیکھ کر اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لیں جب ایک ڈاکٹر نے ہاتھ میں تھامی چھری کا وار کر کے اس لڑکی کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ کر دیا۔ جب دونوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ ڈاکٹر اپنے ہاتھ میں تھامے اس لڑکی کے سر سے ٹپکنے والے تازہ تازہ لہو کو اپنے معدے میں اتار رہا تھا دوسرے تین ڈاکٹر بھی اپنے ہاتھوں کے کٹورے بنائے جلدی جلدی اس کی کٹی گردن سے ابلتے خون سے اپنی پیاس بجھانے میں مصروف تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ان سب نے اپنے ہاتھوں پر لگا خون چاٹنا شروع کر دیا۔

لڑکی کے خون سے ان کے سفید ایپرن سرخ ہو گئے تھے لیکن وہ اپنے کام میں اس قدر مگن تھے کہ جیسے انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے اس مذموم کام کو دیکھنے کے لئے رات کے اندھیرے اور سنسان قبرستان میں کوئی نہیں آئے گا اسی لیے ان سب کا دھیان صرف لڑکی کی طرف ہی رہا۔ ابھی وہ اپنے کام میں مصروف تھے کہ اچانک ایک خوفناک چیخ سنائی دی اور جسے سنتے ہی ان سب نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور جلدی سے زمین پر بکھرے لڑکی کے کٹے بازوؤں اور ٹانگوں کو اکٹھا کر کے ایک جانب رکھ دیا۔

چیخ کی آواز سنسان قبرستان میں طبل صور کی مانند گونجی۔ ان دونوں نے بھی اس سمت دیکھا جہاں سے وہ چیخ سنائی دی تھی اور یہ دیکھ کر ان دونوں کی حالت پتلی ہو گئی جب اس طرف نظر آنے والے جھنڈ میں سے ایک عجیب الخلقت جانور نکلتا دکھائی دیا اور کا چہرہ نیولے کی طرح لمبوترا تھا اور اس کے ہاتھوں پر سیاہ بال دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ ایک بندر کی مانند اچھلتا کودتا ان ڈاکٹروں کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس طرح کا جانور ان دونوں نے شاید اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لئے وہ حیرت سے اس عجیب جانور کو ان لوگوں کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ جانور کے بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک گولے کی مانند ان سے جا ٹکرائے گا وہ سب بھی اسے اپنی جانب یوں بھاگتا دیکھ کر تیزی سے زمین پر بیٹھ گئے تھے اور ان کے چہروں پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔

آگ میں نجانے کونسی لکڑیاں استعمال کی گئی تھیں کہ اتنی دیر تک جلنے کے باوجود اس میں سے شعلے اٹھ رہے تھے اور اسی وجہ سے یہ دونوں وہاں ہونے والے واقعات کو بہت حد تک واضح طور پر دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جانور ان لوگوں کے نزدیک جا کر یوں رک گیا جیسے سیل والے کھلونے سیل ختم ہونے پر اچانک رک جاتے ہیں۔

☆---☆---☆

اس جانور کے اپنے نزدیک پہنچتے ہی وہ سب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے اس لڑکی کے جسم کی بچی کھچی باقیات کی جانب اشارہ کیا جانور شاید پہلے سے ہی ان کے اشارے کا منتظر تھا اسی لئے اس نے بھی تیزی سے اپنی گردن گھما کر اس جانب دیکھا اور جلدی سے بھاگ کر لڑکی کا ایک بازو جھنجھوڑنے لگا اور اس کے ایسا کرنے سے رات کے سناٹے میں ایک اور وحشت ناک منظر کا اضافہ ہو گیا اس کے دانتوں سے کچر کچر کی آوازیں ماحول کو اور دہشت ناک بنا رہی تھیں اور یہ دیکھ دیکھ کر ان دونوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے آخر یہ لوگ کون ہیں اور یہ عجیب الخلقت جانور یہاں قبرستان

ڈیسنٹ کشن اینڈ بیڈ شیٹ ہاؤس

ہمارے یہاں بیڈ شیٹ، کشن کور اور پردوں کی لامحدود ورائٹی دستیاب ہے

مناسب قیمت

کوالٹی کی گارنٹی

دیدہ زیب رنگوں کے امتزاج کے ساتھ

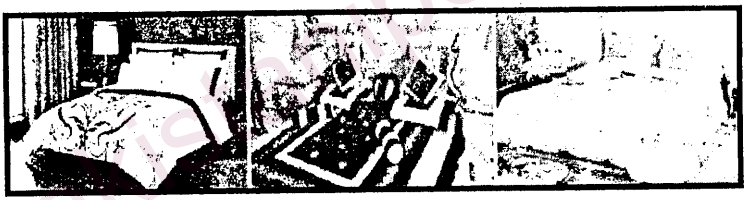

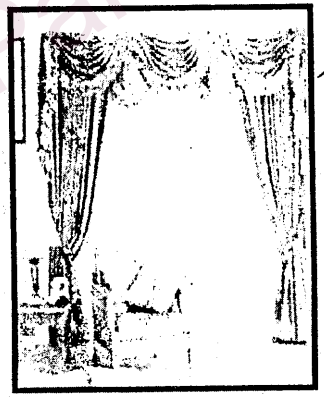

دکان نمبر 26-21 اقبال شاپنگ سینٹر

پاپوش نگر، ناظم آباد نمبر 5 کراچی

فون نمبر: 021-36616735

میں کیا کر رہا ہے اور یہ لوگ اسے اس مردہ لڑکی کا گوشت کیوں کھانے کے لئے دے رہے ہیں۔

یہ سب باتیں ان دونوں کی عقل ماؤف کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ اس جانور نے بازوؤں سے انصاف کرنے کے بعد اس کی دونوں ٹانگوں کو بھی اسی طرح بھنبھوڑنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں میں چٹ کر گیا۔ ڈاکٹروں کے چہروں پر اسی طرح وحشت چھائی ہوئی تھی اور وہ منہ کھولے اس جانور کو اس لڑکی کا گوشت کھاتے دیکھ رہے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس جانور نے زمین پر پڑے کٹے ہوئے سر کو کھانا شروع کر دیا نجانے اس کے جبڑوں کتنی طاقت تھی کہ ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں وہ دونوں بھی دور سے صاف سن رہے تھے۔

چند منٹوں میں اس نے لڑکی کا پورا سر بھی اپنے معدے میں اتار لیا اور زمین پر صرف بال بکھرے رہ گئے۔ اس کے باوجود کہ وہ سب ڈاکٹر خود ایک بھیانک کام سرانجام دے چکے تھے لیکن ان کے چہرے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی سامنے نظر آنے والے منظر نے انہیں یہ تک بھلا دیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کوئی خوفناک فلم دیکھنے کی بجائے ایک خوفناک اور سنسان قبرستان میں بیٹھے ہیں اور اپنی زندہ آنکھوں سے اپنے سامنے ہونے والے ایک سنگدل اور خونی کھیل کو دیکھ رہے ہیں۔ قریب سے ہی کسی جھینگر کے ٹرٹرانے کی آواز نے جیسے ان دونوں کو ہوش کی دنیا میں دوبارہ دھکیل دیا۔

انہوں نے چونک کر جھرجھری لی اور جب ان دونوں کے شعور نے انہیں حقیقت کی دنیا میں نظر آنے والے منظر سے آشکارہ کیا تو انہیں پتہ چلا کہ اس وقت انتہائی خطرناک حالت میں ایک قبرستان میں موجود ہیں۔ یہ دیکھ کر قاسم نے جلدی سے اپنی کلائی پر بندھی ریسٹ واچ پر نظر ڈالی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے یعنی انہیں اس قبرستان میں تین گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے اور اب انہیں اپنے بچاؤ کیساتھ کیساتھ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر بھی ستانے لگی۔

وہ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے اور قبرستان میں درختوں کی بھی بہتات تھی اس لیے چاند کی روشنی بہت کم زمین پر آ رہی تھی اس لیے وہ ان سب کی نظروں سے دور تھے اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس وقت ہوا بھی خاموش ہو چکی تھی ورنہ ہو سکتا تھا کہ ہوا کے چلنے کی وجہ سے ان کے جسموں کی خوشبو اس جانور کو ان کا پتہ بتا دیتی اور اس وقت وہ دونوں بھی اس بھیانک لوگوں اور اس جانور کے عتاب کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ ان دونوں کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا۔

ایسا خوفناک اور بھیانک جانور ان کے گاؤں کے قریب والے قبرستان میں موجود تھا لیکن اس کے بارے میں کبھی کسی کے منہ سے کوئی بات نہیں سنی گئی تھی یا شاید ابھی تک کسی کو بھی اس کی موجودگی کا پتہ نہ چلا ہو اور یہ بھی وجہ ہو سکتی تھی کہ دن کے وقت شاید یہ جانور یہاں سے کہیں اور چلا جاتا ہو یا اس کی کوئی آماجگاہ موجود ہو اور وہ دن کی روشنی میں وہاں جا چھپتا ہو، بہرحال کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی لیکن وہ اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس جانور کی سوانح عمری پر روشنی ڈالتے اس وقت سب سے بڑا کام تو یہ تھا کہ ان دونوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر اس قبرستان سے بھاگنا ہے لیکن سامنے وہ خوفناک منظر انہیں وہیں دبکے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

☆---☆---☆

مختار گڑھ میں موجود رحمت پریشانی کی حالت میں اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہا تھا جب سے اسے اطلاع ملی تھی کہ چوہدری مشتاق نے اس کے بیٹے ریحان کو اپنے بیٹے قاسم کیساتھ ٹرین سے مختار گڑھ کے لئے روانہ کر دیا ہے تو اسے ایک بے چینی لگی ہوئی تھی کیونکہ ان کے ٹرین میں بیٹھتے ہی اسے اس بات کی اطلاع کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچا دی گئی تھی لیکن شام سے ہی وہ ان دونوں کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور اسے ٹھہر ٹھہر کر ان کی فکر ستائے جا رہی تھی کہ وہ اب تک گاؤں کیوں نہیں پہنچے۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ شہر سے جو لوکل ٹرین اس طرف آتی ہے وہ مغرب سے پہلے مختار گڑھ تک ضرور پہنچ جاتی ہے لیکن اب رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ان دونوں کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہ گئے ہیں۔ فی الحال اس نے اپنی پریشانی کا تذکرہ اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا اسے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور

رات کو کسی وقت پہنچ جائیں گے اس لئے وہ کھانا پکانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی لیکن رحمت انتظار اور پریشانی کی سولی پر ٹنگا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی ٹہلتے رہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

گھر سے نکل کر وہ سیدھا اپنے ایک دوست رحیم کے پاس گیا جو اس کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر ہی رہتا تھا اور گاؤں میں ایک مٹھائی کی دوکان چلاتا تھا۔ رحمت کی اس کے ساتھ دوستی ہونے کے ناتے رحیم اپنی پریشانی اس کے ساتھ بانٹتا تھا اور اس کے جواب میں رحمت بھی اس کے ساتھ بہت عرصے سے دوستی نبھا رہا تھا۔ رحمت کو اس وقت صرف اسی کا خیال آیا اور وہ اس وقت اس کے گھر میں بیٹھا اپنی پریشانی اسے بتا رہا تھا۔ رحیم کچھ دیر تک اس کی بات سنتا رہا اور پھر سر ہلاتا ہوا اٹھا اور اسے اپنے ساتھ لیکر گھر سے باہر کی جانب چل دیا۔

گھر سے نکل کر یہ دونوں گاؤں کے نمبردار کے ڈیرے کی جانب بڑھنے لگے راستے میں رحیم نے اسے یہ بتایا کہ اب اتنی دیر ہونے کی وجہ سے انہیں نمبردار سے مدد لینی چاہیے کیونکہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ خدانخواستہ ان دونوں کو کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو کیونکہ جتنی دیر رحمت نے اسے بتائی تھی اس وقت تک تو ان دونوں کو اس وقت گھر میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کی کہ بات سن کر رحمت کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلانے لگے اور وہ بھی جلدی جلدی اس کے ساتھ قدم اٹھاتا نمبردار کے ڈیرے کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔

نمبردار کا گھر گلی کے نکڑ پر تھا اور اس کے سامنے پکی اینٹوں سے ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک طرف دو چارپائیاں اور کچھ گاؤں میں نرکھل سے بنے موڑھے رکھے تھے جس پر پنچائتی حضرات براجمان ہوتے تھے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے گاؤں میں ایک خاموشی کی فضا طاری تھی اور ویسے بھی گاؤں کے لوگ شام سے ہی اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر سو جاتے تھے کیونکہ صبح سویرے انہوں نے اٹھ کر اپنے روزمرہ کے کام کرنے ہوتے تھے۔

نمبردار شاید ابھی سوئے نہیں تھے کہ ان کے دروازے پر دستک دیتے ہی اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھلتے ہی انہیں نمبردار کی شکل نظر آئی جس پر حیرانگی کے آثار انہیں صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے نمبردار کو اس وقت ان کے آنے کی قطعی امید نہ تھی پھر اس کے پوچھنے پر انہوں نے اسے مختصر طور پر اپنی پریشانی کی متعلق بتایا تو نمبردار ان کی بات سن کر گھر سے باہر نکل کر انہیں لیتا ہوا سامنے بچھی چارپائیوں کی جانب لپکا۔

وہ دونوں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے چلتے ہوئے سامنے بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور نمبردار بھی ان کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ان کے بیٹھتے ہی اس نے انہیں تفصیل سے تمام حالات بیان کرنے کے لیے کہا اور جواب میں رحمت نے رحیم کا اشارہ پاتے ہی اپنی پریشانی کا اور اپنے اور چوہدری مشتاق کے بیٹے قاسم کے شہر سے گاؤں کی طرف روانگی کے متعلق تفصیل سے بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ شہر سے گاؤں کی جانب آنے والی گاڑی مغرب سے پہلے مختار گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچ جاتی ہے لیکن اب نو بجنے والے ہیں اور وہ لوگ ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔ نمبردار اس کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا اس کے بات ختم ہوتے ہی اس نے بھی اس کی تائید کی کہ اس وقت تک ان دونوں کو گھر آ جانا چاہئے تھا۔

لیکن اب اتنی رات ہونے کے باوجود ان کا کچھ پتہ نہیں تو ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوگی۔ یہ کہہ اس نے انہیں وہیں بیٹھنے کا کہا اور خود گھر کے اندر چلا گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ واپس باہر آیا اس کے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں ایک بڑی سی ٹارچ تھی ان کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے انہیں حیرانی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو اس نے ان کی حیرت یہ کہہ کر ختم کردی کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انہیں فوراً اسٹیشن کی طرف روانہ ہونا چاہئے تاکہ وہاں جا کر اسٹیشن ماسٹر سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا گاڑی ٹھیک وقت پر پہنچی تھی تو اس میں سے کتنے مسافر اترے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ نمبردار نے ان دونوں کو بھی اپنے اپنے گھروں سے ٹارچیں اور اپنی حفاظت کے لئے کوئی چیز ساتھ لیجانے کے لئے تاکید کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ راستے سے وہ چند اور نوجوانوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیں گے تاکہ رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے جنگلی جانوروں یا

کسی اور مصیبت کا سامنا کرنے پر مقابلہ کیا جا سکے۔

اس کی بات سن کر ان دونوں نے سر ہلائے اور وہ تینوں چلتے ہوئے رحمت کے گھر کی جانب چل دیئے۔ دونوں کے گھر قریب ہونے کی وجہ سے جھٹ پٹ میں انہوں نے گھروں سے ٹارچیں اٹھائیں اور اپنے ہاتھوں میں لمبی لمبی دولاٹھیاں بھی اٹھالیں۔ نمبردار انہیں ساتھ لیکر کچھ اور گھروں کی جانب گیا اور وہاں سے اس نے چند نوجوانوں کو بھی اپنی ٹولی میں ملالیا اور پھر گاؤں سے نکلتے نکلتے انہیں رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔

وہ سب ایک ٹولی کی شکل میں گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھتے چلے گئے جو راستہ سیدھا اسٹیشن کی جانب جاتا تھا لیکن کچھ دور جا کر وہاں سے اک چھوٹا راستہ گاؤں کے ویران قبرستان کی جانب بھی نکلتا تھا یہ قبرستان گاؤں کے بزرگوں کے زمانے کا تھا جس کے متعلق عجیب وغریب خبریں خود ان کے فوت شدہ بزرگوں نے ہی پھیلائی تھیں کہ وہاں کچھ عجیب شکل کے جانور دیکھے گئے ہیں۔

اس لیے جتنے مردے وہاں دفنا دیئے گئے تھے گاؤں والوں نے اسی حد تک ہی رہنے دیا اور دوبارہ اپنے نئے مردے گاؤں کے شمالی جانب ایک اور قبرستان بنالیا تھا اور اب وہ اپنے مردے وہیں دفن کرتے تھے اور کبھی بھول کر بھی اس ویران قبرستان کی جانب نہیں جاتے تھے۔ اور اس وقت بھی وہ سب ایک ٹولی کی شکل میں اس قبرستان کے ساتھ والے راستے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے ویسے ویسے ویران قبرستان کے آثار اپنی تمام تر وحشت کیساتھ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ قبرستان کی طرف دیکھ دیکھ کر ان پر ایک عجیب سی خوف کی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک کوئی خوفناک درندہ جھاڑیوں سے اچھل کر ان کے سامنے نمودار ہو جائے گا لیکن چونکہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کچھ سامان تھا اور ان کے پاس ٹارچیں بھی تھیں اس لئے وہ مطمئن تھے کہ جنگلی جانور روشنی کی وجہ سے خوف کھاتے ہیں اور نزدیک آنے سے کتراتے ہیں۔ دوسرا یہ بھی اطمینان تھا کہ نمبردار کے پاس ایک بندوق بھی تھی جس سے وہ اکثر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے شکاری بھگڑوں کو نشانہ بناتا رہتا تھا اس لئے اس کا نشانہ بھی بہت پکا تھا۔

آسمان پر چاند اپنے جوبن پر تھا اور ستارے بڑی حیرانی سے نیچے جاتے والی اس ٹولی کو دیکھ رہے تھے جو ایک کچے راستے پر چلتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آوارہ بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے آجاتا تو پل بھر کے لئے چاروں طرف ایک گھپ اندھیرا چھا جاتا اور پھر اس کے ہٹتے ہی دوبارہ زمین پر چاند کی چاندنی پھیل جاتی۔ راستے کے دونوں اطراف گندم کے خوشے لہرا رہے تھے اور فصل پک کر پوری طرح تیار تھی۔ دور بہت دور انہیں اسٹیشن پر ٹمٹماتی روشنی نظر آرہی تھی۔

رات بھی دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی وہ سب آپس میں باتیں کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ کافی دیر چلنے کے بعد نمبردار نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور اسٹیشن ابھی دور تھا۔ دور سے نظر آنے والی ہلکی ہلکی روشنی غالباً اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی تھی۔ وہ جلد از جلد اسٹیشن پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتے تھے اور اسی لئے ان کے قدم تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

☆---☆---☆

لڑکی کے دھڑ، بازوؤں اور دونوں ٹانگوں کو کھانے کے بعد اس لہوتری شکل کے عجیب الخلقت جانور نے ایک زوردار چیخ ماری جس کی بازگشت بہت دور دور تک سنائی دی ہوگی لیکن ان دونوں کو اس وقت اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور دہشت زدہ نظروں سے اس جانور کی جانب دیکھنے لگے۔

چیخ سنتے ہی ڈاکٹروں کا لباس پہنے اشخاص میں سے دو ڈاکٹر جلدی سے اسٹریچر کو دھکیل کر ایک جانب درختوں کے اندر لیجانے لگے اور باقی دو ڈاکٹروں نے وہاں پڑی ہڈیوں اور بالوں کو ایک تھیلے میں بھرنا شروع کر دیا اور پھر چند ہی لمحوں میں وہاں یوں لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جانور ایک جانب کھڑا انہیں یہ سب کرتا دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی تھوتھنی اوپر اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

غالباً اسے وہاں کچھ اور انسانوں کی موجودگی کا احساس

ہونے لگا تھا۔ یہ ان دونوں کی خوش قسمتی ہی ہوگی کہ اس وقت ہوا خاموش تھی اور اسی وجہ سے وہ جانور ان دونوں کی موجودگی کو محسوس نہ کر پایا ورنہ اس وقت وہ دونوں بھی اس کے معدے میں پہنچ چکے ہوتے۔ انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی وہ دونوں دل ہی دل میں قرآنی سورتیں بھی پڑھتے جارہے تھے اور انہیں قوی یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔

رات اپنے پر پھیلائے دھیرے دھیرے گزر رہی تھی لگتا تھا جیسے آج کی رات پہلے کی نسبت ذرا سست روی سے گزر رہی تھی اور وہ جھاڑیوں میں دبکے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے لیکن ان دونوں کے دماغ بالکل ماؤف ہو چکے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں وہ اس قبرستان کے درمیان موجود تھے اور واپسی کے لئے بھی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ اس وقت وہ کم از کم اس جانور اور ان ڈاکٹروں کی نظروں سے تو چھپے ہوئے تھے اگر ان لوگوں کو ان دونوں کی موجودگی کا ہلکا سا بھی پتہ چل گیا تو ان کی خیر نہیں۔ اسی لئے وہ اپنی سانسیں روکے سامنے نظریں ٹکائے دیکھ رہے تھے۔

☆---☆---☆

ابھی وہ سب چلتے ہوئے قبرستان کی جانب جانے والے راستے کو عبور کر کے تھوڑی دور تک ہی گئے ہونگے کہ انہیں قبرستان کے اندر سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی جسے سن کر وہ ٹھٹک گئے اور خوف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور انہیں اس ویران قبرستان سے منسوب اپنے فوت شدہ بزرگوں کی سنائی ہوئی باتیں فوراً یاد آگئیں۔ وہ وہیں رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قبرستان کے اندر تک دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

چونکہ آسمان پر چاند اپنے جوبن پر تھا اور اس کی دودھیا روشنی بھی چھن چھن کر زمین پر آرہی تھی لیکن قبرستان میں پیلو کے درختوں کی بھرمار تھی جس کی وجہ سے انہیں اتنی دور سے واضح نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ چیخ کس کی تھی آیا وہ کسی جنگلی جانور کی تھی یا کسی انسان کی۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں کھڑے سوچوں مگن تھے کہ ٹولی میں موجود ایک نوجوان کو ایسا لگا جیسے دور درختوں میں کوئی انسان سفید لباس پہنے تیزی سے گھسا ہو پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن پھر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور سفید لباس میں ملبوس انسان اسی درختوں کی جھنڈ میں داخل ہوگیا۔ اب اسے کامل یقین ہوگیا کہ ضرور قبرستان میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے اس نے فوراً یہی بات نمبردار اور وہاں موجود دوسرے افراد کو بتائی تو دوسرے لوگ خوف سے واپسی کو ترجیح دینے لگے لیکن نمبردار کے سمجھانے پر انہوں نے سہم کر قبرستان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ نمبردار نے بڑے تحمل سے اس نوجوان سے ساری بات سنی اور اس کے یقین دلانے پر کہ اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دو افراد کو سامنے دکھائی دینے والے درختوں کے جھنڈ میں جاتے دیکھا ہے۔

اس کی بات سن کر نمبردار کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے اس نے انہیں اپنے ساتھ قبرستان کے اندر جا کر ساری حقیقت کا پتہ لگانے کا کہا۔ پہلے تو وہ سب انکار کرتے رہے لیکن پھر یہ بات کہنے پر کہ ہوسکتا ہے جن کی تلاش میں وہ اس وقت بھٹک رہے ہیں کہیں خدانخواستہ ان کے ساتھ ہی کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو۔ وہ سب تیار ہوگئے اور پھر ان سب نے محتاط انداز میں قبرستان کے اندر جانے والے راستے پر قدم بڑھا دیئے۔ قبرستان اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے تھا زمین پر جا بجا جنگلی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے انہیں چلنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔

چونکہ یہ قبرستان کافی عرصے سے ویران پڑا تھا اور اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں تھا اسی لئے یہاں اس قدر جھاڑ جھنکار اگ آیا تھا اور اس وقت ان کے لیے ایک رکاوٹ بن گیا تھا لیکن وہ اپنی نظریں اسی درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھتے جارہے تھے جن میں اس نوجوان کے کہنے کے مطابق دو افراد کو سفید لباس میں گھستے دیکھا تھا۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد انہیں درختوں کے دائیں جانب ایک بڑے سے درخت کے نیچے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دی جو شاید وہاں جلائی گئی آگ کی لگ رہی تھی۔

وہ حیرت سے اس روشنی کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ انہیں تو مرکر بھی کسی ذی روح کا اس ویران قبرستان میں موجودگی کا احساس تک نہ تھا اور پھر یہ آگ کس نے جلائی؟ یہ خیال ان سب کے لئے پریشانی کا باعث بن رہا تھا وہ

سب ایک جگہ اکھٹے ہوکر آپس میں مشورہ کرنے لگے اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جا کر دیکھا جائے کہ وہ آگ کس نے جلائی ہے۔

نمبردار نے اس سب کو کچھ ہدایات دیں اور پھر اپنے ہاتھ میں تھامی بندوق کو سیدھا کرتے ہوئے اس روشنی کی جانب پیش قدمی کی وہ سب چونکنے انداز میں اپنے چاروں طرف نظریں جمائے اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے روشنی صاف دکھائی دینے لگی تھی جو ایک بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے موجود تھی لیکن ابھی تک وہ وہاں تک نہیں پہنچ پائے تھے جہاں سے انہیں سب کچھ واضع دکھائی دے جائے۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے وہ اس درخت کی جانب بڑھتے چلے گئے اور پھر جیسے ہی وہ گھوم کر اس جگہ پہنچے تو یکدم ان سب کے منہ سے خوف سے چیخیں نکل گئیں۔ سامنے کا منظر ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ درخت کے نیچے موجود دو افراد جنہوں نے ڈاکٹروں کی طرف سفید ایپرن پہنے ہوئے تھے اپنے ہاتھوں میں چھریاں اٹھائے کھڑے تھے اور ان کے لباس خون سے تر بتر تھے جو روشنی میں واضع نظر آرہے تھے اور ان کے سامنے زمین پر موجود ایک نیولے کی شکل والا جانور زمین پر پڑا گوشت کھانے میں مصروف تھا۔ وہ گوشت ایک سفید کفن میں لپٹا ہوا تھا جسے اس جانور نے نوچ نوچ کر پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور اپنے خونخوار دانتوں سے اس میں سے نظر آنے والے گوشت کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا اور وہ دونوں ڈاکٹر دور کھڑے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی اس جانور کے بس کرنے کے بعد اس مردہ گوشت کو کھانے کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن جانور جس طرح اس گوشت کو نوچ رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ وہ اس مردہ جسم کی کوئی ہڈی تک بھی نہیں چھوڑے گا۔

☆---☆---☆

وہ دونوں ڈاکٹر جوان کے سامنے اسٹریچر دھکیلتے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے تھے ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے لیکن ان کے سامنے جو دو ڈاکٹر نظر آرہے تھے ان سے وہی جانور نہ جانے کیا بات کر رہا تھا جو کہ وہ اتنے فاصلے سے نہیں سن پا رہے تھے لیکن اس جانور کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ان دونوں کو کوئی بات کہہ رہا ہو اس کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا جب وہ دونوں ڈاکٹر اس کی بات سنتے ہی ایک جانب دوڑ گئے اور کچھ ہی دیر میں ایک سفید کفن میں لپٹے لاشے کو گھسیٹتے ہوئے لاتے دکھائی دیئے اور لاکر وہ کفن پوش لاشہ اس جانور کے سامنے پھینک دیا جسے دیکھتے ہی جانور یوں اس پر ٹوٹ پڑا جیسے وہ اس کا کوئی من پسند کھانا ہو۔

ایک ویران قبرستان کی بھیانک خاموشی میں ایک عجیب وغریب قسم کے حالات سے بھرا منظر کسی کے بھی ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ انہیں تو اب اپنی زندگی کی فکر لاحق ہوگئی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی جاگتی آنکھوں سے جو مناظر دیکھے تھے وہ ان دونوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھے ظاہر ہے جب وہ لوگ مردہ افراد کو نہیں چھوڑ رہے تھے تو اس وقت تو وہ دونوں ان کے نزدیک ہی موجود تھے یہی سوچ سوچ کر ان دونوں کو پسینے آرہے تھے۔

وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے کوئی غیبی امداد بھیج دیئے جانے کے منتظر تھے۔ وہ جانور ابھی پوری طرح اس لاشے سے انصاف نہیں کر پایا تھا کہ اچانک ایک شور اٹھا اور فضا میں ایک گولی کے چلنے کی آواز سنائی دی جس سے درختوں پر سوئے پرندے ہڑبڑا کر اڑ گئے اور فضا میں ان کے شور سے ایک بھونچال آگیا ابھی گولی کی آواز کی بازگشت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بہت سے افراد اپنے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ٹارچیں لہراتے نمودار ہوئے اور یہ دیکھنے میں انہیں قطعی کوئی غلطی نہیں لگی کہ ان میں ریحان کو اپنے والد کی جھلک بھی دکھائی دی اور گاؤں کے نمبردار کو بھی اس نے دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں ایک بندوق تھی اور اس میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا غالباً کچھ دیر پہلے گولی کی آواز جو سنائی دی تھی وہ اسی بندوق سے داغی گئی تھی۔

جیسے ہی وہ سب لوگ درخت کی طرف بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ گولی کی آواز کے ساتھ ہی وہ دونوں ڈاکٹر تو ہوا میں ہی تحلیل ہوگئے لیکن وہ جانور دوڑتا ہوا جس طرف سے نمودار ہوا تھا وہیں بھاگ گیا۔ سمجھ میں نہ آنے والا ماجرہ تھا کہ وہ جانور کیا تھا اور یہ دونوں ڈاکٹر اگر انسان تھے تو وہ فضا میں تحلیل کیسے ہوسکتے تھے۔ یہ ان کے لئے ایک معمہ تھا لیکن فی الحال اس بحث میں پڑنے کی بجائے انہوں نے مزید وقت ضائع کئے بغیر ان کی طرف دوڑ لگا دی اور ساتھ ساتھ

وہ ان لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے آوازیں بھی لگاتے ہوئے دوڑتے جارہے تھے اس لیے کہ کہیں گھبرا کر وہ لوگ انہیں بھی گولی کا نشانہ نہ بنادیں۔

ان کا یہ اقدام کامیاب رہا اور انہوں نے انہیں یوں اپنی طرف بھاگتے دیکھ لیا تھا اور ان کے نزدیک پہنچتے ہی وہ دونوں لہرا کر گرے اور بیہوش ہوگئے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کسی غیر محفوظ انسان کو اپنے محفوظ ہونے کا احساس ہوجائے تو اس پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ورنہ جس قسم کے حالات وہ دونوں اپنی زندہ آنکھوں سے پچھلے چند گھنٹوں سے دیکھ رہے تھے ان حالات میں بھی وہ دونوں بیہوش نہیں ہوئے تھے لیکن اپنوں میں پہنچتے ہی یہ اس کیفیت کا شکار ہوکر ان لوگوں کے سامنے ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔

☆---☆---☆

نمبردار اور اس کے ساتھیوں کی وہ منظر دیکھ کر ایسی حالت ہوگئی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں کچھ دیر تک وہ یوں ہی سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا رہے لیکن پھر کسی پرندے کے چہچہے پر جیسے انہیں ہوش آگیا ہو اور جب ان کے لاشعور نے انہیں حقیقت سے روشناس کرایا تو نمبردار نے جلدی سے بندوق کا رخ اس جانور کی طرف کرکے ٹریگر دبادیا ایک دھماکا ہوا اور فضا میں درختوں سے اڑنے والے پرندوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ دھماکے سے سامنے درخت کے نیچے کھڑے دونوں ڈاکٹر اچانک یوں فضا میں تحلیل ہوگئے جیسے کبھی ان کا وجود رہا ہی نہ ہو لیکن وہ جانور بھی ادھ کھایا انسانی جسم چھوڑ کر درختوں کے ایک جھنڈ کی جانب بھاگ گیا۔

وہ حیرت سے کھڑے یہ سب تماشہ دیکھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے دو افراد شور مچاتے بھاگتے ہوئے اپنی جانب آتے دکھائی دیئے اور پھر انہیں پہچاننے میں لمحہ بھر دیر نہیں لگی کہ ان میں ایک ریحان اور دوسرا کوئی اور تھا وہ دونوں بھاگتے اور شور مچاتے ان کے نزدیک آن کر زمین پر یوں گر گئے جیسے کوئی آٹے کی بوریاں لاکر پھینکتا ہے۔

رحمت کے بتانے پر کہ دوسرا چوہدری مشتاق کا بیٹا قاسم تھا جو شہر سے ریحان کو گاؤں چھوڑنے کے لیے نکلا تھا۔ ان سب سے جلدی سے ان دونوں کو چند نوجوانوں کے کندھوں پر لادا اور واپس گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ قبرستان سے نکلتے وقت رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور وہ جلد از جلد گاؤں پہنچ کر حکیم صاحب سے ان لوگوں کے لیے کوئی دوا لینا چاہتے تھے جلد ہی وہ گاؤں جانے والے راستے پر پہنچ گئے۔

وہیں سے نمبردار نے دونو جوانوں کو حکیم صاحب کو لے کر اس کے ڈیرے پر پہنچنے کا کہا اور خود وہ سب کو لیکر اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے گھر کے دروازے کے ساتھ ایک اور کمرے کا دروازہ اندر سے کھولا اور ان سب کو اندر آنے کے لئے کہا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں کچھ کرسیاں اور چارپائیاں موجود تھیں جن پر سلیقے سے بستر بچھے ہوئے تھے۔ نمبردار نے ان نوجوانوں کو جنہوں نے ان دونوں کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا ان چارپائیوں پر لٹانے کے لیے کہا یہ سنتے ہی انہوں نے جلدی سے ان دونوں کو ان چارپائیوں پر لٹادیا۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کا حکیم بابا دین محمد کمرے میں داخل ہوا اس کے ساتھ وہ دونوں نوجوان بھی تھے جو اسے لے کر آئے تھے۔

حکیم کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے سامنے لیٹے ریحان اور قاسم کی جانب بڑھا غالباً اسے لانے والے دونوں نوجوانوں نے راستے میں ہی تمام واقعات بتادیئے تھے اس لیے اس نے کسی سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک چرمی تھیلے سے سفوف کی چند پڑیاں نکالیں اور ساتھ ہی ایک جگ میں پانی لانے کا کہہ کر دو پڑیاں کھول کر اس میں موجود سفوف کو دیکھنے لگا جلد ہی اس کے سامنے پانی سے بھرا جگ موجود تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ایک پڑیا کا تمام سفوف ریحان کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دیا اور ساتھ ہی چٹکی سے اس کی ناک بند کرکے پکڑ لی اور اپنے نزدیک کھڑے ایک نوجوان سے کہا کہ وہ جگ سے پانی کے چھینٹے ریحان کے چہرے پر مارے نوجوان نے جلدی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور سفوف اس کے حلق سے اترتے ہی اور ناک کے ذریعے سانس بند ہونے کی وجہ سے ریحان نے ایک جھرجھری لی اور آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

یہی عمل حکیم صاحب نے قاسم پر بھی دہرایا جس سے اسے بھی چند لمحوں میں ہوش آگیا۔ نمبردار نے حکیم صاحب کو کچھ پیسے دیکر اور اس واقعہ کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنے کا کہہ کر روانہ کیا اور سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں بھی

اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانے کا کہا اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی تاکید کردی کہ وہ اس معاملے میں خاموشی برتیں گے۔ان سب کے لوٹ جانے کے بعد کمرے میں صرف چار افراد رہ گئے تھے جن میں ریحان، قاسم، رحمت اور رحیم شامل تھے۔

نمبردار نے انہیں صبح تک وہیں رکنے کا کہا تاکہ ریحان اور قاسم کی طبیعت مزید بہتر ہوجاتی لیکن رحمت کے اصرار کرنے پر کہ اس کے اور رحیم کے گھر والے پریشان ہوں گے وہ بھی نمبردار کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ریحان اور قاسم کو لیکر اپنے گھر لوٹ گیا راستے میں رحیم نے بھی اجازت چاہی اور انہیں اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر اپنے گھر چلا گیا۔

☆---☆---☆

صبح ضروری حاجات اور ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ سب ایک کمرے میں بیٹھے رات والے واقعات پر بات چیت کررہے تھے انہوں نے گھر میں کسی سے بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا تھا کہ خوامخواہ عورتوں میں خوف وہراس پھیلتا اور گاؤں میں یہ بات پھیل جاتی تو لوگوں کا باہر نکلنا اور کام دھندہ کرنا ٹھپ ہوجاتا اور رحمت نے بھی سختی سے انہیں کسی کو بھی کچھ بتانے سے منع کردیا تھا۔

کمرے میں اس وقت رحمت، ریحان اور قاسم کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا اسی لیے وہ خاموشی سے اور بے فکری سے آپس میں باتوں میں مگن تھے کہ اچانک باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی رحمت یہ سنتے ہی تیزی سے باہر کی جانب لپکا اور واپس آن کر ان سے مخاطب ہوا کہ گاؤں کے نمبردار نے ان دونوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی فوراً بلایا ہے۔ناشتہ سے وہ لوگ پہلے ہی فارغ ہوچکے تھے اس لیے یہ پیغام ملتے ہی وہ دونوں رحمت کے ساتھ نمبردار کے ڈیرے کی جانب چل دیئے۔کچھ ہی دیر میں وہ وہاں موجود تھے نمبردار نے انہیں دیکھتے ہی اندر کمرے میں بٹھایا اور دروازہ بند کردیا۔

وہ سب چونک کر اس کے اس انداز کو دیکھنے لگے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نمبردار نے انہیں دوبارہ کیوں طلب کیا ہے۔ناشتہ وغیرہ وہ کرچکے تھے اس لئے نمبردار کے پوچھنے پر انہوں نے چائے سے انکار کردیا یہ دیکھ کر نمبردار نے کچھ توقف کیا پھر ان سے رات پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل بتانے کے لیے کہا۔

نمبردار کے پوچھنے پر ان دونوں نے مکمل تفصیل سے شہر سے گاؤں کے اسٹیشن پر اترنے اور وہاں سے جلدی گھر پہنچنے کی غرض سے قبرستان والے راستے کو اختیار کرنے اور وہاں پیش آنے والے حالات اسے بتادیئے اور ساتھ ہی یہ کہ اگر اس وقت وہ سب وہاں اچانک نہ پہنچتے تو اس وقت وہ دونوں بھی اس عجیب وغریب جانور اور ان خونی ڈاکٹروں کی بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔جیسے جیسے وہ دونوں تفصیل بتاتے جارہے تھے۔

نمبردار ایک گمبھیر خاموشی سے ان کی باتوں کو سنتا جارہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بھی وقفے وقفے سے تبدیل ہوتا جارہا تھا ان کے خاموش ہوتے ہیں نمبردار کے منہ سے یوں سانس نکلی جیسے کسی گیس کے بھرے ہوئے غبارے سے یکدم ہوا نکلتی ہے۔اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ان دونوں کے علاوہ رحمت نے بھی محسوس کرلیں کچھ دیر تک سکتے کی سی حالت میں رہنے کے بعد اور ان کے پکارنے پر نمبردار نے اپنی آنکھوں کو جھپکا اور ان سب کو اپنی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

اس کا مطلب ہے کہ اس کے ایک بزرگ نے اس ویران قبرستان کے متعلق جو کہا تھا وہ بالکل سچ نکلا۔اس کے یہ الفاظ سن کر قاسم کو تجسس ہوا کہ ایسا کیا کہا گیا تھا کہ گاؤں کا نمبردار بھی گھبرا رہا تھا۔ان کے تفصیل پوچھنے پر نمبردار نے انہیں بتایا کہ بہت عرصہ قبل اس کے ایک بہت بوڑھے بزرگ نے اسے ایک ایسی بات بتائی تھی جس پر وہ یقین کرنے سے انکاری تھا لیکن اب جو حالات پیش آئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ان پچھلی باتوں پر یقین کرنے کو جی کرنے لگا ہے۔ان لوگوں کے استفسار پر نمبردار نجانے کن خیالوں میں ڈوب گیا اور اس کے منہ سے یوں الفاظ نکلنے لگے جیسے ان پر اس کا اختیار نہ رہا ہو۔

☆---☆---☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے والد صاحب مختار گڑھ کے چوہدری تھے یہاں پر بسنے والے تمام افراد ان کی دل سے عزت کرتے تھے ان کے ہر قسم کے دکھ درد میں وہ ہمیشہ کام آتے تھے اور ان کے مسائل کا فیصلہ اکثر وہ کرتے

تھے۔گاؤں کے تمام افراد ان کے فیصلے کو پتھر پر لکیر کی طرح تسلیم کرتے تھے۔

ان کے ایک دوست چوہدری اسلم تھے جو ان کی طرح وہاں سے دو گاؤں چھوڑ کر ان کے ہم منصب ہی تھے اور وہ بھی اپنے گاؤں میں ہر دلعزیز تھے۔ان کا ایک بیٹا راشد اپنے گاؤں کے اسکول سے تعلیم حاصل کر کے شہر کے کالج میں چلا گیا وہاں سے اچھی تعلیم حاصل کر کے وہیں ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا اسے ایک اچھا ڈاکٹر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا وہ ڈاکٹر بن کر اپنے گاؤں میں ہی ایک اسپتال بنا کر وہاں کے لوگوں کا علاج معالجہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ایف ایس سی میں اچھے نمبروں کی بدولت اسے شہر کے ایک میڈیکل کالج میں با آسانی داخلہ مل گیا اور وہ شوق سے اپنی تعلیم میں مگن ہو گیا۔کچھ دنوں کے بعد وہ اکثر گاؤں کا چکر لگاتا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کو بھی مل جاتا سب اس کی فرمانبرداری سے بہت خوش تھے اور اس کو پیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عزت بھی کرتے تھے یہ دیکھ دیکھ کر اس کا والد پھولے نہ سماتا تھا۔کہتے ہیں نا کہ انسان کو بگڑنے اور یا سدھرنے میں دیر نہیں لگتی اور اچھی صحبت اچھا درس دیتی ہے اور بری صحبت برا سبق پڑھاتی ہے۔شومئی قسمت کہ اس ہیرے جیسے انسان کو بھی برے دوستوں جیسی دیمک چاٹ گئی۔

وہ جس ہاسٹل میں رہ رہا تھا وہاں اس کے کمرے میں چار افراد کی گنجائش تھی اس کے ساتھ تیسرے جو تین دوست رہ رہے تھے وہ اچھی صحبت کے نہیں تھے یہ اسے کافی دنوں بعد معلوم ہوا شروع شروع میں تو انہوں نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس پر ان کے کسی بھی برے کردار کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہو رہا تو انہوں نے کسی نہ کسی طریقے سے اسے نشے کی لت لگا دی۔پہلے انہوں نے زبردستی کسی نہ کسی طریقے سے ایک سادہ سگریٹ پلا دی بعد میں سگریٹ نوشی کے ساتھ ساتھ ہیروئن وغیرہ کا نشہ استعمال کروانے لگے چونکہ یہ ایک ایسا نشہ ہے کہ اگر انسان ایک بار اس کا عادی ہو جائے تو بڑی مشکل سے جان چھوٹتی ہے وہ بھی اگر انسان خود چاہے تو ورنہ موت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

پہلے پہل تو وہ گھر والوں سے اپنی ضرورت کے مطابق پیسے منگواتا تھا لیکن اب جب اس کی ضرورت ناجائز طور پر بڑھ گئی تو اسے پیسوں کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی اور وہ جلدی جلدی کوئی نہ کوئی بہانہ وغیرہ بنا کر گھر سے پیسے منگوانے لگا۔اس کے دوسرے تینوں دوست تو نہ جانے کیسے اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے لیکن انہوں نے اس سے آج تک کبھی بھی کوئی پیسے طلب نہ کئے تھے۔

رفتہ رفتہ بری عادت کی وجہ سے وہ تعلیمی طور پر بھی بہت پیچھے چلا گیا اور پھر دوستوں کے بہکانے پر وہ جعلی عاملوں اور شعبدہ بازوں کے چنگل میں پھنس گیا۔بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس کے تینوں دوستوں کی ضرورتیں بھی یہی عامل پوری کرتے تھے اسی لئے وہ ہر وقت نوٹوں میں کھیلتے رہتے تھے لیکن ان تینوں کی یہ سیاست تھی کہ اگر وہ اسے بن مانگے پیسے دینے لگیں تو وہ اسے بھی اپنا ساتھی نہیں بنا سکیں گے جب تک اسے رقم کی طلب نہ ہو گی تب تک وہ ان کے سامنے بے بس ہو کر ان کا ساتھ نہ دے پائے گا اور کہتے ہیں کہ قطرہ قطرہ پانی گرنے سے پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے اسی طرح یہ وار اس پر بھی کارگر ثابت ہوا اور اس کے نتیجے میں وہ اس وقت ایک جعلی عامل کے آستانے پر موجود تھے اور اس کے تینوں دوست بھی اس وقت وہیں تھے۔

جعلی عامل گلے میں لکڑی کے منکوں سے بنی ایک لمبی تسبیح لٹکائے اور ہاتھ میں ایک پیالہ پکڑے ان کے سامنے دھونی جمائے بیٹھا تھا اس کے سامنے جلتی آگ پر دہکتے کوئلوں پر ایک بڑا سا تالابی مینڈک رکھا ہوا تھا جس کے جلنے کی بدبو سے چاروں طرف سڑاند پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ سب یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے سامنے کوئی مینڈک نہ ہو بلکہ باربی کیو کی دعوت ہو رہی ہو۔

کچھ دیر تک مینڈک کوئلوں پر جلتا رہا اور جلنے کی وجہ سے اس کے جسم کی تمام چربی باہر نکل کر کوئلوں پر بکھرنے لگی یہ دیکھ کر اس عامل نے اس چربی کو اپنی انگلی کی مدد سے لکیر اپنے سامنے بیٹھے چاروں دوستوں کے ماتھے پر ایک لکیر کھینچنی شروع کر دی ایسا وہ بار بار کر رہا تھا۔جب چاروں کے ماتھوں پر وہ ایسا کر چکا تو اس نے مینڈک پر ایک جانب رکھی راکھ سے مٹھی بھر کر پھینک دی۔اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ ان سب سے مخاطب ہوا۔

''دیکھو اگر تم لوگوں نے اپنی خواہشات کو پورا ہوتے دیکھنا ہے تو میری کہی ہوئی ہر بات پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ اس کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ معمول کا عامل کی باتوں پر چپ چاپ عمل کرنا ہوتا ہے اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بس شیطان کے کرم سے تم اپنے ہر مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔'' عامل نے بغور ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا جیسے کوئی اپنی پسند چیز کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔

اس کے جواب میں ان سب نے اس کی تائید کرنے کی ہامی بھری اور اس کی ہر بات کو تسلیم کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ دیکھ کر عامل نے انہیں اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور پھر سرگوشیوں میں انہیں کچھ بتانے لگا جسے سن کر وہ سب سر ہلانے لگے اور پھر اٹھ کر باہر کی جانب چل دیئے۔

☆---☆---☆

سہ پہر کے وقت جب یہ چاروں دوست اپنے شکار کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور جلد ہی انہیں اپنا شکار نظر آ گیا۔ عامل نے انہیں ایک صحت مند دس تا گیارہ سال کا بچہ تلاش کر کے اس کے سامنے لانے کا کہا تھا اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ صبح سے بھٹک رہے تھے ان کی تلاش کا مرکز زیادہ تر وہ سنسان گلیاں اور محلے ہی رہے تھے جہاں زیادہ رش نہ ہوتا کہ انہیں اپنے شکار کو پکڑ کر لیجاتے ہوئے کوئی دیکھ نہ پائے۔

یہی وجہ تھی کہ کافی دیر کے بعد انہیں ایک سنسان گلی میں ایک بچہ ہاتھ میں ایک پلیٹ پکڑے جاتے ہوئے دکھائی دیا جس نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو ایک سفید کپڑے سا ڈھانپ رکھا ہوا تھا شاید وہ محلے میں کسی گھر میں پلیٹ سے ڈھانپی چیز دینے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔

انہوں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا پھر اچھی طرح سے تسلی کرنے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور ان میں سے ایک لڑکے نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر جیب میں رکھا رومال نکال کر اس شیشی میں سے کچھ دوا اس پر لگائی شاید وہ کوئی بیہوشی کی دوا تھی جس کے لگاتے ہی اس نے جلدی سے سامنے سے گزرتے بچے کی ناک پر رکھ کر اس کا منہ سے زور سے دبا دیا بچہ شاید اس کے لئے تیار نہ تھا یوں اچانک اپنے ناک پر رومال رکھتے ہی اس کے ہاتھ سے پلیٹ نیچے زمین پر گر گئی اور وہ ایک بے جان چوہے کی طرح اس نوجوان کے ہاتھوں میں جھول گیا یہ دیکھ کر دوسرے تین دوستوں نے بھی جلدی سے لپک کر اس کا ساتھ دیا اور انہوں نے جلدی سے بچے کو زمین پر لٹا دیا اور پھر چند سیکنڈوں میں بچہ ان میں سے ایک کے کندھے پر لد اشہر سے باہر جانے والے راستے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ عامل اپنے ٹھکانے پر ہی موجود تھا جو اطلاع ملتے ہی ان کے سامنے آ گیا۔

بچے کو اس کے کندھے سے اس کے ایک چیلے نے جلدی سے جھپٹ کر اپنے کندھے پر لادا اور تیزی سے ایک جانب بنے دروازے کے اندر گھس گیا۔ عامل نے انہیں بیٹھنے کی بجائے واپس جانے کا اشارہ کیا اور وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہیں واپس چلے گئے۔ کافی عرصہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا وہ اس عامل کے مذموم مقاصد کے لئے یہ قبیح کام سرانجام دیتے رہے جس کے عوض وہ عامل ان کی جائز ناجائز شرائط من وعن مانتا رہا اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔

عامل ان بچوں کو شیطان کی بھینٹ چڑھا کر نہ جانے کون سے چلے پورے کرتا تھا کہ اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا اور وہ انہیں اور لاؤ اور لاؤ کہتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو وہ اس کی یہ خواہش کسی نہ کسی طرح پوری کرتے رہے لیکن آخر کب تک ایک دن ان چاروں نے عامل کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اب اس کی کوئی بھی ایسی بات نہیں مانیں گے جس میں انہیں مزید ایسا کوئی کام کرنا پڑے کیونکہ بچوں کی پے در پے گمشدگیوں کی وجہ سے اب شہر کے لوگ اور پولیس بھی چونکنی ہو گئی تھی اس لئے انہیں ایسا کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا اس لئے ان چاروں نے آپس میں یہی فیصلہ کیا کہ وہ اب اس عامل کی کوئی بھی ایسی فرمائش مزید پوری نہیں کریں گے جس کی وجہ سے انہیں اپنی جان مشکل میں پڑتی دکھائی دے۔

عامل ان کی یہ بات سن کر کچھ دیر تک کسی سوچ میں گم رہا پھر اس نے انہیں کل اپنے ٹھکانے پر آنے کا کہا کہ وہ ان سے کوئی بات کہنا چاہے گا لیکن چونکہ اس وقت اس کے کسی چلے کا وقت ہو رہا ہے اس لئے وہ یہ بات کل کہے گا۔ اس کی یہ بات سن کر وہ چاروں واپس لوٹ گئے۔ راستے میں وہ

سوچتے جارہے تھے کہ اب عامل نہ جانے کونسی ایسی بات کہے گا کہ جسے وہ پوری کر بھی سکیں گے یا نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اپنے دل میں یہ تہیہ ضرور کرلیا تھا کہ وہ اب اس کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔

☆---☆---☆

یہ دوپہر کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہوں گے جب وہ چاروں ایک اندھیرے کمرے میں زمین پر بچھی تپائی پر چوکڑی مارے بیٹھے تھے ان کے آگے ایک چنگیر میں کچھ مٹی کے بھنے ہوئے پاپ کارن رکھے تھے جنہیں وہ اپنی باتوں کے ساتھ ساتھ کھانے میں مصروف تھے غالباً یہ عامل کی طرف سے ان کے لئے مہمان نوازی کا کوئی انداز رہا ہوگا۔

کمرے کے باہر یوں آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی عورت زور زور سے کسی سے جھگڑ رہی ہو پہلے تو انہوں نے سوچا کہ باہر جاکر دیکھیں کہ معاملہ کیا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ہمیں اس سے کیا وہ دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر سے آنے والی آوازیں یکدم خاموش ہوگئیں اور کمرے میں عامل داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جس میں کوئی سرخ رنگ کی سیاہی مائل چیز نظر آرہی تھی اس نے وہ پیالہ لاکر ان چاروں کے درمیان رکھ دیا اور خود بھی چوکڑی مار کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا

۔

''تم چاروں اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہوگئے ہو اس لئے تمہیں سونپا ہوا میرا پچھلا کام اب دوبارہ نہ ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے گرو شیطان نے ایک اور کام تم چاروں کے لئے منتخب کیا ہے جس کی وجہ سے میں نے تم چاروں کو یہاں بلایا ہے اس کے لئے سب سے پہلے تمہیں اس پیالے سے ایک ایک گھونٹ بھرنا ہوگا اس کے بعد میں تمہیں دوسرا کام بتاؤں گا جس کے کرنے کے بعد تم چاروں امر ہوجاؤ گے اور تم چاروں کی جو بھی خواہش ہوگی وہ ضرور پوری ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے پیالہ زمین سے اٹھا کر ان کے سامنے کردیا جیسے انہیں پینے کا کہہ رہا ہو۔

پہلے تو وہ چاروں ہچکچاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے کہ جیسے فیصلہ کررہے ہوں کہ اس پیالے میں سے پہلا گھونٹ کون بھرے گا؟ یہ دیکھ کر عامل نے اپنے سامنے دائیں جانب بیٹھے ایک نوجوان کی طرف وہ پیالہ بڑھا دیا جسے اس نے پکڑ کر ایک گھونٹ بھر لیا۔

خدا کی پناہ وہ سیاہی مائل چیز کچھ اور نہیں بلکہ انسانی خون تھا لیکن وہ ایک گھونٹ بھر چکا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے حلق میں جلتے ہوئے انگارے انڈیل دیئے ہوں۔ اس نے جلدی سے وہ پیالہ اپنے ساتھ بیٹھے دوسرے دوست کی طرف بڑھا دیا اس طرح ان سب نے باری باری ایک ایک گھونٹ اپنے اپنے حلق سے اتار لیا۔

عامل خاموشی سے بیٹھا انہیں گھونٹ بھرتے دیکھتا رہا پھر آخری نوجوان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر اس میں بچا ہوا باقی خون خود غٹا غٹ پی گیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے انہیں بتایا کہ شیطان نے تاکید کی ہے کہ اب انہیں زندہ بچوں کی بجائے مردہ بچوں کی لاشیں لانا ہونگی اور وہ بھی کسی قبرستان سے نہیں بلکہ اسپتالوں کے مردہ خانوں سے اور جنہیں مرے ہوئے صرف چوبیس گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔ اگر وہ کم ازم دس ایسے بچوں کی لاشیں اسے لادیں گے تو نہ صرف شیطان کے خاص چیلوں میں ان کا شمار ہوگا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایک ایسی قوت حاصل ہوجائے گی جس کی مدد سے وہ اپنی ہر خواہش پوری کرسکیں گے۔

عامل نے کچھ اس طرح سے اپنے جال میں پھنسایا کہ وہ اس کا یہ مکروہ کام کرنے کی ہامی بھر بیٹھے۔ انہیں اس کام کے لئے زیادہ فکر اس لئے نہیں تھی کہ وہ چاروں میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹس تھے اور اس مقصد کے لئے مختلف اسپتالوں میں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا اور اپنے اس کام کو بخوبی پورا کرپائیں گے یہی سوچ کر انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد عامل کی بات تسلیم کرتے ہوئے اسے دس بچوں کی لاشیں مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور دوبارہ واپس لوٹ گے۔

قصہ مختصر کہ یہ کام بہت عرصے تک جاری رہا اور اس دوران انہوں نے اس عامل کا کام پورا کردیا لیکن اس دوران عامل نے نہ جانے کس طرح انہیں انسانی لاشیں کھانے کی طرف راغب کیا کہ وہ چاروں آخوری پر اتر آئے اور عامل کو مہیا کئے جانے والے بچوں کے مردہ جسموں کے کچھ حصے ان کے معدوں میں بھی موجود تھے جنہیں انہیں عامل کے کہنے پر لقمۂ بنایا تھا۔ شہر میں یہ بات

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اسپتالوں کے مردہ خانوں سے بچوں کی تازہ لاشیں غائب ہونے لگی تھیں اور اسپتالوں کی انتظامیہ اور پولیس نے مل کر ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرلیا تھا کہ جو کوئی بھی ایسا کررہا تھا وہ اب بچ نہیں پائے گا۔

یہ سب تیاریاں ظاہر ہے انہوں نے بھی سن اور دیکھ لی تھیں اس لئے وہ سب بھی اب بہت محتاط ہوگئے تھے ایک روز انہوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ اسپتالوں کی شرط صرف عامل نے اپنے کسی چلے کے لئے مخصوص کی تھی لیکن چونکہ وہ صرف انسانی گوشت کھانے کے رسیا تھے اس لئے انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ مردے اسپتالوں کے ہوں یا کسی قبرستان کے اس لئے انہوں نے شہر سے کسی گاؤں میں جاکر اپنے اس مذموم کام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کالج میں پڑھائی میں وہ چاروں پورے پورے ہی تھے اس لئے فیل پاس کا انہیں کوئی خاص ڈر نہیں تھا۔

لیکن گاؤں جانے کا فیصلہ انہوں نے کالج کی چھٹیوں میں کیا اس لئے چھٹیوں کے اعلان کے فوراً بعد انہوں نے سب سے پہلے راشد کے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ ان چھٹیوں میں وہ اس کے گاؤں کے ساتھ ساتھ مختار گڑھ کے ایک ویران قبرستان میں بھی اپنا مذموم کام جاری رکھ سکیں۔ اس فیصلہ میں راشد نے انہیں خود دعوت دی تھی اس طرح ان چاروں کو اس کے گھر رکنے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ راشد وہاں کے چوہدری اسلم کا بیٹا تھا اور ان کی بڑی سی حویلی میں بہت سے کمرے موجود تھے اس لئے دولت کی ریل پیل ہونے کی وجہ سے اس نے انہیں یہ آفر کی تھی جسے سب نے خوشی خوشی قبول کرتے ہوئے سفر کا پلان بنالیا تھا۔ دوسرے روز وہ سب ایک ٹرین سے گاؤں کی جانب روانہ ہوگئے اور گاؤں پہنچ کر انہوں نے حویلی میں ہی قیام کیا راشد کے والد اور گھر والوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں رہنے کے لئے حویلی کے آخری کونے میں کمرے سیٹ کروادیئے اور اس وقت وہ راشد کے کمرے میں اکھٹے بیٹھے اپنے آئندہ پلان کے بارے میں گفتگو کررہے تھے۔

☆---☆---☆

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہوگا جب حویلی کے پچھلے دروازے سے چار سائے جنہوں نے سفید گاؤن پہنے

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ آنچل — ماہنامہ حجاب کراچی

ہم ہر وقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کریں گے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 850 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

8000 روپے

میڈل ایسٹ ایشیائی افریقہ یورپ کے لیے

6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ منی آرڈر منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔

مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242

نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز

81 فیضیر پرنٹنگ ہاکی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبر: +922-35620771/2

naeyufaq.com
Info@naeyufaq.com

ہوئے تھے آہستہ آہستہ چلتے گاؤں کے باہر جانے والے راستے پر چل رہے تھے ان کے چلنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ راستے سے بخوبی واقف ہوں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت گاؤں میں کوئی کتا نظر نہیں آرہا تھا یا شاید گاؤں کے کتوں کو کسی چور کے آنے کی امید نہ تھی اس لئے وہ بھی چین کی نیند سو رہے ہونگے۔ وہ چاروں چلتے چلتے گاؤں کے ویران قبرستان کی جانب بڑھنے والے راستے پر پہنچ گئے اور جھاڑیوں سے بچتے بچاتے سامنے موجود درختوں کی جانب بڑھنے لگے اور جھنڈ کے نزدیک پہنچ کر رک گئے۔

ان چاروں میں سے ایک نوجوان تیزی سے ایک جانب بڑھ گیا اور اپنے ساتھ گاؤں کی واحد ڈسپنسری سے چرایا ہوا ایک بوسیدہ اور بہت پرانا سا اسٹریچر دھکیلتا ہوا لانے لگا جس پر ایک پرانی سی کدال بھی رکھی تھی۔ یہ کام انہوں نے ڈسپنسری کے بند ہوتے ہی کسی وقت سرانجام دے لیا تھا اور اس کے لئے انہیں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ راشد نے گھر سے ایک ٹریکٹر ٹرالی کا بندوبست کر لیا تھا اور اسے یوں بھی ٹریکٹر ٹرالی چلاتے ہوئے کئی بار گاؤں کے لوگوں نے دیکھا تھا اس لئے زیادہ غور نہیں کیا اور وہ چوری شدہ اسٹریچر، دو تین چھریاں اور کدال ویران قبرستان میں درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں انہوں نے ایک تازہ قبر سے ایک لاش نکال کر اس اسٹریچر پر لٹا دی اور کفن اتار کر اپنے اپنے ہاتھوں میں پکڑی چھریوں کی مدد سے اس لاش کے جسم کو ادھیڑنے لگے اس وقت یہ منظر اگر کوئی بہادر شخص بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو شاید کھڑا کر یہاں سے راہ فرار اختیار کر لیتا۔ لاش کے بازوؤں، ٹانگوں اور نرم حصوں کو اپنے اپنے معدے میں اتار کر انہوں نے دوبارہ اسٹریچر کو گھسیٹ کر اسی درختوں کے جھنڈ کے اندر لیجا کر چھپا دیا جہاں سے اسے برآمد کیا تھا۔

اس کارروائی میں انہیں تقریباً تین گھنٹے لگ چکے تھے۔ اب رات کے چار بجنے والے تھے اور انہوں نے جلدی جلدی گاؤں کی جانب قدم بڑھانے شروع کر دیئے انہیں اس بات کی فکر تھی کہ کہیں کوئی کسان انہیں دیکھ نہ لے کیونکہ گاؤں میں کبھی کبھار جب فصل کو پانی دینے کی باری ہوتی تھی تو کسان منہ اندھیرے گھروں سے نکل پڑتے تھے اور رات کے اندھیرے میں فصلوں کو پانی دیتے تھے۔ لیکن کافی فاصلہ طے کرنے کے باوجود انہیں ابھی تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں حویلی کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

حویلی سے نکلتے وقت انہوں نے پچھلے دروازے کو بند کر دیا تھا اس لئے واپس بھی اسی راستے سے حویلی میں داخل ہو گئے اور کسی کو بھی کانوں کان خبر تک نہ ہوئی اور وہ سب اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ کالج کی چھٹیاں اتنی نہیں تھیں کہ وہ زیادہ دن گاؤں میں رکتے اس لئے کچھ دنوں تک انہوں نے گاؤں میں قیام کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا اور ایک دن وہ واپسی کی ٹرین سے شہر روانہ ہو گئے۔

☆---☆---☆

ٹرین فراٹے بھرتی شہر کی جانب رواں دواں تھی لوکل ٹرین ہونے کی وجہ سے اس میں زیادہ رش نہ تھا صرف وہ لوگ ہی ڈبوں میں نظر آرہے تھے جو روزانہ گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں سفر کرتے تھے یہ چاروں بھی اس وقت ایک بوگی میں بیٹھے اپنے آئندہ پلان کے متعلق باتوں میں مصروف تھے۔ گاؤں میں آنے کا تجربہ ان کے نزدیک بہت اچھا رہا تھا اور کسی شک بھی نہیں ہوا تھا اور انہوں نے یہی فیصلہ کیا اسی طرح چھٹیاں گزارنے کے لئے ایک دوسرے کے گاؤں میں جا کر اپنی خونی ہوس بجھا لیا کریں گے ورنہ شہر میں تو اس وقت عوام کے ساتھ ساتھ پولیس بھی ایسے افراد کی تلاش میں تھی جو مختلف اسپتالوں کے مردہ خانوں سے لاشیں غائب کر رہے تھے۔

گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے انہیں کسی نے پکڑ کر زور سے زمین پر پٹخ دیا ہو وہ سب جو آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے یوں اچانک دھکا لگنے سے سنبھل نہ پائے اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے بوگی میں لڑھکتے چلے گئے اس کے ساتھ ساتھ ان پر دوسرے مسافر بھی بمعہ اپنے سامان کے گرتے چلے گئے اور پھر بیہوشی ان سب کا مقدر بن گئی۔

ٹرین ریلوے لائن پر سے گزرنے والے ایک گائے بھینسوں کے ریوڑ سے اچانک ٹکرا گئی تھی اور اپنا توازن

برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ان سب سے جا ٹکرائی اور ڈگمگاتا ہوا انجن اچانک پٹڑی سے اتر کر نیچے کھیتوں میں جا گرا اور اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے آگے بڑھتے ڈبے بھی پے در پے ایک دوسرے سے ٹکراتے نیچے اتر کر ریلوے لائن پر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی مسافروں میں عورتوں اور بچوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا کسی کو کسی کی کوئی فکر نہ تھی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بالکل ٹھیک تھے اور شاید اسی وجہ سے انہیں حالات کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور انہوں نے بھاگ بھاگ کر زخمیوں کی مدد کرنی شروع کر دی وہ سامان کے نیچے مسافروں کو اس کے نیچے سے نکالنے لگے۔

ٹرین کا انجن جس جانب گرا تھا اس طرف ایک تالاب بنا ہوا تھا جس میں غالباً برسات کا پانی جمع تھا اس لئے انجن آدھا اس پانی کے تالاب میں ڈوبا ہوا تھا شاید اسی وجہ سے اس میں بیٹھا اس کا ڈرائیور بھی زیادہ چوٹیں کھانے سے محفوظ رہا۔ اپنی مدد آپ کے تحت وہ کسی نہ کسی طرح سے خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا اور ہوش بحال ہوتے ہی اس نے انجن میں موجود کسی خودکار آلے کی مدد سے اپنے اگلے اسٹیشن پر اس حادثے کی اطلاع پہنچانی شروع کر دی اور جلد ہی اسے اس کا مثبت جواب موصول ہو گیا اور تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ انہیں دور سے ایک انجن کی آواز سنائی دی چونکہ اگلے اسٹیشن کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا اس لئے انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ انجن اس حادثہ کی جگہ آن کر رک گیا۔

اس میں سے کچھ افراد اتر کر حادثے والی جگہ کی جانب دوڑے ڈرائیور ان کے ساتھ ساتھ رہا وہ انہیں حادثے کے متعلق تفصیل بتاتا جا رہا تھا۔ بہت سے افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بچ جانے والے مسافروں کی چیخ و پکار سے فضا گونج رہی تھی ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا بہت سے ایسے مسافر بھی تھے جو بری طرح ڈبوں میں پھنسے ہوئے تھے لیکن انہیں نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ انجن کیساتھ آنے والوں نے یہ دیکھ کر شہر کے بڑے اسٹیشن پر رابطہ کیا اور انہیں جلد از جلد طبی امداد بھیجنے کا کہا۔

گھنٹوں تک انتظار کی کیفیت کے بعد انہیں شہر سے طبی امداد فراہم کر دی گئی اور بچ جانے مسافروں کو جلد از جلد شہر کے اسپتال میں منتقل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی اور فوت شدہ مسافروں کو بھی ایمبولینسوں میں لاد کر شہر روانہ کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہلے فوت شدہ مسافروں کو اسپتال کے مردہ خانوں میں منتقل کیا جائے گا پھر ان کی شناخت کرا کر ورثاء کے حوالے کیا جائے گا۔ ان چاروں کو بھی ایک ایمبولینس میں لاد کر شہر کے کسی اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ان میں سے تین کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے وہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہوں لیکن ایک کے ہلکے ہلکے کراہنے کی وجہ سے امید کی کچھ کرن دکھائی دیتی تھی لیکن اس کی سانسیں بھی بڑی بے ترتیبی سے چل رہی تھیں۔ جیسے وہ بھی کچھ لمحوں کا مہمان ہو۔

ایمبولینس کے ڈرائیور نے یہ دیکھ کر جلدی سے اس کے منہ سے آکسیجن لگا دی جس سے اسے زندہ بچ جانے والے نوجوان کی سانسیں بحال ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر ڈرائیور نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے جلدی سے گاڑی شہر کی جانب بھگانی شروع کر دی وہ جلد از جلد کسی نزدیکی اسپتال میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جلد ہی شہر میں داخل ہونے سے پہلے اسے ایک اسپتال دکھائی دیا اور وہ تیزی سے گاڑی بھگاتا اس کے ایمرجنسی وارڈ کی طرف جانے والے راستے پر بڑھتا چلا گیا پورچ میں گاڑی رکتے ہی باہر موجود اسپتال کے عملے نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں موجود افراد کو اسٹریچر پر لاد کر اسپتال کے اندر لے گئے۔ اندر پہنچتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ چاروں افراد میں سے تین اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں اس لئے انہیں تو انہوں نے جلدی سے اسپتال کے مردہ خانے میں منتقل کر دیا لیکن بچ جانے والے نوجوان کو جلدی سے ایمرجنسی وارڈ میں لیجا کر مرہم پٹی کرنے لگے۔

جسم کی کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی تھی لیکن جسمانی چوٹیں اور جسم کے گوشت کا کچھ حصہ کہیں کہیں سے کٹ گیا تھا جس میں سے خون رس رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مرہم پٹی وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اسے مردانہ وارڈ میں منتقل کر دیا گیا اب اس کی حالت قدرے بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی اسے وارڈ میں داخل کئے کچھ ہی گھنٹے گزرے تھے کہ اس کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے وہ زور زور سے بیڈ پر اچھلنے لگا یوں لگتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کے جسم کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی ہو۔ اس

کی حالت دیکھتے ہی اس کے وارڈ میں دوسرے مریضوں کے لواحقین نے شور مچانا شروع کردیا اور کچھ ہی دیر میں اس وارڈ میں جیسے ایمرجنسی کا سماں بندھ گیا اور ڈاکٹروں اور نرسوں کی دوڑیں لگ گئیں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے حالانکہ کچھ گھنٹوں قبل اس کی حالت خطرے سے باہر تھی اسی لئے انہوں نے اس نوجوان کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے عام وارڈ میں شفٹ کیا تھا۔

تھوڑی دیر میں بڑی مشکل سے اس نوجوان کو چند انجکشن دیئے گئے لیکن اس کے باوجود اس کی حالت سنبھلی نہیں تھی۔اس کے تڑپنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے جسم کو بری طرح سے توڑ مروڑ رہا ہو اور اس تکلیف سے اس کے منہ سے بہت بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں جن کی وجہ سے پورے اسپتال میں ایک خوف کی سی کیفیت طاری تھی۔

وارڈ میں موجود افراد چاروں طرف گھیرا بنائے اس نوجوان کے قریب کھڑے بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ابھی تمام افراد اس کی حالت درست ہونے کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے کہ اچانک اس کے جسم میں یوں لکیریں نمودار ہونے لگیں جیسے بارش کے بعد اچانک کڑک دھوپ پڑنے سے کچے مکان چٹخنے لگتے ہیں۔اس کی یہ حالت دیکھتے ہی لوگ ڈر کر وہاں سے ہٹ گئے اور دور کھڑے ہوکر اس نوجوان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔دو تین افراد تیزی سے بھاگتے ہوئے کہیں سے ڈاکٹر کو بلا لائے لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس نوجوان کا سارا جسم یوں پھٹنا شروع ہوگیا جیسے کوئی لٹھے کے کپڑے کو قینچی کی مدد کے بغیر ہی پھاڑنے کی کوشش کررہا ہو۔ نوجوان کے منہ سے سیاہی مائل خون نکلنا شروع ہوگیا اور اچانک اس کے جبڑوں کے دونوں کناروں سے ڈریکولا کے دانتوں کی مانند دو دانت ہونٹوں سے باہر نکل آئے۔لیکن اب وہ تکلیف کی شدت سے بیہوش ہوچکا تھا اور اس کا جسم آہستہ آہستہ پھٹتے ہوئے پوری طرح ادھڑ چکا تھا۔

لوگوں میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا اور بہت سے کمزور دل حضرات وہاں سے رفو چکر ہوگئے تھے لیکن چند لوگ جو غالباً مضبوط اعصاب کے مالک رہے ہونگے وہیں براجمان رہے۔ڈاکٹروں کے لئے یہ ایک عجیب وغریب واقعہ تھا جو وہ سمجھنے سے قاصر تھے باہمی مشورے سے انہوں نے جلدی سے پولیس کو اطلاع دی اور کچھ ہی دیر میں مقامی پولیس کے چند افسران وہاں موجود تھے۔انہوں نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد فوری اسے پوسٹ مارٹم کے لئے ایمبولینس میں ڈالا اور پولیس ہیڈکوارٹر کی جانب بڑھ گئے۔

☆---☆---☆

تھانے کے باہر لوگ ہجوم کی صورت اکٹھے ہو چکے تھے اور پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ مقامی اسپتال میں کوئی ڈریکولا لایا گیا تھا جو اب مر چکا ہے اور پولیس اسے تفتیش اور پوسٹمارٹم کے لئے پولیس ہیڈکوارٹر کے اسپتال میں لے آئی ہے۔لوگ تجسس کی وجہ سے تھانے کے باہر ایک ہجوم کی طرح اکٹھے کھڑے چہ مگوئیاں کررہے تھے۔کچھ لوگ بے سروپا باتیں کرکے لوگوں میں مزید خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کررہے تھے۔غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔کافی دیر گزرنے کے بعد تھانے کے اسپتال سے ایک آفیسر چند ڈاکٹروں کے ساتھ باہر آتا دکھائی دیا جسے دیکھتے ہی سب اس کی طرف لپکے۔اس نے لوگوں کو قریب آتا دیکھ کر ڈاکٹروں سے آہستہ سے کچھ کہا جسے سنتے ہی سب نے تائید میں اپنے سر ہلا دیئے۔

لوگوں کے استفسار پر وہ پولیس آفیسر انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔جیسے جیسے وہ انہیں تفصیل بتاتا جارہا تھا ویسے ویسے لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتے رہے۔لیکن اس ساری تفصیل میں وہ یہ بات گول کر گیا کہ وہاں کوئی ڈریکولا لایا گیا ہے شاید ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں میں خوف و ہراس کی فضا قائم ہو لیکن اس نے لوگوں کی طرف سے پھیلائی ہوئی بے سروپا باتوں کو جھوٹ کا پلندہ کہہ کر وہاں موجود افراد کو مطمئن کردیا تھا اور پھر اپنے سینئر افسران کے ساتھ باہمی مشورہ کرکے رات کے اندھیرے میں چپکے سے اس ڈریکولا کی لاش کو قبرستان میں دفن کردیا اور اس طرح سے اس عجیب وغریب کہانی اپنے انجام کو پہنچی۔

pakistanipoint.com

شرارت

ایم زیڈ شیخ

جنات کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ کبھی کبھی ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم پر کس قسم کے اثرات ہیں اور در در مارے پھرتے ہیں، روحانیت میں ہر کوئی دھوکہ باز نہیں ہوتا بلکہ اس میں اللہ والے ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو بغیر کسی غرض و لالچ کے لوگوں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

ایسے انسان کا قصہ جو حقیقت سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن تھا کہ اس سے ایک جن ٹکرا گیا

حافظ ایوب صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ جو کوئی بھی ان سے ملنے جاتا وہ دوبارہ ملاقات کی آرزو ضرور رکھتا تھا۔ روحانی علوم کے ماہر تھے۔ منطق، چلہ، حکمت، اہل بحر اور شاید ہپناٹزم کے بھی ماہر تھے..... شیریں بیاں تھے مگر شخصیت پیاز کی مانند تہہ در تہہ چھپی ہوئی تھی۔ اکرا لگ سے پیروں، فقیروں کا لبادہ اوڑھ لیتے تو شاید مال و دولت کی ریل پیل ہوتی مگر انہوں نے عام دنیادار کی طرح زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتوار کا دن لوگوں کے مسائل سننے کے لیے مختص تھا۔ اپنی استطاعت اور علم کے مطابق ان کا حکیمی یا روحانی حل تجویز کرتے تھے۔ باقی ایام میں بھی اکثر پریشان حال لوگ دن یا رات میں ان کے گھر پر موجود ہونے کی صورت میں پہنچ جاتے تھے۔

وہ بہار کی ایک خوبصورت صبح تھی جب وہ فجر کی نماز ادا کر کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک کم و بیش چالیس سالہ عورت ایک بچی کے ساتھ ان کے گھر پہنچی۔

''حافظ ایوب صاحب کا گھر یہی ہے؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جی یہی ہے۔'' چھوٹی مانو نے کہا اور اونچی آواز میں حافظ صاحب کو آواز دی۔ ''پاپا! مہمان آئے ہیں۔'' یہ مخصوص جملہ تھا جو بچوں کو بھی ازبر تھا اور وہ بھی عادی ہو چکے تھے روز روز نئے لوگوں کو دیکھ کر۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے جہاں وہ عورت ان کا انتظار کر رہی تھی۔

''میری بچی کو بچالیں حافظ صاحب آپ کو اللہ رسول کا واسطہ میری بچی کے اوپر جنات کا سایہ ہے۔'' حافظ صاحب کو لوگوں کے عقائد کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے وہ کسی کی بات کا برا نہیں مناتے تھے۔ بچی گم صم سی خلا میں کسی نقطے کو گھور رہی تھی۔

''آپ لوگ اوپر والے مکان میں جا کر بیٹھیں ان شاہ اللہ بہتر حل تجویز کروں گا باقی شفاء اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے اور یاد رکھیں کہ ہر الٹی چیز کے پیچھے جنات نہیں ہوتے ان کے پاس اتنی فراغت نہیں ہوتی کہ وہ انسانوں کے ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑائیں بہرحال آپ اوپر تشریف لے جائیں میں ذرا چائے کا گھونٹ بھر کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹا جاؤ مہمانوں کو اوپر چھوڑ آؤ۔'' ملازم کو ان کے لیے چائے کا کہہ کر اپنی پیالی اٹھا کر چائے پینے لگے جو کہ ملازم ان کے آتے ہی رکھ چکا تھا۔ ان کے چائے پینے کے دوران ہی اوپر شور کی آواز بلند ہوئی۔

''ہائے مر گیا حافظ صاحب!'' یہ آواز ان کے ملازم کی تھی جو مہمانوں کو چھوڑنے گیا تھا۔ انہوں نے کپ وہیں چھوڑا اور اوپر کی جانب دوڑے جہاں ایک عجیب و غریب منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

❖❖❖❖

سفیر زندگی کی سولہ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ یہ عمر جسے ٹین ایج بھی کہتے ہیں اندھی اور خاصی خطرناک عمر ہوتی ہے۔ سفیر کے لیے تو اور بھی خطرناک تھی کیونکہ وہ بچپن ہی سے

شرارتوں میں پی ایچ ڈی تھا۔ پورا گاؤں اس کی شرارتوں سے تنگ تھا۔ بچے تو ہوتے ہی شرارتی ہیں مگر اس انتہا کا شرارتی پورے گاؤں میں کوئی نہیں تھا۔ ایک بار کسی شادی کے موقع پر پٹاخے لے کر دوستوں کے ساتھ انوکھی مہم کو نکل پڑا۔ کسی نے بتایا کہ شادی والے گھر میں کافی گھوڑے موجود ہیں۔ اس نے اپنی ٹیم کو ساتھ لیا اور اصطبل میں پہنچ گیا گھوڑوں کے قریب چند پلاسٹک کی خالی بوتلیں رکھی اور ان میں پٹاخوں کو جلا کر ایک ایک کر کے ڈالتا جاتا۔ اب جوں ہی زوردار دھماکے سے پٹاخہ پھٹتا تو گھوڑے ہنہناتے اور وہ دوستوں کے ساتھ قہقہے لگاتا۔ ایک پٹاخہ بوتل میں گرنے کے بجائے نیچے گرا تو اچانک ہی پورے اصطبل میں آگ بھڑک اٹھی جس نے پورے اصطبل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سفیر اور اس کے دوست دروازے کے قریب تھے وہ الٹے قدموں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں شادی والے گھر میں کہرام مچ گیا۔ آگ..... آگ..... آگ کے شور نے سارے گاؤں میں کھلبلی مچادی۔ خشک لکڑیوں سے بنا اصطبل اور اس میں موجود خشک گھاس جو رکھی تھی دونوں نے مل کر آگ کو مزید ایندھن فراہم کیا تو گھوڑے بھی آگ کی لپیٹ میں آگئے۔

گاؤں کے لوگوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ مشکل کی گھڑی میں وہ اپنے ہمسایوں کی مدد جان پر کھیل کر بھی کرتے ہیں ایسے ہنگامی حالات و حادثات میں اپنی لڑائیاں اور کدورتیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ چونکہ شادی والا گھر تھا اس لیے آدھے گھنٹے کے اندر اندر آگ پر قابو پایا گیا۔ گھوڑے بچ تو گئے تھے مگر نہ بچنے کے برابر۔ سفیر اور اس کے ہمنوا سہمے ہوئے تھے مگر ان کی خوش قسمتی کہ انہیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ آگ لگنے کا سبب یہ دریافت کیا گیا کہ چونکہ جنریٹر جو کہ پاور سپلائی کے لیے لایا گیا تھا وہیں باہر دروازے کے قریب اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر ہو نہیں پایا تھا اسے اٹھا کر آگے لے جایا گیا تھا مگر بدقسمتی سے اس میں سے پیٹرول گر کر دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ اب قیاس یہ کیا جا رہا تھا کہ کسی نے جلتا سگریٹ بے دھیانی میں اندر پھینک دیا تو اس کے سبب آگ نے سارے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب سگریٹ نوشی والے افراد چور کی داڑھی میں تنکا والی مثال کی طرح اپنی اپنی جیب سے سگریٹ غائب کرنے کے چکر میں پڑ گئے کہ کہیں شک کی بنا پر مارے نہ جائیں۔

اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی سفیر کی لاابالی اور شرارتی

طبیعت پر ذرا برابر بھی فرق نہ پڑا اگلے دن سے پھر وہی سب کچھ شروع ہو جاتا۔

❖❖❖❖

وہ ہفتے کی رات تھی حافظ صاحب نے اصرار کر کے بابر کو رات وہیں روک لیا تھا۔ بابر گو کہ بچوں کا ٹیوٹر تھا مگر اس کی اہمیت گھر کے ایک فرد جیسی ہی تھی۔ وہ کرکٹ کا شوقین تھا اور میچ ٹیلی ویژن پر مل کر دیکھنے میں جو مزا تھا وہ اکیلے میں نہیں آتا تھا۔ ان کے بچوں نے بھی اصرار کیا تو بادل ناخواستہ اسے رکنا ہی پڑا۔ میچ نو بجے شروع ہونا تھا اس لیے کھانا جلدی کھا لیا گیا اور گھر کے تمام افراد مل کر گپ شپ کرنے لگے۔ حافظ صاحب کے بڑے بھائی کرکٹ کے جنون کی حد تک شیدائی تھے۔ اس لیے وہ بھی قبل از وقت تشریف لے آئے تھے۔ ان کے ایک دوست بھی موجود تھے۔ جنھیں نمبردار صاحب کہا جاتا تھا۔ بات چیت جاری تھی ان کے بھائی بولے۔

''سنا ہے آج کل جنگل سے آدم خور ایک، گاؤں میں گھس آیا ہے۔'' بابر ان کی بات سن کر مسکرا دیا تو پاس بیٹھے ان کے ملازم نے جوئی وی دیکھ رہا تھا چونک کر پوچھا۔

''یہ آدم خور کیا ہوتا ہے جی؟''

''آدم خور کا مطلب ہے، آدم زاد یعنی انسانوں کو کھانے والا۔'' بابر نے مسکراتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''ویسے میں ایسی کسی بھی مخلوق سے انکاری ہوں۔ جنات کی حقیقت سے تو سب واقف ہیں قرآن و حدیث سے ثابت ہے مگر یہ عجیب و غریب اشیاء اور ان جیسی بہت سی..... میرے حلق سے نہیں اترتی یہ باتیں ویسے۔''

''سر! آپ کو جس دن ملانا پھر یقین آئے گا۔'' ان کے بیٹے نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوتا سب خوفناک کہانیوں اور ہارر فلموں اور ڈراموں کی پیداوار ہیں۔''

''سر ذرا ملازم کو ڈرائیں گے آپ تھوڑی دیر ہماری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔'' ان کے بڑے بیٹے نے انگریزی میں کہا تو بابر مسکرانے لگا اور پھر بولا۔

''یار سچی پوچھو تو یہ جنات ہی کی بگڑی ہوئی شکل میں ہوتے ضرور ہیں مگر آبادی کی طرف رخ کرنے سے کتراتے ہیں۔''

''ہمارے دادا باوا بتاتے تھے کہ ایک بار ان کا راستہ روک لیا تھا ایک آدم خور نے۔'' نمبردار صاحب نے پرانے زمانے کے قصہ گو کی طرح ایک من گھڑت قصہ شروع کیا۔

''اچھا! پھر.....؟'' حافظ صاحب سمیت سب ہمہ تن گوش ہو گئے ان میں سے اکثر جانتے تھے کہ یہ فرضی قصہ ہے۔

''بس کیا بتاؤں سر سے پاؤں تک اتنے اتنے لمبے بال تھے۔'' انہوں نے دایاں ہاتھ بائیں کہنی تک لے جا کر بتایا تو بابر نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولتے رہے۔

''اس دن چاند کی آخری تاریخ تھی اور جیسا کہ حافظ صاحب جانتے ہیں اسے اماوس کی رات کہتے ہیں اور وہ رات آج والی رات ہے یعنی آج کا ہی دن تھا۔ اماوس کی رات غیر انسانی مخلوق کے لیے ایک طرح سے کھلی چھوٹ ہوتی ہے کہ وہ آبادی کا رخ کریں۔ خیر اماوس کی اس رات وہ اپنے گھر آ رہے تھے کہ آدم خور ان کے راستے میں آ گیا۔ وہ عجیب و غریب انداز میں ان کے سامنے اپنی ران پر ہاتھ مارنے لگا جس سے عجیب قسم کی آواز آ رہی تھی۔ دادا باوا کے ہاتھ میں اُسترا تھا جو وہ بازار سے اپنے لیے لے جا رہے تھے ان کی خوش قسمتی کہ اس میں بلیڈ بھی پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسی استرے سے آدم خور کی گردن پر وار کر دیا۔ وہ آدم خور زمین سے کئی فٹ اوپر اچھلا اور دادا جان کے اوپر حملہ آور ہو گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دادا جان نیچے تھے جب کہ وہ ان کے اوپر۔ آس پاس کوئی آدم زاد نہ تھا جو اس دھما چوکڑی کی آواز سن کر ان کی مدد کے لیے آتا۔ ایسے حال میں انہیں ایسے لگا جیسے اب تب میں وہ موت کو گلے لگا لیں گے۔ وہ ان کے اوپر بے جان پڑا ہوا تھا اور اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے دادا باوا کو یقین تھا کہ اب تب میں اس کے دانت ان کی گردن میں گھس جائیں گے۔ مگر کافی دیر تک ایسا نہ ہوا آخر کار انہوں نے کوشش کر کے اسے اپنے اوپر سے دھکیلا تو ان پر انکشاف ہوا کہ ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا استرا سیدھا آدم خور کے دائیں طرف موجود دل میں جا گھسا ہے۔'' ملازم ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور اندر ہی اندر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بچے اپنی شرارت میں کامیاب رہے تھے انہوں نے اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا۔

باقی سب لوگوں کے لیے تو وہ ایک مذاق ہی تھا، مگر اس ملازم نے اس بات کو کافی سنجیدگی سے لیا۔ وہ کچھ خوفزدہ سا لگ

رہا تھا باہر کسی چیز کے لیے جاتا تو کسی کو ساتھ لے کر جاتا۔ اس کے ذہن میں شاید یہی دھن سوار تھی کہ آدم خور واقعی آجائے گا۔ باقی لوگ تو میچ دیکھنے لگ گئے مگر نمبردار صاحب کو چونکہ کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے انہیں کمرے میں بستر وغیرہ لگا کر دے دیا گیا۔ ان کے سامنے والے کمرے میں ملازم سونے کے لیے چلا گیا۔ باقی سب لوگ میچ دیکھنے میں مگن ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر محظوظ ہونے لگے کہ نمبردار صاحب نے کیا خوب قصہ سنایا اور آخر میں دل کو دائیں طرف بتایا جسے ملازم نے ہرگز نوٹ نہیں کیا۔ جبکہ دوسری جانب ملازم کے ذہن پر آدم خور ہی دھن سوار تھی۔ ان دونوں کے کمرے پاس پاس ضرور تھے مگر ٹی وی والے کمرے سے کافی فاصلے پر ایک دوسرے مکان میں تھے۔ جس طرف سیڑھیوں پر چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ میچ کی سنسنی خیزی میں گم ان لوگوں کو ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا جبکہ دوسری طرف ملازم کی آنکھ لگتے ہی اسے آدم خور نظر آ گیا۔ اس نے اپنے ذہن میں آدم خور کا جو نقشہ سوچا تھا وہ فلموں اور ڈراموں کی طرز کا تھا جس میں آدم خور بے لباس ہوتا ہے اور اس کے جسم پر بال ہی بال ہوتے ہیں۔ وہ ڈراونا خواب دیکھ کر چیخ و پکار کرنے لگا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر اندرونی کمرے میں موجود نمبردار صاحب دوڑتے ہوئے باہر نکلے مگر ایسے حلیے میں کہ دیکھ کر ملازم کے ہوش اڑ گئے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ قمیص اتار کر سوتے تھے۔ ایسے میں ان کے نکلے ہوئے بال لمبی داڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے جسم پر بے تحاشا بال..... ملازم کو یہ بھول گیا کہ اندر کون تھا وہ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ اسے لگا سچ مچ آدم خور میرے کمرے میں گھس آیا ہے کیونکہ نمبردار صاحب کا حلیہ بالکل اس کے خیالی آدم خور جیسا تھا۔ پھر کیا تھا اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا باقی لوگ میچ دیکھ رہے تھے کہ انہیں چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔

سب نے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک ہی آواز آ رہی تھی اور وہ تھی آدم خور..... آدم خور..... وہ سب لوگ دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اندر کا منظر عجیب مضحکہ خیز تھا۔ آدم خور یعنی نمبردار صاحب کی ہنسی نہیں رک رہی تھی اور ملازم کی چیخ و پکار۔

وہ دوڑ کر ان لوگوں سے چمٹ گیا اور مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ کی گردان کرتا رہا۔ ان سب کو صورت حال سمجھنے میں چند سیکنڈز لگے اور پھر سب کے گھن گرج قہقہے فضا میں آزاد ہونے لگے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حافظ صاحب نے جلدی میں بندوق سے فائر نہیں کر دیا جو کہ وہ ساتھ لے کر اوپر آئے تھے۔ ہنس ہنس کر بچوں سمیت سب کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ملازم عجیب گومگو کی کیفیت میں کھڑا تھا اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ آخر اسے لا کر پانی پلایا گیا۔ حافظ صاحب اسے اور نمبردار صاحب کو اپنے ساتھ نیچے لے آئے۔ سب کے لیے چائے بنائی گئی چائے پیتے ہوئے نمبردار صاحب کو اچانک وہی بات یاد آئی تو ان کی زوردار ہنسی کے نتیجے میں چائے آدھی منہ سے اور آدھی ناک سے باہر آئی۔ بچوں سمیت سب کے قہقہے ایک بار پھر فضا میں بلند ہوئے۔

سارے گھر والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے جبکہ وہ شرمندہ سا تھا۔ اس کا ڈراپ ختم ہو گیا تھا۔ اسے سب نے مل کر سمجھایا کہ ایسی چیزیں آبادی کی طرف نہیں آتیں اور دوسرا بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو صرف فلموں یا ڈراموں ہی میں ہوتی ہیں ان کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ میچ چونکہ ٹی۔ ٹونٹی تھا اس لیے بارہ بجے تک اختتام کو پہنچا۔ سب لوگ اپنی اپنی جاہ پناہ پر جانے لگے مگر پکچر ابھی باقی تھی۔ وہ رات تھی ہی ہنگاموں کی شب ابھی ایک اور ہنگامہ ہونا باقی تھا

حافظ صاحب کے پیچھے پیچھے ان کی زوجہ بھی شور کی آواز سن کر اوپر پہنچ گئی تھیں۔ ملازم کھڑا اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ منظر بہت عجیب تھا۔

ایک لمبے سے قد کی سانولی سی عورت نے ایک مرد کو عقب سے پکڑا ہوا تھا اور عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ انہوں نے گونجدار آواز میں پکارا تو اس عورت نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور مرد کو چھوڑ دیا۔ وہ حملہ آور ہونے کے لیے حافظ صاحب کی طرف آئی تو ان کی زوجہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے زینی ماسی! کیوں شور ڈالا ہوا ہے صبح ہی صبح؟''

''میں اس دا کلیجہ کھاواں؟'' اس نے مرد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا جس پر ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ملازم وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا تو حافظ صاحب نے اسے ڈانٹ کر نیچے بھیج دیا اور خود اس لمبے قد کی عورت کی طرف

متوجہ ہوگئے جو بظاہر جن چمٹنے کی اداکاری کررہی تھی۔ حافظ صاحب نے پہلی نظر ہی میں جان لیا تھا کہ وہ ڈرامہ کررہی ہے۔

''کیا مسئلہ ہے بھیا؟'' انہوں نے مرد سے پوچھا جو خوفزدہ سا عورت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''حافظ صاحب کچھ پتہ نہیں ہے گھر والے کہتے ہیں اس پر جن آگیا ہے۔''

''پتہ نہیں تم لوگوں کی طرف جنات کیوں اتنے ویلے ہوتے ہیں جو ہر ایک کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑائے۔

''بہرحال آپ لوگ بیٹھیں اندر۔'' وہ ان کے ساتھ مرد سمیت اندر چلی گئی۔

اندر موجود دوسری عورت اپنی بچی سمیت امید طلب نظروں سے حافظ صاحب کو دیکھنے لگی۔ چونکہ وہ پہلے آئی تھی اس لیے اس کی بات سننا زیادہ ضروری تھا وہ اپنی بچی کی عجیب حرکات سے انہیں آگاہ کرتی رہی کہ کیسے کبھی کبھار وہ سوتے میں اچانک چیخیں مارنے لگ جاتی ہے اور کبھی کبھار اس پر دورہ بھی پڑ جاتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر حافظ صاحب نے اسے تسلی دی۔

''باجی ہر چیز کا ایک کلیہ یا قاعدہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ اصل مسئلہ بنیاد کو ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ آپ نے جو مسائل بتائے ہیں وہ فطری عمل کا حصہ ہیں جو کہ ہر بچی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کمزوری کے باعث کچھ بچیاں اس عمل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ عجیب طرح کی ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتی ہیں جس کا براہ راست تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ میں یہ دوا لکھ کر آپ کو دے رہا ہوں کسی بھی دوا خانے سے منگوا لیجیے گا اور اگر خالص شہد کسی سے مل جائے تو وہ بہت بہترین حل ہے۔'' عورت نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں دوا کے بدلے دعا دے کر چلی گئی۔

''ہاں جی سلیم بھائی! اب بتائیں کیا مسئلہ ہے؟''

''پتہ نہیں حافظ صاحب آپ ہی دیکھ کر بتائیں ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کبھی کبھار یہ رونے لگ جاتی ہے تو کبھی ہنسنے۔ راتوں کو دورہ پڑتا ہے تو چیخنے چلانے لگ جاتی ہے۔ صبح اتنی جلدی اسی لیے لے کر آیا ہوں کہ رات اس نے بہت عجیب حرکت کی ہے۔''

وہ سانس لینے کو رکا۔ حافظ صاحب ہمہ تن گوش تھے جبکہ ان کی اہلیہ بھی دلچسپی سے سب سن رہی تھیں کیونکہ عورتوں کے مسائل سننے میں وہ بھی موجود ہوتی تھیں۔ سلیم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''رات میری آنکھ کھلی تو یہ میرا گلہ دبا رہی تھی وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنے اوپر سے اسے اٹھا کر پھینک دیا وگرنہ شاید.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ حافظ صاحب نے اسے باہر بھیجا تاکہ وہ اکیلے میں اس سے بات کرسکیں ان کی زوجہ اور وہ اس عورت کے پاس تھے تو حافظ صاحب گویا ہوئے۔ ''بہن اپنا مسئلہ کھل کر بیان کرو تاکہ میں تمہاری مدد کرسکوں، پیری فقیری میرا پیشہ نہیں ہے جو تعویذ لکھ کر پیسے لیتا رہوں جو کوئی خوشی سے نذرانہ دے جاتا ہے تو رکھ لیا وگرنہ کسی کو دھوکا دے کر بٹورنے سے بہتر ہے مر دار کھا لوں۔ خیر یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ مجھے معلوم ہے یہ سب تم جان بوجھ کر کررہی ہو۔ گھریلو معاملات میں اونچ نیچ ہوجاتی ہے لڑائی جھگڑے ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہاں ایسے میں قطع تعلق یا اس جیسی اور چیزیں اللہ پاک کو بھی ناپسند ہیں اگر کوئی اس طرح کی مجبوری ہے تو بیان کرسکتی ہو میں وعدہ کرتا ہوں کہ صیغہ راز میں ہی رہے گا سب کچھ۔ باقی یہ جن بھوت وغیرہ کا ڈرامہ گھر والوں کے سامنے تو چل جائے گا میرے سامنے مت کرو۔'' اس کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے اس کی بے بسی کا ثبوت تھا۔ وہ بولی تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''میں اپنے اوپر تو سب سہہ سکتی ہوں حافظ صاحب مگر میری بچی..... وہ جیتے جی مرجائے گی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی انہوں نے اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا غبار کم ہو وہ تھوڑی دیر بعد چابی والے کھلونے کی مانند پھر اسٹارٹ ہوگئی۔

''حافظ صاحب! میری بچی خودکشی کرلے گی اگر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کی گئی۔ میری ان حرکات کی وجہ یہی ہے کہ میں اس کا رشتہ مانگنے والوں کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ وہ ایسے گھر میں رشتہ نہ کریں جہاں جنات کا سایہ ہے ممکن ہے ماں کے ساتھ ساتھ بیٹی پر بھی اثر ہو۔ آپ یقین کریں کہ مجھے خود گھر والوں کو اس تکلیف میں مبتلا کرکے قلق ہوتا ہے مگر میں اپنی بیٹی کی خاطر یہ دکھ جھیل لیتی ہوں۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی تو ان کی بیگم نے اسے تسلی دی اور پھر سلیم کو بلوایا گیا۔

''دیکھو سلیم!'' وہ میٹھے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔ ''بھیا رشتے بنانا آسان ہے مگر نبھانا بہت مشکل۔ اگر گھر میں روز بروز ٹینشن بڑھتی رہے تو اس کا اثر پورے گھر پر پڑتا ہے اور ساتھ ہی جنات اس گھر پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ مجھے اپنے علم کے بل بوتے پر پتہ چلا ہے کہ یہ جنات گھر میں ناچاقی کے سبب آئے ہیں۔ ابھی تو فقط سایہ ہی ہے اگر پوری طرح آئے تو پھر مشکل ہو جائے گی۔'' انہوں نے افسانہ گھڑا۔

''میں تو کوشش کرتا ہوں کہ میری طرف سے کسی بھی قسم کی پریشانی نہ پیدا ہو گھر میں۔'' وہ منمنایا۔

''دیکھو سلیم بھائی! یہ جنات ایسی چیزیں ہیں جو گھر پر یکے بعد دیگرے دوسرے لوگوں کو بھی تنگ کرتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ گھریلو ناچاقی اور روز بروز بڑھتا ہوا عدم برداشت ہے۔ تمہارے گھر میں رشتہ داروں کی مداخلت سے جو زبردستی رشتہ کروایا جا رہا ہے اس پر بھی جنات کو تشویش ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

سلیم منہ کھولے ان کی باتوں کو نہایت سنجیدگی سے لے رہا تھا اور کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ تعویذ انہیں دیے جو گھر میں رکھنے تھے اور ایک ہفتے بعد آنے کا کہا۔ وہ واپس چلے گئے تو ان کی بیگم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''کیسے کیسے لوگ بستے ہیں اس دنیا میں اور کیسی شرارتیں کرتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے اور پھر باہر نکل آئے جہاں سورج نے زمین پر اپنی چادر تان دی تھی۔

❖❖❖❖

اگلے دن سفیر کو اس واقعے کا کوئی قلق نہ تھا۔ اس کے لیے یہ ایک کھیل تماشہ ہی تھا دن کے وقت وہ دولھا کے گھر تھا تو اسے کسی نے بتایا کہ دولھا سویا ہوا ہے ایک کمرے میں۔ اسے پھر شرارت سوجھی تو وہ دوڑتا ہوا اپنے کزن کے پاس پہنچ گیا اس سے نسوار لی اور لے جا کر دولھے کو سونگھانا شروع کر دی، اور پھر اگلے چند منٹ تک دولھے کی نان اسٹاپ چھینکیں تھی اور سب کے قہقہے۔ شرارت کرنے کے بعد فرار ہونا اس کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔

آخر تنگ آ کر گھر والوں نے اسے بیل گائے اور بھینس کے ساتھ ساتھ چند بھیڑ بکریاں بھی لے دیں کہ چلو کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ اور واقعی وہ کچھ نہ کچھ کرنے لگا۔ جانوروں کے ساتھ اس کا ایسا دل لگا کہ اس کی اکثر شرارتیں چھوٹ گئیں۔ صبح گھر سے تمام ڈھور ڈنگر لے کر نکلتا اور مغرب کے بعد اس کی واپسی ہوتی صرف ایک مخصوص شرارت اب اس کی پہچان بن گئی پتھر مارنے والا لڑکا اس کے ہاتھ میں ہر وقت پتھر ہوتے تھے جن سے بکریوں کو یا ساتھ چلتے کتے کو مارتا اگر وہ اپنے راستے سے ہٹتے۔ اس کے گھر کے ساتھ ایک قبرستان تھا اور اکثر وہ مغرب کے وقت وہاں سے گزرتا۔ وہاں پر موجود بہت سی چیزوں کو چھیڑ چھاڑ کرتا۔ اسے گھر سے سختی سے منع کیا گیا تھا کہ قبرستان میں مغرب کے بعد نہ جائے۔

❖❖❖❖

ابھی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں پہنچے بھی نہ تھے کہ گھر کے قریب ہی سے شور بلند ہوا۔ چیخ و پکار سے بابر کو یوں لگا کہ شاید کوئی فوت ہو گیا ہے اور چارپائی دیکھ کر شروع میں اپنے خیال کی تصدیق کی مگر پھر چارپائی کے اوپر والے شخص کو حرکت میں دیکھ کر چند سیکنڈز کا سکون نصیب ہوا کیونکہ اگلے چند سیکنڈز میں اس چارپائی والے کی حرکات دیکھ کر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے بمشکل حافظ صاحب کو پکارا۔ وہ بھی ابھی بستر تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ دوبارہ انہیں دھما چوکڑی کی آوازیں سنائی دی۔ چارپائی پر موجود شخص کو مضبوطی سے رسیوں کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ جس انداز سے اچھل رہا تھا اس کی طاقت کا اندازہ ہوتا تھا حالانکہ وہ دھان پان سا لڑکا تھا، جس کی صحت بھی کمزور تھی مگر اس کے باوجود اس میں بے پناہ طاقت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ رسیوں سے جکڑے ہونے کے باوجود چار پانچ بندوں نے اسے پکڑا ہوا تھا اور ساتھ میں چارپائی کو بھی بھینچ دبایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب عجیب جملے نکل رہے تھے جو کہ مقامی زبان ہندکو میں تھے۔

اچانک اس نے زور لگایا تو بندشیں کھل گئیں اس نے چھلانگ ماری اور ایک کھیت سے دوسرے اور پھر تیسرے میں جا گھسا۔

ایک ایک کر کے اس کے ساتھ آئے لوگوں نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی اب منظر بہت بھیانک ہونے کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیز شکل اختیار کر گیا تھا۔ بابر نے فوراً اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس کے عقب سے لائٹ نشیبی کھیت میں ڈالی مگر اس کی روشنی کی پہنچ بہت کم تھی۔ حافظ صاحب اس کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً ٹارچ کا مطالبہ کیا۔ فوراً ان کا بڑا

بیٹا ٹارچ لے کر آیا تو کھیتوں میں روشنی ڈالی گئی۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں نے مطلوبہ شخص کو قابو کر لیا تھا۔ اب تین چار افراد مل کر اسے پکڑ کر لا رہے تھے ابھی وہ لوگ آخری کھیت عبور کر ہی رہے تھے کہ ایک بار پھر اس نے زور لگایا تو اسے پکڑنے والے دو افراد ہوا میں قلابازی کھاتے نظر آئے۔ ہم لوگ اپنی جگہ پر موجود ہپناٹائز ہو چکے تھے حافظ صاحب نشیبی کھیت میں جانے لگے تو ان کی بیگم صاحبہ نے انہیں ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ انہوں نے ہاتھ چھڑایا اور نیچے جانے لگے۔ وہ شخص کھیتوں میں گم ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش میں اس کے تمام رشتہ دار جو موجود تھے کھیتوں میں ڈھونڈنے لگے بابر سمیت گھر کے افراد نے وہیں سے ٹارچ لگا کر ماحول کو روشن کر رکھا تھا۔ حافظ صاحب بذات خود ایک اور ٹارچ لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے تھے جو دو افراد قلابازی کھا کر گرے تھے وہ اٹھ گئے تھے۔ نمبردار صاحب جو آدم خور کو حقیر سی چیز بتا کر اپنی بہادری کا رعب جما رہے تھے اس وقت بھیگی بلی بنے بابر کے پاس کھڑے تھے ان میں سے ایک نے دونوں کو جا کر پانی پلایا۔ وہ زخمی نہیں ہوئے تھے البتہ خوف و ہراس ان کے چہرے پر عیاں تھا۔ بابر کو حافظ صاحب کی فکر تھی اس نے انہیں آواز دی تو جواب میں خیریت سے پا کر اطمینان کی سانس لی۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب ان لوگوں کے ساتھ واپس آ رہے تھے وہ انہیں کچھ وظائف بتلا رہے تھے۔

''یہ الفاظ دہراتے رہنا اور ساتھ ہی بڑے پیار سے اسے لے کر آنا مجھے معلوم ہے وہ کس سمیت گیا ہے چند منٹ بعد وہ نارمل ہو جائے گا پھر اگلے چند منٹوں تک وہ پرسکون ہی رہے گا۔'' انہوں نے سمجھایا۔ ''آپ لوگ فوراً سے پیشتر روانہ ہو جائیں بلکہ کسی گاڑی والے کو فون کریں تاکہ جلد از جلد مریض واپس پہنچ جائے۔'' اس کی والدہ نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

وہ لوگ جلدی سے روانہ ہو گئے تھے باقی بچ جانے والے افراد وہیں انتظار کرتے رہے۔ بابر، قاری صاحب سمیت تھوڑی دیر کے لیے اندر آ گیا اگلے چند منٹ وہ پرسکون ہی رہے البتہ وہاں موجود کچھ لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ وہ انتظار کرتے رہے انہیں اندازہ تھا کہ وہ مریض کو واپس لے آئیں گے۔ اگلے چند منٹوں میں ان کا اندازہ درست نکلا۔

''قاری صاحب وہ لا رہے ہیں لڑکے کو۔'' چھت پر سے آواز آئی تو حافظ صاحب اور بابر اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ اس کے منہ سے الفاظ خود بخود نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔

''میں تو نہ چھوڑوا تو ماڑا بچہ ماریا۔'' (میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم نے میرا بچہ مارا ہے)

اگر یہ مناظر بابر کی آنکھوں کے سامنے پیش نہ آئے ہوتے تو شاید وہ انہیں گپ ہی سمجھتا۔ وہاں موجود ساتھ آئے ہوئے دس بارہ افراد بھی یہی کہہ رہے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی جنات وغیرہ کا چکر ہے۔ اس لڑکے کی ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جونہی حافظ صاحب وہاں پہنچے سب انہیں امید طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب بھی چار تگڑے افراد نے اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ رکھا تھا۔

حافظ صاحب دوڑ کر اندر دوسرے مکان میں داخل ہوئے اور چند سیکنڈز بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس لڑکے نے زیادہ زور سے آہ و بکا شروع کر دی۔ حافظ صاحب نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا۔

''چپ.....!'' جلالی آواز میں بولے۔

ماحول پر یک دم سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ خاموش تھے۔ حافظ صاحب کتاب لے کر اس کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ حافظ صاحب کے کچھ پڑھنے کی صورت میں لڑکا کسمسایا۔ اچانک انہوں نے جلالی آواز میں لڑکے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''کون ہو تم اور کیا نام ہے تمہارا؟''

''ماڑا بچا اس ماریا میں نہ چھوڑدا اس کو۔'' (میرا بچہ اس نے مارا ہے میں اسے نہیں چھوڑوں گا)

''میں نے پوچھا کیا نام ہے تمہارا۔'' حافظ صاحب نے جلالی انداز میں گرجدار آواز میں پوچھا۔

''ولید!'' اس نے کہا۔ (لڑکے کا نام کچھ اور تھا)

''اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے تمہارا.....؟''

''اس نے میرا بچہ مارا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کس طرح بچہ مارا اس نے تمہارا.....'' آواز میں وہی گرج تھی۔

''اس نے قبرستان میں پتھر پھینکا ہے وہاں میرا بچہ سویا ہوا تھا اس کے پتھر لگنے سے وہ مر گیا۔''

''کیا اسے پتہ تھا کہ تمہارا بچہ وہاں پر ہے؟''

''نہیں.....!''

''تو پھر کیوں اسے تنگ کر رہے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے حافظ صاحب نے ایک اور پھونک ماری تو وہ لڑکا چیخنے چلانے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو مجھے معاف کردو۔ اب دوبارہ اسے کبھی تنگ کروں گا۔''

''چلو پہلا کلمہ پڑھو میرے ساتھ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔''

اس نے ساتھ ساتھ کلمہ دہرایا اور کلمہ پورا ہوتے ہی انہوں نے ایک پھونک مزید ماری اور پھر سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے پانی پلائیں کام ختم ہوگیا ہے۔''

بابر کی توجہ لڑکے کی طرف ہوگئی لڑکا چارپائی پر سے یوں اٹھا جیسے نیند سے ابھی جاگا ہو۔ اٹھتے ہی اس نے ماں کو پکارا جیسے کوئی دو چار سال کا بچہ پکارتا ہے۔ اس کی ماں دوڑتے ہوئے آکر اس سے لپٹ گئی۔

''مجھے کیا ہوا تھا اماں؟'' لڑکے نے ماں کو مخاطب کیا۔ اس میں سیدھا ہونے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔

اس کی ماں رو رہی تھی جبکہ باقی لوگوں نے اس سے کہا کہ تمہاری طبیعت خراب تھی تم بخار کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے اب ٹھیک ہو چکے ہو۔

بابر نے پاس کھڑے شخص سے پوچھا کہ یہ ہے کون اس کا کیا نام ہے تو وہ بولا قریبی علاقے کا ہے اس کا نام سفیر ہے۔

''یہ گھر میں داخل ہوا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔'' اس کے بھائی نے بتانا شروع کیا۔ ''آپ لوگ یقین کریں یا نہ یہ اچھل اچھل کر مکان کی چھت تک پہنچ رہا تھا۔ ہم لوگ ڈر گئے۔ میں نے پکڑنے کی کوشش کی تو قابو نہ کر سکا پھر چچا کے گھر سے دو کزنز اور چچا آگئے ہم سب نے مل کر اسے قابو کیا مگر یہ پھر چھوٹ جاتا۔ آخر کار بڑی محنت کے بعد ہم اسے چارپائی کے اوپر باندھنے میں کامیاب ہوئے۔ راستے بھر اس نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ میرا بچہ کیوں مارا..... میرا بچہ کیوں مارا.....''

''وجہ کیا بنی یہ کہاں گیا تھا جو اس کی یہ حالت ہوئی؟'' کسی نے پوچھا۔

''دن کے وقت اور شام کے وقت یہ قبرستان میں رہا ہے اور شام کو اس نے کافی پتھر قبرستان میں پھینکے۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ ایسا نہ کرو مگر اس نے میری نہ سنی۔''

حافظ صاحب نے اس کے چچا اور والدہ کو بلا کر کچھ تعویذ دیئے اور استعمال کرنے کا طریقہ کار سمجھانے لگے۔ انہوں نے اس کی والدہ کو حوصلہ دیا کہ اب گھبرانے کی یا فکر کرنی کی کوئی بات نہیں تھوڑی دیر میں یہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔ اس لڑکے کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بہت تھکا ہوا ہے اور سونا چاہتا ہے۔

تعویذ لے کر وہ لوگ چلے گئے اور آہستہ آہستہ ہمسائے اور باقی لوگوں کا مجمع بھی منتشر ہونے لگا آخر کار اگلے چند منٹوں میں صرف گھر کے اہل خانہ اور مہمان رہ گئے۔ رات بہت ہو چکی تھی جبکہ گاؤں میں رات جلدی سونے کا رواج ہوتا ہے۔ اس لیے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ نیند کس کو آسکتی تھی؟ بابر آنکھیں بند کیے رات کے ہنگاموں کے بارے میں سوچتا رہا پہلے آدم خور آنے والا واقعہ اور پھر..... جنات نکالے جانے کے مناظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔ صرف ایک دو منٹ کا دورانیہ گزرا تھا جن کے نکلنے کے لیے۔ اسے ان جعلی پیروں کا طریقہ کار بھی یاد آیا جو اتنا وقت ڈرامہ بازی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن بہت خطرناک ہے۔ اسے ایک بات کا سخت افسوس بھی ہوا کہ کاش! ویڈیو بنا لیتا تاکہ قارئین کو سوشل میڈیا کے ذریعے اس سچ کا ثبوت بھی دیتا۔ ''خیر اگلی بار اگر اس طرح کا واقعہ پیش آیا تو ضرور ویڈیو بناؤں گا۔''

اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر اس طرح کے واقعات پیش آنے کے اسباب پر بھی غور کرنے لگا۔ ایک چھوٹی سی شرارت جو بظاہر بے ضرر تھی اتنے بڑے سانحے کا سبب بنی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کبھی کبھی شرارت کسی بڑے سانحے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس بات کو کئی ماہ گزر چلے ہیں مگر اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل ہی کا واقعہ ہو۔ اس نے واقعہ بہت سے لوگوں کو سنایا اور ساتھ تاکید بھی کی کہ یہ واقعہ اپنے بچوں کو ضرور سنائیں تاکہ وہ بھی کسی جان لیوا شرارت سے بچ سکیں۔

''اللہ پاک ہمیں حادثات سے محفوظ فرمائے اور ہمارے بچوں کی حفاظت فرمائے۔'' اس نے زیر لب کہا۔ اب جس دن بھی وہ رات کو وہاں رکتا اسے وہ واقعہ یاد آجاتا۔

فسادی جڑ

ریاض بٹ

مجرم چاہے کتنا ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے جس سے اس کی پکڑ ہو ہی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک چالاک انسان تھا اور اس گمان میں تھا کہ اسے کوئی پکڑ نہیں سکتا مگر اللہ رسی دراز ضرور کرتا ہے مگر مظلوموں کی داد رسی کے لیے اسی رسی کو جلد یا بدیر کھینچ بھی لیتا ہے۔

اس دور کا قصہ جب دیواریں چھوٹی چھتیں کچی اور لوگوں کے دل سادہ اور سچے ہوتے تھے

وہ نومبر کی ایک قدرے خنک صبح تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد جمعہ خان میرے سامنے تھا۔ اس وقت میں چند کاغذوں کو نمٹا رہا تھا۔ میں نے قلم کو رکھا اور جمعہ خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جمعہ خان یہ پوریاں کس کی دکان سے لائے تھے؟''

''جی ادھر مین بازار میں مانو پہلوان کی دکان سے کبھی کبھار لے آتا ہوں جی۔''

غالباً اس کا نام امانت علی ہے اور وہ کسی دور میں پہلوانی کرتا ہوگا۔''

''جی ہاں۔ سر وہ آج سے دس سال پہلے پہلوانی کرتا تھا۔ اب اس نے ادھر آ کر مٹھائی کی دکان کھول لی ہے۔ پہلوان سویٹ ہاؤس کے نام سے اس کی برفی اور موتی چور کے لڈو دور دور تک مشہور ہیں۔''

''ٹھیک ہے کسی دن اس کی برفی بھی چیک کریں گے اور لڈوؤں سے بھی تعارف حاصل کریں گے لیکن مفت میں نہیں پیسے دے کر۔''

میں نے دیکھا کہ میری اس بات سے سپاہی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔

''جمعہ خان تم پہلوان کو پیسے بھی دیتے ہو یا مفت کی پوریاں اڑاتے ہو۔''

''وہ جی' وہ پیسے لیتا ہی نہیں ہے۔'' جمعہ خان نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''بہت بری بات ہے..... آئندہ اگر مجھے پتہ چلا کہ تم نے پہلوان سے مفت کوئی چیز لی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جی' اس دفعہ معاف کر دیں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

''چلو جاؤ۔''

ابھی اس بات کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ پہلوان امانت علی تھانے میں آیا۔

میں نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ واقعی اس عمر میں بھی پہلوان ہی لگتا تھا' اس وقت اس کی عمر چالیس سال ہوگی' چہرہ بھرا بھرا اور سر بالوں سے محروم تھا' آنکھوں میں چمک تھی۔

وہ میرے اشارے پر میرے سامنے بچھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں ایک مسئلہ لے کر آیا ہوں۔''

''تو..... بتاؤ نہ' پہلوان جی میں یہاں لوگوں کے مسئلے سننے اور انہیں حل کرنے کے لیے بیٹھا ہوا ہوں۔''

''تھانے دار صاحب' بھورے بدمعاش سے میں بہت تنگ ہوں' ایک تو جب بھی آتا ہے مفت کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر کھا لیتا ہے' رعب الگ ڈالتا ہے' کہتا ہے یہاں دکان کرنی ہے تو کسی قسم کی چوں چراں کرنے کی ضرورت نہیں'

پھر آج صبح تو حد ہوگئی' اس نے صغراں سے فلمی ڈائیلاگ بولنے شروع کردیئے' وہ میری دکان سے مٹھائی لینے آئی تھی' صغراں نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا تھا' میں نے بھی اسے کہا' بھورے ان حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ وہ مجھے اور صغراں کو دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ تھانے دار صاحب' میں ابھی بھی اسے دھوبی پڑا مار کر گرا سکتا ہوں' اور اگر میں اس کے اوپر بیٹھ جاؤں تو..... لیکن میں قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا' آپ اسے اپنی زبان میں سمجھائیں' ورنہ مجھ سے اس کا قتل ہوجائے گا۔''

''پہلوان جی آپ قانون کو ہاتھ میں لینے کے متعلق سوچیں بھی نہ' میں ہوں نہ' بھورے کو میں تھانے میں بلا کر ایسے سمجھاؤں گا کہ اسے چھٹی چھوڑ ساتویں کا دودھ بھی یاد آجائے گا' یا تو وہ بندے دا پتر بن جائے گا' یا ایک لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جی اب میں چلتا ہوں' دکان کا حرج ہو رہا ہے۔'' میں نے اسے رخصت کردیا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی عشرت علی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

''عشرت علی لگتا ہے تم لوگ ہاتھی کے کان میں سو رہے ہو۔''

وہ اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے میری بات سے یا تو شدید جھٹکا لگا ہو یا سرے سے اسے میری بات سمجھ ہی نہ آئی ہو۔ جب میں نے اپنی بات کی وضاحت کی تو وہ بولا۔

''سر..... بھورے کی تھانے میں اس سے پہلے تو کبھی کوئی شکایت نہیں آئی۔''

''اگر شکایت نہیں آئی تو تم لوگوں کا بھی کوئی فرض ہے' اگر کوئی کسی خوف یا مصلحت کی وجہ سے غنڈہ گردی کی شکایت لے کر تھانے میں نہیں آتا تو.....'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بس جی' اس کوتاہی کے لیے معافی چاہتا ہوں' میں بھورے کو تھانے میں بلا کر اس کی گوشمالی کرتا ہوں۔''

''یعنی..... تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ بھورے کو جانتے ہو۔''

''منظور احمد عرف بھورا دراصل بازار حسن میں ہوتا ہے۔''

''اوہ..... اس کا مطلب ہے سکہ بند بدمعاش ہے۔'' تم اسے ذرا بلا کر لاؤ تو..... ذرا میں بھی اس کے درشن کرلوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دو سپاہیوں کو بھیجتا ہوں۔''

لیکن..... انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے' تقریباً گھنٹے بعد مجھے بتایا گیا کہ منظور احمد عرف بھورا منظر سے غائب ہوگیا ہے۔ البتہ بازار حسن کے ایک اور بدمعاش کرم داد عرف کرمو کو ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی پکڑ کر لے آئے تھے۔

وہ آتے ہی واویلا کرنے لگا۔ کرمو کو ہیڈ کانسٹیبل عارف لے کر میرے کمرے میں آیا تھا۔ کرمو نے آتے ہی کہا۔

''تھانے دار صاحب آپ کے بندے مجھے میرا جرم بتائے بغیر ہانک کر لے آئے ہیں اور مجھے بے گناہ کو دو تھپڑ بھی مارے ہیں۔''

''یہ اداکاری چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ بھورا کدھر ہے؟''

وہ اس طرح بدک کر تھوڑا پیچھے ہوگیا جیسے اسے پاؤں پر کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔

''واہ..... جی میں نے کچھ نہیں کیا..... اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ بھورا اس وقت کدھر ہے.....؟'' وہ خوفزدہ نظروں سے میرے ریوالور کو دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ تمہارا یار ہے..... بلکہ تم دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہیں بتائے بغیر کہیں غائب ہوگیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں یہ تو جان گیا تھا کہ وہ کوئی کہانی گھڑنے کے چکر میں ہے۔

''تھانے دار صاحب! آپ کی بات بالکل صحیح ہے لیکن .....'' اس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ایک ہفتہ پہلے میرا اس کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تھا' اور ہماری بول چال بند ہے۔''

''اچھا.....'' میں خوامخواہ ہنس پڑا' پھر کرمو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑائی کس بات پر ہوئی تھی، اور کیا اس کا کوئی گواہ بھی ہے؟''

''گواہ تو کوئی نہیں ہے جی..... اس نے اکیلے میں مجھے کہا تھا کہ تم میرے گاہک خراب کررہے ہو۔''

''تم تو..... بچو اب لمبے سلاخوں کے پیچھے جاؤ گے' عورتوں کی بروکری تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔'' میں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جی..... بس اس بار معاف کردیں آئندہ میں کوئی اور کام دیکھوں گا۔'' وہ منمنایا۔

مجھے پتہ تھا کہ وہ صرف جان چھڑانے کے لیے یہ کہہ رہا ہے ورنہ ایسے ڈھیٹ اور بے شرم بندوں کو میں جانتا تھا' حرام کاری ایسے بندوں کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔

''اس بندے کو لے جاؤ اور برآمدے میں الٹا لٹکا دو، اور اسی حالت میں اس کی کھال اتارنی ہے۔ جیسے قصائی بکرے کو الٹا لٹکا کر اس کی کھال اتارتا ہے۔'' میں نے سپاہی جمعہ خان کو بلا کر حکم دیا۔

آپ بالکل فکر ہی نہ کریں سر' میں تو اس کی کھال اتار کر اس میں بھس بھر دوں گا' آپ اس ڈشکرے کو میرے حوالے کردیں۔''

اچانک کرمو نے ایسی حرکت کی جس کی نہ مجھے توقع تھی اور نہ سپاہی کو۔ وہ پھرتی سے میری میز کے نیچے گھس گیا، اور میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرڈالی۔

''نکلو..... جلدی میری میز کے نیچے سے .....'' ابھی الفاظ میرے منہ میں ہی تھے کہ سپاہی نے اسے میز کے نیچے سے نکال کر کھڑا کردیا۔

''تھانیدار صاحب میں تو آپ کے پاؤں چھو کر یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے خدارا ان کے حوالے نہ کریں' میں سچی بات آپ کو بتادوں گا۔''

''تو شروع ہوجاؤ' ورنہ.....؟'' جمعہ خان نے اسے کالر سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''بات دراصل یہ ہے جی کہ بھورے کو یہ بات پتہ چل چکی تھی کہ پہلوان امانت علی تھانے میں گیا ہے۔''

اس لیے وہ غائب ہوگیا۔'' میں نے اسے لقمہ دیا۔

''بالکل یہی بات ہے جی۔''

''اس وقت وہ کہاں ہے' دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔''

''جناب میں نے اسے خود اپنی ان گناہگار آنکھوں سے پنچ نثار خان کے ڈیرے پر جاتے دیکھا ہے۔''

''اوہ..... بدبخت تم تو پورے کے پورے گناہوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہو' اس بار میں چھوڑ رہا ہوں' لیکن اگر تم آئندہ مجھے بازار حسن میں نظر آئے تو لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دوں گا۔''

''بہت مہربانی..... میں آپ کے بچوں کا بھی نوکر.....'' وہ چاپلوسی سے بولا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی عشرت کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

''جی..... سر.....'' وہ میرے کمرے میں آ کر بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتا کر کہا۔

''عشرت علی تم دو سپاہیوں کو ساتھ لے جاؤ، اور بھورے کو پکڑ کر لے آؤ۔''

''سر..... پنچ کے ڈیرے پر اگر واقعی بھورا ہے تو وہاں خون خرابہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو..... تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قانون بے بس ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے سر..... میرا مطلب ہے کہ ہم اگر عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کر لیں تو بہتر رہے گا۔''

''جب تک تم عدالت میں جاؤ گے عدالت کا وقت ختم ہو چکا ہوگا، اور اس دوران اگر بھورا ادھر ادھر ہو گیا تو.....'' میں نے چند لمحے غور کیا پھر کہا۔

''عشرت علی تم چار اہلکاروں کو ساتھ لے جاؤ، اور حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار میں تمہیں دیتا ہوں۔''

دو گھنٹے بعد جب وہ واپس آیا تو بھورے کی بجائے پنچ اس کے ساتھ تھا۔ میں نے پنچ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پنچ جس کا نام مجھے نثار خان بتایا گیا تھا..... گورے رنگ' درمیانے قد اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک بندہ تھا' عیاری اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

''تھانیدار صاحب آپ نے چھوٹے تھانیدار نوں ناحق تکلیف دی آپ مجھے بلا لیتے میں آپ کو بھورے کے متعلق بتا دیتا۔''

''نثار خان اب تم شومئی تقدیر تھانے میں آ ہی گئے ہو تو بھورے کے متعلق بتا دو' کہ اسے کہاں چھپایا ہوا ہے؟ مگر کوئی الف لیلوی کہانی نہیں چلے گی، کیونکہ میرے پاس ایک ایسا گواہ موجود ہے جس نے بھورے کو تمہارے ڈیرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔'' میں نے اس کے جھوٹ بولنے یا مجھے ادھر ادھر ٹہلانے کے سارے راستے بند کرتے ہوئے کہا۔

''جناب! میں کب اس بات سے انکار کر رہا ہوں؟ بھورا میرے پاس آیا ضرور تھا لیکن جب اس نے مجھے ساری بات بتائی تو میں نے اسے کہا کہ اپنی دنیا سے باہر قدم نہ نکالو ورنہ ایسے جال میں پھنس جاؤ گے جہاں سے نکلنا تمہارے لیے ممکن نہیں رہے گا۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو گوڈے گوڈے پھنس چکا ہے تھانیدار جی۔''

''کیا مطلب.....؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ شریفوں کی بستی میں اپنا دل کھو چکا ہے' وہ صغراں نامی عورت کا عاشق بن گیا ہے۔''

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ صغراں نامی عورت کے متعلق میں نے پہلوان سے معلومات حاصل کر لی تھیں' وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں کام کرتی تھی' یہ اسکول پہلوان کی دکان سے تھوڑی ہی دور واقع تھا اور پہلوان اسے اچھی طرح جانتا تھا، صغراں طلاق یافتہ تھی، اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ وہ اسکول میں ہی رہتی تھی، اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا' ایسی شریف اور بے آسرا عورت کی میں مدد کرنا چاہتا تھا' یعنی بھورے جیسے بھوکے بدمعاش سے اسے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن بھورا کہاں تھا۔ میرا ذہن تو ان سوچوں میں الجھا ہوا تھا' لیکن میری آنکھیں پنچ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

''نثار خان! کسی سے محبت کرنا کوئی بری بات نہیں لیکن یک طرفہ محبت بہت سے مسائل پیدا کرتی ہے۔'' میں نے اسے کہا

''یہی بات تو میں اسے سمجھاتا رہتا تھا' کیونکہ کافی دن پہلے مجھے اس کے عشق کے متعلق پتہ چل چکا تھا۔'' پنچ نے جواب دیا۔

''جب وہ آپ کے پاس آیا تھا تو آپ نے ان باتوں

کو اس کے بھیجے میں اتارنے کے علاوہ کیا کہا تھا؟''

''میں نے اسے چلتا کر دیا تھا، اور کہا تھا میں تمہیں اپنے ڈیرے پر نہیں رکھ سکتا' کیونکہ یہ نہ ہو کہ میں بھی رگڑا جاؤں' اکثر گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے لیکن بھورا کہاں گیا؟ کیا آپ اس کے کسی اور ٹھکانے سے واقف ہیں۔''

''یقین کریں مجھے کچھ پتہ نہیں؟''

''ٹھیک ہے آپ جائیں جونہی اس کے متعلق کوئی بات پتہ چلے مجھے مطلع کریں۔''

''آپ بالکل فکر ہی نہ کریں جی' جونہی مجھے اس کی کوئی سن گن ملی میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

میں نے اسے رخصت کر دیا۔ ابھی میں صغراں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن! انسان سوچتا کچھ ہے' ہوتا کچھ ہے۔ اس بات پر تو ہمارا ایمان ہے کہ اس باری تعالیٰ کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ بازار حسن کے بیچ کے جانے کے اگلے ہی دن دو معزز قسم کے بندے تھانے میں آئے۔ اس وقت دن کے ایک بجے کا وقت تھا۔ وہ یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ گاؤں کمال آباد اور گاؤں فیروز آباد کے درمیان ایک نشیبی جگہ پر گدھ اور دوسرے مردار خور پرندے بہت بڑی تعداد میں جمع ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

''آپ کے خیال میں وہاں کیا ہے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''جناب آپ خود سمجھدار ہیں' وہاں کسی انسان کی لاش بھی ہو سکتی ہے یا کسی جانور کی بھی' ہم نے ایک چیز دیکھی اور آپ کو بتانے چلے آئے۔''

''آپ کا تعلق کس جگہ سے ہے..... اور آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''جناب، ہمارا تعلق گاؤں کمال آباد سے ہے ہم شہر ہی آ رہے تھے یہاں ہم ایک شادی میں شرکت کرنے آ رہے تھے۔'' انہوں نے مجھے اس جگہ کا نام بتایا جہاں شادی تھی۔

بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں انہیں ہی مشتبہ سمجھ لیتا' میں نے ان سے پوچھ کر ان کا مکمل ایڈریس نوٹ کیا اور انہیں رخصت کر دیا۔

آدھے گھنٹے میں' میں ایک کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ سرکاری گاڑی سے اتر کر میں نے جگہ کا جائزہ لیا۔ یہاں اونچے نیچے کھڈ تھے' کانٹوں والی بے شمار جھاڑیاں تھیں' اور ان میں خود رو جھاڑیوں کی تعداد زیادہ تھی بھنگ بھی تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ لاش کو نیچے نشیب میں پھینکا گیا تھا۔ یہ نشیب کوئی دس فٹ گہرا تو ضرور ہوگا۔ وہاں جو قریب ترین گھر تھے وہ کم از کم ڈیڑھ دو سو کوس دور تھے۔ میرے ساتھ کانسٹیبل ظہیر' سپاہی کاشف اور جمعہ خان تھے۔ میں نے سپاہی جمعہ خان کو کہا کہ وہ قریب ترین گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور گھر میں موجود مردوں کو بلا کر لے آئے اور ان سے کہے کہ ایک چارپائی اور چادر بھی لے آئیں۔

کچھ ہی دیر بعد چار بندے دوڑتے ہوئے آئے ان کے پیچھے ایک بندہ آ رہا تھا جس نے چارپائی اٹھائی ہوئی تھی۔ کانسٹیبل کے پاس رائفل تھی' میرے کہنے پر اس نے ہوائی فائر کیا گدھ وغیرہ شور مچاتے ہوئے اڑ گئے۔ جو بندے آئے تھے ان میں دو جوان اور تین ادھیڑ عمر تھے۔ میں نے دونوں جوانوں سے کہا کہ دونوں سپاہیوں کے ساتھ نیچے اتریں اور جو بھی لاش ہے وہ لے آئیں۔

آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد لاش اوپر آ گئی' یہ کسی جوان کی لاش تھی۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی' گدھوں اور دوسرے مردار خور پرندوں نے جگہ جگہ سے لاش کھائی تھی' ایک آنکھ غائب تھی' سینے' گردن اور ہاتھوں سے بھی گوشت غائب تھا۔ چہرہ ناقابل شناخت تھا' البتہ کپڑے کافی حد تک سلامت تھے' جیبوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔

کانسٹیبل ظہیر کی نگرانی میں' میں نے لاش ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دی۔ لاش کی جو حالت تھی اس سے موت کی وجہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ پوسٹ مارٹم نے ہی سارے راز فاش کرنے تھے۔ آنے والے افراد سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ صرف یہ بات پتہ چلی کہ اس طرف کوئی نہیں آتا البتہ جنہوں نے پیدل جلدی شہر پہنچنا ہوتا تھا' وہ اس راستے کو ترجیح دیتے تھے' یعنی کبھی کبھی کوئی یہاں سے گزرتا تھا۔

میں نے انہیں کہا کہ چارپائی ایک دو دنوں میں انہیں مل جائے گی' جب میں تھانے میں واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ تین بندے کسی جوان کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے

آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی سیٹ سنبھالتے ہی بلالیا۔ ان میں ایک بالکل جوان آدمی تھا' دوسرے دونوں بوڑھے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔

''جناب میرا بھتیجا کل سے غائب ہے؟'' ایک بوڑھے شخص نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''بزرگو..... پہلے اپنا تعارف کرواؤ۔''

''میرا نام بشیر ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی نذیر ہے' اس کا بیٹا یعنی میرا بھتیجا آصف کل دوپہر کو گھر سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ شام تک واپس آجائے گا۔ لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ تھانیدار صاحب' ہماری تو مت ہی ماری گئی ہے' آصف کے غائب ہونے سے ہم سب پریشان ہیں' ہم گاؤں کمال آباد سے آئے ہیں۔

نہ جانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے یہ باور کروایا کہ جس جوان کی لاش ملی ہے وہ آصف ہی ہے۔ میں نے انہیں سپاہی جمعہ خان کے ساتھ اسپتال بھجوادیا۔

وہاں سے ایک گھنٹے بعد جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ وہ آصف کی ہی لاش تھی' تینوں نے کپڑوں سے لاش کو پہچان لیا تھا۔

وہ اس وقت اسپتال میں ہی تھا' بشیر اور وزیر بھی وہیں رہ گئے تھے۔ یہ ساری خبریں سپاہی جمعہ خان لے کر آیا تھا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ایسا منظر خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ وہ تو شکر کریں ابھی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا' ورنہ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔

اگلے دن لاش پوسٹ مارٹم ہو کر آگئی۔ لاش لینے بشیر گاؤں کے دو بندوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ لاش لے کر چلے گئے۔

میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کھول کر بیٹھ گیا۔ رپورٹ کے مطابق مقتول کو گلہ گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ موت کا وقت رات گیارہ بجے سے بارہ بجے کے درمیان لکھا تھا۔ مدعی کے بغیر کارروائی نہیں چل سکتی' میں نے بشیر کی طرف سے رپورٹ درج کر کے اس کے اوپر اس کا انگوٹھا لگوالیا تھا۔ ایسے معاملات میں اکثر والدین یہی کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا تو ہیرا ہے' کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا اور نہ ہی کسی لڑکی کا چکر ہے۔

اس لیے اس بار میں نے ایسے کسی چکر میں پڑنے کی بجائے ادھر ادھر سے تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایسے مواقعوں پر ہمارے مخبر بہت کام آتے تھے۔ خالہ نصرت نے دو دن بعد جو رپورٹ دی اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

بشیر آڑھت منڈی میں پلے داری یعنی سامان لوڈ ان لوڈ کرتا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں حاجرہ اور ناصرہ شادی شدہ تھیں' دو ہی بیٹے تھے' آصف اور وزیر، دونوں ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ چھوٹا بیٹا ابھی پڑھ رہا تھا' وہ سیکنڈ ایئر میں تھا جبکہ آصف جواب مقتول تھا پڑھائی سے بھاگ کر کسی درزی کے پاس چلا گیا تھا۔ اب وہ ایک ماہر درزی تھا اور شہر میں اس کی دکان تھی۔ وہ لیڈی اسپشلسٹ ٹیلر تھا۔

یہاں یہ بات بتادوں کہ جس دن وہ گھر سے گیا تھا اس دن جمعہ تھا' اور جمعے کو وہ دکان سے چھٹی کرتا تھا۔ مخبر خالہ نصرت نے زور دے کر یہ بات کہی تھی کہ آصف کا دل کسی لڑکی میں ضرور اٹکا ہوا تھا جبھی تو وہ شادی کے ذکر پر یہ کہتا تھا کہ ابھی وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو ٹیک نہ شد دوشد والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی منظور عرف بھورے والا معاملہ باقی تھا کہ اچانک آصف کی لاش دریافت ہو گئی تھی۔ اب اتنا ہوم ورک مکمل ہو چکا تھا کہ میں آگے قدم بڑھا سکتا تھا۔

اب صغراں سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ شام کو میں نے عوامی لباس پہنا اور سپاہی جمعہ خان کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔

صغراں ایک تیس سالہ چھوٹے قد کی عورت ثابت ہوئی' رنگ گو اس کا سانولا تھا لیکن کشش بہت تھی، اور اس کی آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی صاف و شفاف پانی کے تالاب کے نیچے دو طلسماتی چراغ جل رہے ہوں' وہ اسکول کے گراؤنڈ کے کونے پر بنے ہوئے دس ضرب بارہ فٹ کے کمرے میں رہتی تھی۔ اس کے بچوں کی عمر بالترتیب ایک سال اور دو سال کے قریب ہو گی' دونوں بیٹے تھے۔ دونوں اس وقت سو رہے تھے۔ صغراں نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود سوئے ہوئے بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔

سپاہی کو میں نے پہلوان کی دکان پر بھیجا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گپ شپ لگائے' یہ میں نے ایک خاص مقصد

کے لیے کیا تھا۔ اس کے پاس بھورے کی تصویر کی کاپی تھی۔

صغراں سے میں اپنا تعارف کروا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا وہ خود ہی بول پڑی۔

''تھانیدار صاحب' یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ وردی میں نہیں آئے۔'' میں نے اس سوال کا جواب گول کرتے ہوئے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''صغراں! مجھ تک یہ اطلاع پہنچی تھی کہ بھورا تمہیں تنگ کرتا ہے۔''

''خدا پہلوان جی کا بھلا کرے یقیناً انہوں نے ہی یہ بات آپ کو بتائی ہوگی۔'' وہ بولی۔

''تم اس بات کو چھوڑو' کہ بات کس نے پہنچائی' تم یہ بتاؤ کہ کیا یہ بات سچ ہے؟''

''جب مرد بے وفا ہو جائے تو ایسے ہی ہوتا ہے۔'' وہ جوش سے بولی۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے میں اگر پوری بات یا کہانی آپ کو سنا دوں تو بہتر ہے۔'' میں نے ایسے اثبات میں سر ہلایا۔

میں پوری کہانی اس سے سننا چاہتا تھا۔

''عورت مرد کے وعدوں پر بھول جاتی ہے، میں بھی آصف کے وعدوں پر بھول گئی' میرا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، ماں باپ عرصہ ہوا مجھے چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی کے پاس چلے گئے تھے۔ میں ماموں کے گھر رہتی تھی، لیکن ممانی کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ میرا ماموں زاد اظہر مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے مجھے کھا جائے گا' اس کی بھوکی نظروں سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی تھی۔ ایک دن میں باورچی خانے میں روٹی بنا رہی تھی کہ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''میں آج تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''اظہر تم باہر چلے جاؤ' اگر ممانی جان آ گئیں تو قیامت آ جائے گی۔'' میں گھبرا رہی تھی لیکن وہ پرسکون تھا۔ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''یہ سب جذباتی باتیں ہوتی ہیں' خدا کے لیے جاؤ۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیئے اگر روٹی توے پر نہ پڑی ہوتی تو میں خود بھاگ کر باورچی خانے سے باہر آ جاتی۔

''سوچ لو..... اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا' اور میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے بڑی مشکل سے روٹی بنائی' اور کمرے میں آ گئی۔ ممانی جان اس وقت سو رہی تھیں۔ مجھے اب اظہر سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں اگر اس کی محبت کا جواب محبت سے دے بھی دیتی تو' کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اظہر کی منگنی اپنی خالہ زاد سعیدہ سے ہو چکی تھی' اور ممانی جان چاہتی تھیں کہ تین ماہ بعد سعیدہ کو اپنی بہو بنا کر لے آئیں۔ میں نے سعیدہ کو دیکھا ہوا تھا' موٹے موٹے نین نقش والی عجیب مغرور سی لڑکی تھی۔

تھانیدار صاحب' قصہ مختصر..... اظہر تو میرا دیوانہ ہو گیا تھا' اس گھر میں رہ کر میں نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ ممانی کی نظروں میں میرا مقام ایک نوکرانی سے بڑھ کر نہیں تھا۔ میں نے کئی بار اظہر کو یہ بات سمجھائی تھی کہ وہ جہاں ماں کہتی ہے شادی کر لے ورنہ ممانی جان کو جب یہ پتہ چلے گا کہ میری وجہ سے ان کا بیٹا شادی نہیں کر رہا' تو وہ مجھے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیں گی' لیکن اظہر تو اس معاملے میں چکنا گھڑا ثابت ہو رہا تھا' بس وہ ایک ہی بات کہتا تھا کہ اگر تم مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔ میرے دن کا چین اور رات کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ پھر..... وہ قیامت کی رات آ گئی جب میں نے ایک انتہائی فیصلہ کیا' میرا یہ قدم اٹھانے کی وجہ جان کر آپ خود فیصلہ کریں گے کہ میں حق بجانب تھی یا نہیں۔ اس وقت میں بے خبر سو رہی تھی' کہ اچانک تیز قسم کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔

''اظہر کی ماں ہوش سے کام لو جوان جہان بیٹا ہے۔ پیار محبت سے وجہ پوچھو اس طرح غصہ کرنے سے تو کام بگڑ جائے گا۔ یہ جوانی تو ہڑ (سیلاب) کا پانی ہوتی ہے' اپنا رستہ خود بناتی ہے۔'' یہ میرے ماموں کی آواز تھی۔

''آپ رہنے ہی دیں جی' ممانی نے کچھ گستاخانہ لہجے میں کہا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ اس لڑکی کا نام بتا دے۔ جس کلموئی کی خاطر یہ شادی سے انکاری ہے۔

لیکن یہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا' آج رات میں نہ خود سوؤں گی اور نہ اسے سونے دوں گی۔ لڑکی کا نام پوچھ کر رہوں گی۔'' ممانی کی غصے بھری آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''امی! آپ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں' مجھے بس سعیدہ پسند نہیں۔'' یہ اظہر کی آواز تھی۔ ''امی جان بس آپ ایک دو دن اور ٹھہر جائیں میں ساری بات کلیئر کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ سو جاؤ۔''

مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ سارا شور شرابہ ماموں اور ممانی کے کمرے میں ہو رہا ہے۔ میرے کانوں میں اظہر کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز آتے آتے ختم ہوگئی۔ یہ طوفان تو تھم چکا تھا لیکن جو طوفان میرے اندر آ گیا تھا اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ پتہ نہیں' کتنا وقت گزر گیا' باہر یقیناً رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ستارے آنکھیں جھپک جھپک کر زمین پر بسنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ میرے ذہن میں سوچوں کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ آخر اس سوچ نے میرے ذہن پر قبضہ جما لیا کہ مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

پھر میں نے جو تھوڑے بہت پیسے تھے وہ لیے' اپنے تین چار جوڑے کپڑوں کے لیے' میری ماں کی نشانی ایک جوڑی جھمکوں کی میرے پاس تھی، وہ لی اور گھر سے نکل آئی۔ اس وقت یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ میں اکیلی لڑکی کدھر جاؤں گی نہ کوئی ٹھکانہ تھا' اور نہ کوئی منزل تھی' غیر ارادی طور پر میرے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھنے لگے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ رات کے بارہ بجے کے قریب ایک گاڑی یہاں سے گزرتی تھی..... جہاں میرے ماموں کا گھر تھا..... وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ (میں قصبے کا نام نہیں لکھوں گا) بہرحال جب میں اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں کوئی مسافر نہیں تھا۔ میں ایک طرف اندھیرے میں کھڑی ہوگئی' میں ٹکٹ والی کھڑکی پر جا کر کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی..... جونہی گاڑی آ کر اسٹیشن پر رکی میں تیزی سے ایک ڈبے میں سوار ہوگئی..... ڈبے میں ایک جوان بیٹھا ہوا تھا..... میں نے سوچا..... کہ مجھے کسی اور ڈبے میں جانا چاہیے..... لیکن..... اچانک گاڑی چل پڑی..... میں ایک طرف کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔

آہستہ آہستہ گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی' مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی ہوں۔

جوان بظاہر مجھ سے لاتعلق نظر آتا تھا' لیکن ایک اکیلے ڈبے میں ایک لڑکی اور جوان لڑکا ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شیطان تو ازل سے آدم کی اولاد کو بہکاتا آیا ہے۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کہیں بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے دھر ہی نہ جاؤں۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے گھر سے قدم نکال کر غلطی کی ہے لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا' خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں گاڑی چلی جا رہی تھی۔ اچانک جوان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''خاتون گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے میں بہت شریف آدمی ہوں آپ بے شک اگلے اسٹیشن پر دوسرے یعنی فیملی ڈبے میں چلی جائیں' لیکن میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ آپ پریشان لگتی ہیں' اگر آپ چاہیں تو اپنی کہانی مجھے سنا دیں' ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ یہ دنیا اکیلی عورت کے لیے بہت بری ہے۔''

میں اس وقت تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہی تھی' میں نے اس جوان کو ہی تنکے کا سہارا سمجھ کر اسے اپنی کہانی سنا دی' درمیان میں کئی کئی جگہ پر میں رو پڑی۔

''اگلا اسٹیشن میری منزل ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ایک محفوظ جگہ لے جا سکتا ہوں۔ میری شہر میں ٹیلرنگ کی دکان ہے اور میرا نام آصف ہے۔'' جوان بولا۔

وہ شکل سے مجھے ایک شریف لڑکا لگتا تھا' میں نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا' اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا' وہ مجھے ایک گھر میں لے گیا' وہاں ایک بوڑھی عورت' اس کی آٹھ سالہ بیٹی' بہو اور بیٹا رہتے تھے۔ میں نے جب انہیں اپنی کہانی سنائی تو بوڑھی عورت (جن کا نام آسیہ تھا) بولیں۔

''بیٹی! تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے' جوان جہان لڑکی کو اس طرح گھر سے باہر قدم نہیں نکالنے چاہیے۔ میں تو کہتی ہوں تم واپس چلی جاؤ' میری بہو اور بیٹا تمہیں چھوڑ آئیں گے، اور ساری بات بتا آئیں گے' وہ یہ سمجھ لیں گے کہ صبح کی بھولی واپس آ گئی ہے۔''

''ماں جی!'' میں نے ان کے شفقت بھرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہتے ہیں اگر لڑکی رات مسجد

میں بھی گزار کر آ جائے تو اس کی پاک دامنی پر شک کیا جاتا ہے' پھر میری ممانی تو بہت کینہ پرور اور شقی القلب ہیں' وہ مجھے کسی صورت گھر میں نہیں گھسنے دیں گی الٹا آپ لوگوں کی بھی بے عزتی ہوگی۔''

''اگر انہوں نے تمہاری گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں دے دی ہو تو.....؟''

''ماں جی میں صبح جا کر حالات کا جائزہ لوں گا' یہ بھی ابھی جذباتی کیفیت میں ہے' یہ بھی اچھی طرح سوچ لے۔'' اس موقع پر ان کا بیٹا ناظم بولا۔

میں نے ہمت کر کے کہا' بھائی جان میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹی' اللہ بہتر کرے گا' اماں جی نے کہا۔

صبح صبح اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اماں جی بھی اٹھ گئی ہیں اور نماز کی تیاری کر رہی ہیں' میں نے بھی وضو کر کے نماز پڑھی' اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہاں ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی تھی' رات آصف مجھے ان کے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں نے ماں جی سے دودھ کے متعلق پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر بعد دودھ والا دودھ دے جائے گا' لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ بولیں۔

''آج ناشتہ میں بناؤں گی، بس آپ مجھے یہ بتا دیں کہ کیا کیا بنانا ہے۔''

''صغراں رہنے دو' ابھی بہو اٹھے گی تو ناشتہ بنا دے گی۔''

''دیکھیں آپ مجھے بھی اپنی بیٹی سمجھیں اور خدمت کا موقع دیں۔''

''ٹھیک ہے' ابھی تم آرام کرو' دودھ والا آتا ہے تو دونوں مل کر ناشتہ بنا دینا۔''

اس طرح میں نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا' اس گھر میں آ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تپتی دھوپ سے نکل کر ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئی ہوں۔

قصہ مختصر..... میری شادی آصف کے ساتھ ہوگئی۔ آصف نے مجھے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا۔ ہمارے دو بچے ہو گئے' کچھ عرصہ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا' جیسے آصف کا دل مجھ سے اچاٹ ہو گیا ہے' وہ بات بات پر مجھے ٹوکنے لگا' بغیر کسی وجہ کے میرے ساتھ لڑائی کرنے لگا۔ آخر ایک رات میں پھٹ پڑی۔

''آصف! میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا نہیں رہا۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ناظم کے ساتھ بڑی فری ہو رہی ہو۔'' آصف غصے سے بولا۔ یہ ایک ایسا الزام تھا ایک ایسا بم تھا جس نے میری زندگی کو ہلا کر رکھ دیا۔

''آپ کو شرم آنی چاہیے' ایسا بے ہودہ الزام لگاتے ہوئے ناظم کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہوں۔'' میں نے بھی ذرا غصے سے کہا۔

''میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں' خیر تم سو جاؤ' اور مجھے بھی سونے دو۔''

یہ نئی صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے یہ بات اپنے دل میں رکھ لی' کسی سے ذکر نہیں کیا' مگر کسی نہ کسی طرح یہ بات ناظم کو معلوم ہو گئی۔

ایک دن ناظم' آصف کو لے کر گھر میں آیا اور غصے سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آصف میں تمہیں اتنا گھٹیا نہیں سمجھتا تھا' تم نے مجھ پر اور اپنی پاک دامن بیوی پر شک کیا ہے۔''

''یہ کتنی پاک دامن ہے اور تم کتنے پارسا ہو' یہ مجھے پتہ ہے۔'' آصف کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا مجھے اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا' لیکن جو حقیقت تھی وہ منہ پھاڑے میرے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ اس دن اماں جی ان کی بہو گھر میں نہیں تھیں' ناظم کی چھوٹی بہن گڑیا رونے لگ گئی تھی۔

ناظم نے آصف کا گریبان پکڑ لیا اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ناظم نے آصف کا گریبان چھوڑ دیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے اماں جی اور خالدہ بھابی کھڑی تھیں۔ آصف تیزی سے باہر نکل گیا۔

البتہ خالدہ بھابی نے یہ ضرور کہا تھا کہ آصف کو یہ کیا ہوا' آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔

رات کو میں سونے کے لیے لیٹی تو سوچنے لگی۔ ٹھیک ہی عورت کو فساد کی جڑ کہا گیا ہے' میں واقعی فساد کی جڑ ہوں۔ اس سے پہلے کہ اس گھر میں جس نے مجھے پناہ دی' پیار کے

پھول نچھاور کیے۔ شفقت کی ٹھنڈی چھاؤں سے نوازا۔ دنگا فساد ہوا! مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے' نکل جانا چاہیے' دو دیرینہ دوست میری وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے۔ اب میں اکیلی نہیں تھی۔ دو ننھی جانیں میری ذمے داری تھیں ورنہ میں خودکشی کر لیتی۔

بہرکیف میں اپنے وجود کو سمیٹتے ہوئے اور دو ننھی جانوں کو لے کر ایک رات وہاں سے نکل آئی۔ میں بے وقوف ہوں' تھانیدار صاحب' اس کے علاوہ کچھ کر ہی نہ سکی میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر اس اسکول میں آ گئی' اور یہ کہانی سنائی کہ مجھے خاوند نے طلاق دے کر دونوں بچوں سمیت گھر سے نکال دیا ہے۔ اسکول کی مالکہ خدیجہ بیگم نے ترس کھا کر نہ صرف مجھے ملازمت دی بلکہ رہنے کے لیے چھت بھی دے دی۔ اسکول میں پہلے بھی ایک آیا تھی' جو چھٹی کے بعد گھر چلی جاتی تھی۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ مجھے شوہر نے شک کی بنا پر طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے' وہ میرے بچوں کی بھی آیا بن گئی ہے جب میں اسکول میں مصروف ہوتی ہوں تو وہ میرے بچوں کے پاس ہوتی ہے۔ تھانیدار صاحب یہ دنیا کبھی بھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ یہ ہے ساری کہانی۔''

صغراں! تمہاری کہانی سن کر مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کس آصف نے تمہیں سہارا دیا' پھر شک کا بیج اپنے من میں بو لیا لیکن کیا تم جانتی ہو کہ آصف قتل ہو چکا ہے۔'' اس کی کہانی سن کر میں نے ایک طویل سانس لی' اور پھر بولا۔

''بالکل نہیں' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور ان میں حیرانگی ہلکورے لے رہی تھی۔

''یہ حقیقت ہے' صغراں.....'' پھر میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''تھانیدار صاحب۔'' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ ''اگر واقعی میرے بچوں کا باپ قتل ہو گیا ہے تو آپ بھورے کو پکڑیں' مجھے شک ہے کہ آصف کو اس نے قتل کیا ہے۔ مجھے پہلوان بھائی نے بتا دیا تھا کہ بھورا بازار حسن کا دلال ہے' وہ تمہیں بھی گناہوں کی زندگی میں دھکیلنا چاہتا ہے' ایک دن بھورے نے مجھے روک کر کہا تھا کہ صغراں مجھے تمہارے سارے حالات کا پتہ چل چکا ہے' آصف بے وفا ہے تم اس سے طلاق لے لو' اور اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آصف کے دل میں بھی بھورے نے ہی شک کا بیج بویا تھا۔''

''دیکھو..... صغراں یہ کہانی میرے حلق سے اتر نہیں رہی' میری معلومات کے مطابق بھورا تم پر مرمٹا ہے۔''

''اب کسی کے دل کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں جی۔''

''خیر..... میں دیکھتا ہوں کہ کیا کر سکتا ہوں' بھورا تو منظر سے غائب ہے۔''

اس کے بعد میں پہلوان کی دکان پر آ گیا تھا۔ صغراں کے پاس سے آنے سے پہلے میں نے دو کام کیے تھے ایک تو اس سے نکاح نامہ لے آیا تھا' دوسرے اس سے اس کے ماموں کا پتہ بھی لے آیا تھا' جو میری ڈائری میں محفوظ ہو گیا تھا۔

ہم نے مخبروں کو ہائی الرٹ کیا ہوا تھا' مخبر نادر علی نے یہ اطلاع بھجوائی' کہ بھورا میڈم شمع کے ڈیرے میں چھپا ہوا ہے' میڈم شمع کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ آبادی سے باہر ایک نئی کالونی میں بنے بڑے سے مکان میں عصمت فروشی کا اڈہ چلا رہی ہے۔ اور بڑے اثر و رسوخ والی ہے۔ اس وقت صبح کے دس بجے ہوں گے' نادر خود گاہک بن کر وہاں گیا تھا اور جان بوجھ کر بھاؤ تاؤ کے معاملے میں جھگڑا کر کے واپس آ گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی عشرت علی کو عدالت میں بھیج کر شمع کے ڈیرے کا سرچ وارنٹ حاصل کر لیا۔

ہم نے دو گھنٹے بعد وہاں سے میڈم شمع کے علاوہ چار عورتیں اور سات مرد پکڑ لیے، اور رنگے ہاتھوں پکڑے۔ ان کے ساتھ ہم نے جو کچھ کیا۔ وہ معمول کی کارروائی تھی ۔ ان کو اب عدالت سے ہو کر جیل جانا تھا۔ واقعی وہاں سے بھورا بھی ہمارے ہاتھ لگا تھا۔

میں نے باقی کو حوالات میں بند کروانے کے بعد بھورے کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بھورا چالیس بیالیس سالہ ایک ہٹا کٹا بندہ تھا۔ رنگ پکا اور نین نقش واجبی سے تھے۔ بہرحال میں نے کمرے میں سپاہی جمعہ خان کو بلا لیا تھا۔

''جمعہ خان! اس مشین کو میں چلانے کی کوشش

کرتا ہوں اگر یہ مشین نہ چلی تو یہ تمہارے حوالے کی جائے گی۔''

''آپ سر بالکل فکر ہی نہ کریں' اگر یہ لاتوں کا بھوت ثابت ہوا تو میں اس بھوت کو سیدھا کر دوں گا۔'' جمعہ خان جوش سے بولا۔

''ہاں تو جناب بھورا صاحب' تم کیا سمجھتے تھے کہ پولیس سے چھپ جاؤ گے۔ تمہارے جرموں کی فہرست لمبی ہے' تم نے ایک بے سہارا عورت کو ہراساں کیا ہے' اور پھر اس سے مایوس ہو کر تم نے اس کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔'' میں نے بھورے کو گھورتے ہوئے کہا۔

بھورے کی کہانی اسی کی زبانی سنیے۔

''رات کا وقت تھا میں بازار میں پھر رہا تھا کہ مجھے ایک سوٹڈ بوٹڈ بندہ نظر آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ بندہ پہلی بار اس بازار میں آیا ہے میں اسے ایک اندھیری گلی میں لے گیا' پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ باؤ جی..... کس کو ڈھونڈ رہے ہیں اگر ساتھی چاہیے تو میرے ساتھ چلیے ایک سے بڑھ کر ایک مل جائے گا۔''

''دیکھو میں ایک شریف آدمی ہوں' سکون کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔''

''باؤ جی..... کس نے آپ کا سکون چھین لیا ہے۔'' میں نے اس کا دل اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے بڑے میٹھے اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''ایک عورت نے میرے دل کا سکون چھین لیا ہے۔'' اچانک وہ ہنس پڑا' میرے خیال میں یہ بے موقع ہنسی تھی۔

''خیر تھانیدار صاحب مجھے پتہ ہے کہ آپ مصروف آدمی ہیں میں باؤ کو میڈم شمع کے ڈیرے پر لے گیا۔ اس کے بعد ہر ہفتے باؤ آنے لگا۔ میں نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔ وہ مجھے میری ڈیمانڈ سے بڑھ کر دیتا تھا' ایک دن اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا' اور آخر میں کہا۔ اگر تم کسی طرح صغراں کو ڈھونڈ لو تو میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور ساتھ ہی ایک تصویر اپنی جیب سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی' میں نے تصویر جیب میں رکھ لی' جس قسم کی کہانی اس نے مجھے سنائی تھی اس میں سارے حالات کی ستم ظریفی تھی اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب وہ مجھے ایک دن اچانک مین بازار میں ملی تو اس کو دیکھ کر میں اپنا دل ہار گیا۔ میں نے بڑے خفیہ طریقے سے اس کا پیچھا کیا..... اس کے ساتھ ایک بچی بھی تھی، جس محلے میں وہ گئی تھی' وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے' میں نے جب اسے یہ کہا کہ مجھے اس عورت کے متعلق معلومات درکار ہیں تو اس نے صغراں سے متعلق ساری معلومات نکال کر دی۔

''تھانیدار صاحب میں نے اس کے دل میں شک کی چنگاری ڈال دی تھی۔ مجھے صغراں پر غصہ تھا' اس نے مجھے دھتکار دیا تھا' خیر کچھ دن بعد مجھے پتہ چلا کہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر صغراں غائب ہو گئی ہے۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آصف نے طلاق دے کر اسے گھر سے نکال دیا ہے' میرے دل میں تو یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ پتھی کسی نامعلوم منزل کی طرف اڑ گیا ہے' لیکن وہ مجھے پہلوان کی دکان پر مل گئی، وہاں جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو پتہ چل چکا ہوگا۔ کیونکہ یہ بات مجھے پتہ چل چکی ہے کہ پہلوان آپ کے پاس آیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

''بھورے.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک جوان قتل ہو گیا ہے' مجھے قاتل چاہیے۔ آصف نے تمہارے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا' تم مجھے اونٹ کی طرح بدلہ لینے والے بندے لگتے ہو، اگر تم نے آصف کو مارا ہے تو بتا دو۔ میں کیس میں ایسا خانہ رکھوں گا کہ تمہیں شک کا فائدہ مل جائے گا۔'' میں نے جال پھیلاتے ہوئے کہا۔ یہ ایک چال تھی اگر وہ قاتل ثابت ہو جاتا تو میں نے اسے چھوڑنا نہیں تھا۔

''تھانیدار صاحب میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آصف کے دل میں شک کا ایسا بیج بو دیا تھا کہ اس نے میری بات کو سچ مان لیا۔''

''تم نے ایک ایسا کام کیا ہے کہ میرا دل کرتا ہے تمہیں چھت سے الٹا لٹکا کر ایسی چھترول کرواؤں کہ ایک مہینہ تم ان زخموں کو چاٹتے رہو۔ خیر میں تمہیں اس کیس میں ایسا فٹ کروں گا کہ تم سال چھ مہینے کے لیے ضرور جیل کی ہوا کھاؤ گے۔''

میں نے اسے حوالات میں بھجوا کر اے ایس آئی کو بلا لیا۔ سارے حالات اسے بتاتے ہوئے کہا کہ وہ

اظہر کو تھانے میں لانے کا بندوبست کرے۔ بھورے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اظہر کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ وہ شہر کے ایک کارخانے میں کام کرتا ہے' وہ وہاں فورمین ہے' زیادہ تر یہیں رہتا ہے، کبھی کبھی گھر جاتا ہے' کارخانے والوں نے اسے رہائش دی ہوئی ہے۔ اس نے کارخانے کا نام بھی بتایا تھا' اور لوکیشن بھی ہم تو اشاروں میں بتائے گئے پتے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ تو پکا پکایا حلوہ تھا۔ بہرکیف اظہر کو جب تھانے میں لایا گیا تو وہ اس طرح چپ تھا جیسے اس کی سٹی کہیں گم ہوگئی ہو۔ وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں۔ دو چار تھپڑوں سے ہی اس نے سب کچھ بک دیا۔ اس کا اقرار جرم اسی کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب صغراں نے میرے دل کا سکون تو لوٹا ہی تھا ساتھ ہی ہمارے چہروں پر ایسی کا لک مل دی تھی جسے پانچ دریاؤں کا پانی بھی نہیں دھو سکتا تھا۔ گھر سے بھاگ کر اس نے ہماری عزت خاک میں ملا دی تھی۔ میں انتقام کی آگ میں جلنے لگا، اسی لیے میں نے یہ سب کیا۔''

ساتھ ہی اس نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو بھورے نے بتائی تھیں' باقی بتانے والی بات صرف یہ ہے کہ اس نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ جب وہ کمال آباد اور فیروز آباد کے درمیانی علاقے میں پہنچا تو وہاں آصف کو موجود پایا۔

میں نے آصف کی لاش کو بھی دیکھا تھا اور اب اظہر کو بھی دیکھ رہا تھا..... آصف دھان پان تھا..... جبکہ اظہر اس کے مقابلے میں ایک قوی الجثہ اور مضبوط ہاتھ پیروں والا بندہ تھا..... اظہر کے لیے آصف کو زیر کرکے اس کا گلہ گھونٹ دینا ذرا مشکل نہیں تھا۔ بہرحال اپنے استغاثہ کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے میں نے اظہر سے چند سوال وجواب کیے تھے۔

''اظہر تم نے صغراں کے لیے اپنے گھر میں ایسے حالات پیدا کردیئے تھے کہ وہ گھر سے نکلنے پر مجبور ہوگئی۔''

''بس جی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تھا۔ میں اپنی ماں کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیتا..... لیکن اس نے گھر سے بھاگ کر میرے لیے سارے راستے بند کردیئے۔ اس بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے تم مجھے یہ بتاؤ کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں موت کا وقت رات گیارہ بجے سے..... بارہ بجے کے درمیان لکھا ہے..... تم کس وقت جائے وقوع پر پہنچے تھے۔

''بس جی یقیناً آصف کی زندگی اسی وقت ختم ہوئی تھی میں تو نو بجے ہی وہاں پہنچنا چاہتا تھا لیکن راستے میں میری گاڑی خراب ہوگئی' اسے کسی مستری یعنی ورکشاپ میں لے جانے اور اسے ٹھیک کروانے میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے' مجھے امید تو نہیں تھی کہ آصف اس وقت وہاں موجود ہوگا' بس ایک موہوم سی امید کے سہارے میں وہاں پہنچ گیا۔ آصف وہاں موجود تھا۔ شاید اس کے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

''اب آخری سوال، تمہیں آصف کو قتل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بظاہر اس نے تمہارا کچھ بگاڑا بھی نہیں تھا۔ تمہاری اس کے ساتھ نہ دوستی تھی اور نہ دشمنی.....؟''

''تھانیدار صاحب..... قصے لکھنے والوں نے محبت وعشق کے بہت سے قصے لکھے ہیں لیکن یہ نہیں لکھا کہ لاکھوں کی آبادی میں' ہیر کو رانجھے' سسی کو پنوں' شیریں کو فرہاد' سیتی کو فراد بلوچ' اور سوہنی کو مہینوال سے ہی کیوں عشق ہوا تھا۔ یہ سب دل کی باتیں ہیں' اور دل پر' اور عشق پر کسی کا زور نہیں۔ میرا ارادہ آصف کو سمجھانے کا تھا کہ وہ بے وقوف نہ بنے۔ اپنی بیوی اور بچوں کو گھر لے آئے۔ لیکن..... اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ مجھے غصہ آ گیا۔ بات ہی ایسی تھی کہ تھانیدار صاحب' اس نے کہا تھا صغراں بے وفا ہے پہلے اس نے ناظم سے یاری لگائی' مجھے تو یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ ناظم سے ملنے یہاں آرہی ہے میں دو گھنٹے سے یہاں ہوں آج میں دونوں کو ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ آئندہ کوئی ایسی بے وفائی کی جرات نہ کرے لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو لگتا ہے تمہارے ساتھ بھی اس نے یاری لگالی ہے۔''

لیکن قارئین میرے خیال میں اب یہ بات پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' آپ کا کیا خیال ہے.....؟ یہ بات بھی میں آپ پر چھوڑتا ہوں' کہ کیا واقعی صغراں فساد کی جڑ تھی.....؟

رازِسربستہ

شناء اللہ خان احسن

اس دنیا میں بے شمار ایسی اشیا اور مقامات ہیں جن پر ایک اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس اسرار کے پیچھے دراصل ان اشیا تک دسترس رکھنے والوں کی چالبازی اور عیاری کو زیادہ دخل ہے کہ ایسے لوگ ان اشیا کے خواص کو انتہائی بڑھا چڑھا کر اور ان کا حصول انتہائی مشکل اور تقریباً ناممکن بتاتے ہیں تاکہ عام لوگ ان سے وہ اشیا منہ مانگے دام خرید لیں اور ان کی دال روٹی کا دھندا چلتا رہے

اسرار و رموز کی دنیا سے ایک انوکھی اور دلچسپ تحقیق، شناء اللہ خان احسن کے قلم سے ایک اور راز بے پردہ

سانپ کا منکا

گیدڑ سنگھی جیسی نایاب اور پراسرار شے کے بارے میں ایک پوسٹ میں تفصیلی تحریر کر چکا ہوں کہ جس نے گیدڑ سنگھی سے متعلق تمام اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیا۔ آج ہم سانپ کے منکے کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اکثر جوگی اور سنیاسی اس منکے سے منسوب عجیب پرستانی قسم کی داستانیں اور جادو بھرے عقل و شعور سے ماوراواقعات سناتے ہیں۔ اب دیکھئے عبدالستار نامی ایک جوگی اس منکے کے حصول کا کیا طریقہ بتاتا ہے۔

ہر سانپ تقریباً چار مہینے ریت اور مٹی میں رہتا ہے اور اِس کا زہر اِس کے اوپر جمع ہوتا رہتا ہے جہاں ایک سخت گٹھلی سی بن جاتی ہے، جسے منکا کہتے ہیں۔ ایسے سانپ کو پکڑ کر مخصوص جڑی بوٹیوں سے بنا مشروب پلاتے ہیں، جسے پیتے ہی سانپ قے میں اپنا منکا باہر نکال دیتا ہے۔ سانپ کا یہ منکا ہر جوگی کی زندگی کی ضمانت ہے۔

سانپ کی پوجا سے متعلق ستار نے بتایا کہ صرف کالے سانپ کی پوجا کی جاتی ہے جو شنکر (ہندو دیوتا) کے گلے میں ہوتا ہے۔ اس کا حصول انتہائی مشکل ہے اور ایسی لچھے دار باتوں میں اس کے عجیب و غریب فوائد بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اس کو منہ مانگے دام خریدنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

اسلام آباد کے قریب جوگیوں کی ایک بستی ہے جہاں ایک شوکت نامی جوگی نے منکے کے بارے میں انکشافات کیئے۔ اسلام آباد کی اس بے نام بستی کے ہر مرد کے پاس ایک گٹھڑی ہے۔ جس میں ہڈیاں، جڑی بوٹیاں، مختلف رنگوں کے سفوف، نگینے، پٹاریوں میں بند سانپ اور ایسی کئی اشیاء ہیں جن کے خواص سن کر اچھے اچھوں کا ہاتھ جیب میں چلا جاتا ہے۔ عورت کا دل نرم کرنے کا سفوف، دشمن کو زیر کرنے کا نسخہ، جسمانی عارضوں کا علاج، معشوق کو قدموں میں گرانے کا فارمولا، غرض ہر وہ خواہش جس کا پورا ہونا ناممکن نظر آتا ہو، اس گٹھڑی سے نکلی ہوئی کسی چیز کے استعمال سے پوری ہو جاتی ہے۔

لیکن صرف اتنا بتانے سے ان اشیاء کی پراسراریت نہیں کھلتی۔ شوکت ہی کی زبانی سنئے۔

"چالیس دن تک رات بارہ بجے چالیس مرتبہ یہ ورد پڑھیں 'اردو ورد، گرد جس کو پکاراں وہ میرے پاس' اور گیدڑ سنگھی پر پھونک دیں۔ چلہ ختم ہونے کے بعد گیارہ روپے کی نیاز دیں اور بس، ہر رکا ہوا کام ٹھیک ہو جائے گا، ہر مشکل آسان ہو جائے گی اور ہر انسان اور جانور آپ کو فائدہ ہی پہنچائے گا نقصان نہیں۔" اسی طرح منکا بھی زہر چوسنے کے علاوہ من کی مرادیں بھی پوری کرتا ہے۔ لیکن پہلے شوکت یہ بتاتا ہے کہ منکا آتا کہاں سے ہے۔ "نر اور مادہ سانپ جب پہلی مرتبہ ملاپ کرتے ہیں تو اپنے حلق سے منکا اگل دیتے ہیں۔ نر کا منکا بیضوی ہوتا ہے جبکہ مادہ کا منکا گول ہوتا ہے اور زیادہ پرتاثیر۔ کسی شخص سے کوئی کام ہو یا اسے دل کے قریب لانا ہو تو اس

Pakistanipoint.com

کے پاؤں تلے کی مٹی لے کر ایک ڈبیا میں منکے کے ساتھ رکھ دیں اور پھر اس شخص کا دل بدلتے ہوئے دیکھیں۔'' شوکت کی چھ شیشیوں میں ہر مرض کا ہی علاج موجود ہے۔ مردانہ کمزوری، احتلام، جوڑوں کا درد، دانت کا درد، ذیابطیس، بواسیر، کھانسی، بخار، لیکوریا وغیرہ وغیرہ۔ یہ لیکوریا کیا ہوتا ہے؟ میں نے پوچھا۔ شوکت نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جودھی بھین (بیٹی، بہن) کو ہو جاتا ہے۔''

چلتے ہوئے میں نے شوکت کو کچھ پیسے دیئے جنہیں لینے کے بعد اس نے مزید ایک ہزار کا تقاضا کیا۔ جب میں نے اس پر توجہ نہیں دی تو اس نے مجھ سے دو منٹ بیٹھنے کو کہا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، مجھ سے ایک ہزار روپے کا نوٹ لے کر اسے چار چھ تہیں دے کر میری ہتھیلی پر ایک منکنے کے ساتھ رکھا اور پھر کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور ایک مریل سا سانپ میرے ہاتھ پر رکھ کر اسے میرے دوسرے ہاتھ سے ڈھک دیا۔ میری ساری مرادیں پوری کروانے کے وعدے کے ساتھ اس نے کچھ دیگیں نیاز دینے کی بات کی اور جوگیانہ رعب کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ بولو ہاں یا نہ؟ میری نظریں سارا وقت اس کے ہاتھوں پر تھیں۔ مریل سانپ سے تو مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا لیکن یہ فکر ضرور تھی کہ اگر اس پہلوان نما جوگی نے کسی کرتب سے یہ نوٹ غائب کر دیا تو میں بی بی سی کے حساب کتاب والوں کو کیسے سمجھا پاؤں گا؟

میں نے اپنا ہاتھ جھڑا کر سانپ کو دم سے پکڑ کر اس کے حوالے کیا، ہزار کا نوٹ اپنی جیب میں رکھا اور اسے اسی کی بتائی ہوئی اصلی جوگی کی تعریف یاد دلائی۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک دم اپنے ماتھے پر مارا اور کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''قبولیت کا ٹیم تھا، آپ کی جندگی بن سکتی تھی لیکن خیر نصیب اپنا اپنا۔'' (بی بی سی کے ایک رپورٹر کی رپورٹ سے ماخوذ)۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود جوگی لوگ بھی گیدڑ سنگھی اور منکے کے بارے میں مختلف اور متضاد باتیں بتاتے ہیں۔ ان تفصیلات کا انحصار سننے والے کی ظاہری حیثیت پر ہوتا ہے۔ کس طرح کا انسان کس قسم کے جواب سے مطمئن ہو گا یہ بات گلی گلی گھومنے والے جوگیوں سے زیادہ کون جان سکتا ہے! لیکن پڑھے لکھے لوگ عام طور پر ان چیزوں کو ڈھونگ اور فریب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

سانپ کا منکا:۔

سب سے پہلے تو یہ جان لیجئے کہ جس طرح انسانوں اور جانوروں میں بیماری کے طور پر پتھری پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح سانپ کے بھی ایک پتھری پیدا ہو جاتی ہے جو کہ سانپ کا منکا کہلاتی ہے۔ عرب کے علمائے حکمت و روحانیت نے ان پتھروں پر کافی تحقیقات کی ہیں، جو حیوانات میں سے نکلتے ہیں۔ ان خاص پتھروں پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن ان میں سے زیادہ تر ضائع ہو گئیں، تاہم بعض اب بھی موجود ہیں، مثلاً کتاب ''العجائب المخلوقات'' اور کتاب ''حیات الحیوان'' میں جانوروں سے نکلنے والے ان خاص پتھروں کے بارے میں خاصی تفصیلات موجود ہیں۔ ''العجائب المخلوقات'' میں سانپ کے منکے کا تذکرہ کچھ یوں ہے۔

''حجر الحسیۃ:۔ اس کو فارسی میں مارمہرہ کہتے ہیں۔ اس کی صورت مانند ریٹھے کے ہوتی ہے اور اکثر سانپوں کے سر پر نمودار ہوتا ہے۔ اس پتھر کی خاصیت یہ ہے کہ جسے سانپ نے کاٹا ہو وہ شخص اگر اس پتھر کو پانی یا دودھ میں گھس کر کاٹے گئے حصے پر رکھے تو فوراً چسپاں ہو گا اور سارے زہر کو جذب کر لے گا۔ شیخ الرئیس نے لکھا ہے کہ یہ پتھر گزیدگی مار کو دفع کرتا ہے۔ جالینوس نے کہا ہے کہ یہ تاثیر ایک مرد راست گو سے میں نے سنی ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگ راوی ہیں کہ اس پتھر میں خود زہر ہوتا ہے۔ بعض سیاہ رنگ اور بعض خاکستری رنگ کے ہوتے ہیں۔ جس پتھر میں خطوط ہوتے ہیں وہ فراموشی کی دوا ہے۔ باقی ہر قسم اس مہرہ مار کے سنگ مثانہ کے حق میں مفید ہے۔''

یہ پتھری سانپ کے جسم کے کس حصے میں پیدا ہوتی ہے؟

جناب یہ سانپ کے سر میں پیدا ہوتی ہے۔ سانپ کے منہ میں تالو میں زہر کی ایک تھیلی ہوتی ہے جو کہ سانپ کے اگلے دونو کیلے اور سرنج کی سوئی کی طرح کھوکھلے دانتوں میں کھلتی ہے۔ جب سانپ کسی کو ڈستا ہے تو اپنے یہ نوکیلے دانت اس کے جسم میں داخل کر دیتا ہے، دباؤ پڑنے سے تھیلی دبتی ہے اور زہر ان کھوکھلے دانتوں سے ہوتا ہوا شکار کے جسم میں داخل ہو کر اس کے اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے شکار بے حس یا بے ہوش ہو جاتا ہے اور سانپ اس کو آرام سے نگل لیتا ہے۔ جنگل میں اکثر سانپ چوہے، مینڈک، چھپکلیاں یا پرندوں وغیرہ کو پہلے ڈس کر بیہوش کرتا ہے اور پھر نگل جاتا ہے۔ قدرت نے سانپ کو یہ زہریلے دانت اس لئے بخشے ہیں کہ سانپ اپنے شکار کو پکڑ یا چبا نہیں سکتا۔ اس

کے شکار کو ثابت نگلنے کی صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ جب شکار بے حس و حرکت ہو۔

اب اگر سانپ کا یہ زہر استعمال نہ ہو تو اس کی تھیلی میں موجود زہر بڑھتا جائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ تھیلی پھٹ جائے گی اور سانپ اپنے ہی زہر سے ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن جنگل میں موجود سانپ اپنی خوراک یا دفاع کے لئے جانوروں کو ڈستے رہتے ہیں اس طرح ان کے زہر کی مقدار نارمل رہتی ہے۔ سانپوں کی کچھ اقسام ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں زہر زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگتا ہے یعنی کہ اسے آپ ایک بیماری کہہ سکتے ہیں۔ اب زہر کی یہ زائد مقدار تھیلی میں بھرتے بھرتے ایک دانے کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ جیسے جیسے زہر بڑھتا جاتا ہے یہ دانہ حجم میں بڑھتا جاتا ہے اور پتھر کی طرح سخت ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر یہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ سانپ کے سر میں اس کا ابھار صاف محسوس ہوتا ہے۔ سپیرے لوگ اس ابھار کا مطلب جانتے ہیں اور وہ اس سانپ کو پکڑ کر تیز دھار چاقو یا بلیڈ سے سانپ کے سر میں ایک ہلکا سا چیرا لگا کر یہ پتھر نکال لیتے ہیں۔ سانپ کا منکا نکالنے میں یہ احتیاط رکھی جاتی ہے کہ سانپ منکا نکلنے کے بعد مرنے نہ پائے۔ اس کام کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جوگیوں اور سنیاسیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر منکا نکالنے کے دوران سانپ مر جائے تو وہ منکا بجائے مفید ہونے کے انتہائی سخت نحوست کا باعث ہوگا اور جس کے پاس وہ منکا ہوگا وہ شخص سخت نحوست کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

جس وقت یہ منکا سانپ کے سر سے نکالا جاتا ہے اس وقت یہ لبوترا اور لجلجا سا ریٹھے کی شکل کا ہوتا ہے۔ باہر کی ہوا لگنے سے یہ سخت ہو کر پھیل جاتا ہے اور چپٹی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وزن میں بالکل ہلکا ہوتا ہے اور دیکھنے میں ایک پلاسٹک کا ٹکڑا سا لگتا ہے۔

اس منکے میں سانپ کے زہر کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر اس منکے کو سانپ کی کاٹی جگہ پر لگا دیا جائے تو یہ اس زخم سے چپک جاتا ہے اور زہر جذب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تمام زہر جذب کرنے کے بعد یہ خود بخود الگ ہو کر گر پڑتا ہے۔ اگر اس کو دودھ میں ڈال دیا جائے تو جذب شدہ زہر کو دودھ میں چھوڑ دیتا ہے۔ جوگی اور سنیاسی اس سے مختلف کام لیتے ہیں۔ جوگی اور سنیاسی کبھی بھی کسی کو اصلی منکا نہیں دیتے بلکہ نقلی منکا دیتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے کسی کو یہ منکا دے دیا تو یہ خفیہ راز عام ہو جائے گا اور ان کے علم اور منتروں میں کوئی اثر نہیں رہے گا۔ عام لوگوں کو کیونکہ اصلی منکے کی شناخت کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ اکثر ایسے جوگیوں اور سپیروں کے ہاتھ بیوقوف بنتے رہتے ہیں۔ یہ منکا جوگیوں اور سپیروں کی جان بچانے کے کام بھی آتا ہے کہ اگر کسی سانپ کو پکڑنے کے دوران کوء سانپ ان کو ڈس لے تو یہ اسی منکے کے ذریعے اپنی جان بچاتے ہیں۔

منکا حاصل کرنے کا طریقہ:۔

جوگی اور سپیروں کو منکے والے سانپ کی شناخت کا علم ہوتا ہے۔ اگر جنگل میں سانپ پکڑنے کے دوران ان کو منکے والا سانپ مل جائے تو یہ اس کے سر سے منکا نکال لیتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن منکے والے سانپ سے ایک خاص طریقے سے منکا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک خاص سیاہ اور موٹے انتہاء زہریلے سانپ کو پالتے ہیں۔ اس سانپ کو ایک الگ اور محفوظ جگہ رکھا جاتا ہے اور اسے پینے کے لئے روزانہ دودھ دیا جاتا ہے۔ جب سانپ کو بغیر کسی جانور کو ڈسے روزانہ خوراک ملتی ہے تو اس کی تھیلی کا زہر کسی بھی جانور کو ڈسنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا اور بڑھتے بڑھتے اس کے سر میں منکا بن جاتا ہے۔ ایک خاص وقت آنے پر جوگی انتہائی احتیاط سے سانپ کے سر میں چیرا لگا کر یہ منکا نکال لیتے ہیں اور سانپ کو دوبارہ جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جوگی حضرات اس کو مختلف عملیات اور منتر وغیرہ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہر سانپ میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس طرح سمندر میں موجود ہزاروں سیپیوں میں سے کچھ میں موتی بنتا ہے اسی طرح منکا بھی ایک خاص طرح کے سانپ میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس پر جدید سائنسی طریقے سے تحقیق کی جا سکتی ہے کہ یہ کس نسل کے سانپ میں پیدا ہوتا ہے پھر اس سانپ کی افزائش نسل کر کے بڑی مقدار میں منکے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بالکل جس طرح پرل کلچر کے ذریعے سمندری سیپیوں سے موتی حاصل کئے جا رہے ہیں۔

سانپ کے منکے کے فوائد:۔

جوگی، سپیرے اور علما روحانیات اس کے بے شمار فوائد بتاتے ہیں۔ علامہ دمیری نے کتاب الحیوان میں بھی اس کے بے شمار فوائد بیان کئے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہی

ہے کہ یہ مارگزیدہ کے زخم سے زہر جذب کرلیتا ہے اور انسان کی جان بچ جاتی ہے۔ ہے۔ اس خاص سانپ کے منکے کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ اگر سب لکھے جائیں تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔ مثلاً یہ منکا جس کے پاس ہوگا وہ ہر قسم کے مخفی برے اثرات سے محفوظ رہے گا۔ دشمن اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے اور وہ حاوی رہے گا۔ یہ زہر کی طرح ہر قسم کی نحوست اور بداثرات بھی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ منکا کے حامل شخص پر کبھی کالا جادو اثر نہیں کرے گا۔ سانپ کا منکا انگوٹھی یا لاکٹ بنا کر پہننا یا جیب میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اسے صرف گھر میں ہی رکھا جاتا ہے۔ اندھیری جگہ رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اسے ناپاکی اور چمڑے سے بنی چیزوں سے بھی دور رکھا جائے۔ ناپاکی اور چمڑے کی بو سے یہ خراب ہوسکتا ہے۔ اس منکے کو ایک چاندی کی ڈبیا میں کسی اندھیری اور خفیہ جگہ رکھنا چاہئے۔ جس کے پاس یہ ہو اسے چاہئے کہ ہر ہفتے اس کو دودھ میں ڈبو کر رکھتا کہ اس میں جزب شدہ گندے اثرات اور گندی ہوا نکل جائے۔ اس کے بعد اسے دھو کر خشک کر کے دوبارہ چاندی کی ڈبیا میں محفوظ کردیا جائے۔ اگر کافی عرصے تک ایسا نہ کیا جائے تو منکا مردہ ہوکر ناکارہ ہوجاتا ہے۔

اصلی اور نقلی منکے کی پہچان:۔

آج کل جس طرح لوگ اصلی پتھروں کی پہچان نہیں رکھتے جب تک کہ آپ کو پتھروں کو جانچنے کا علم نہ ہو لوگ آپ کو قیمتی پتھروں کے نام پر بیوقوف بنا کر رقم لوٹتے ہیں اسی طرح نوسر باز اور جعلی جوگی و سپیرے پلاسٹک کے ٹکڑوں پر کالا رنگ کر کے منکے کے نام پر بیچ دیتے ہیں۔ اصلی منکے کی پہچان یہ ہے کہ یہ سائز میں ایک یا ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی شکل بیضوی یا گول ہوتی ہے۔ وزن میں بہت ہلکا سا ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام خصوصیات کا حامل ایک پلاسٹک کا ٹکڑا بھی ہوسکتا ہے۔ تو آیئے ہم آپ کو اصلی منکے کی شناخت کا ایک بہت ہی آسان اور تیر بہدف طریقہ بتاتے ہیں۔ اس کی جانچ کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ منکے کو اپنی زبان پر رکھئے۔ اصلی منکہ زبان پر رکھتے ہی زبان سے چپک جائے گا اور زبان کو چوسنے یا جذب کرنے لگے گا۔ بس اگر ایسا ہو تو سمجھ جائیں کہ یہ اصلی منکا ہے۔ اگر اصلی منکے کو پانی میں ڈالا جائے تو پانی کے ننھے ننھے بلبلے بھی نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اصلی منکا مردہ بھی ہوجاتا ہے۔ ایسا منکا ہوتا تو اصلی ہے لیکن کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اس کے مردہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کو زیادہ عرصے تک دھوپ میں رکھا جائے یا کافی عرصے تک اس کو دودھ میں نہ ڈالا جائے۔

آج کل اکثر بھکاری سپیروں کا روپ دھار کر پھرتے ہیں جن کے پاس اصلی منکا ہونا ناممکن ہے۔ یہ منکا خاندانی سپیروں اور جوگیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اکثر اصلی جوگی اور سپیروں میں شادی کی شرط بھی یہی ہوتی ہے کہ لڑکا پہلے منکا حاصل کرے۔ اسی طرح ایک اصلی جوگی یا سپیرا اس وقت تک مکمل طور پر اپنے پیشے کا ماہر نہیں مانا جاتا جب تک کہ وہ منکا حاصل نہ کرلے۔ یہ لوگ بھی بھی منکے کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ صرف شدید ضرورت کے تحت ہی اس کو استعمال کرتے ہیں۔

معمولی سانپوں کے زہر کا علاج تو جوگی حضرات منتروں اور جڑی بوٹیوں سے ہی کردیتے ہیں بلکہ کچھ جوگی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو خود سانپ کے ڈسے زخم سے زہر چوس چوس کر تھوکتے جاتے ہیں اور مریض بھلا چنگا ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر سانپ انتہائی زہریلا ہو اور مارگزیدہ کے بچنے کی امید نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ منکا استعمال کرتے ہیں۔

اب تو سانپ کے کاٹے کی ویکسین دستیاب ہیں اور اگر سانپ کے ڈسے کو مناسب مدت میں اسپتال پہنچا دیا جائے تو ویکسین کی مدد سے اس کی جان بچائی جاسکتی ہے۔ یہ ویکسین بھی سانپ کے زہر سے ہی تیار کی جاتی ہے۔ اس ویکسین کو تیار کرنے کے لئے سانپ سے حاصل شدہ زہر کو سرنج کے ذریعے گھوڑے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ سانپ کے زہر کے اثرات سے بچنے کے لئے گھوڑے کا مدافعتی نظام اینٹی باڈیز پیدا کرتا ہے جو گھوڑے کے خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ پھر اس گھوڑے کے جسم سے خون کی کچھ مقدار نکال کر ان اینٹی باڈیز کی مدد سے سانپ کے کاٹے کی ویکسین تیار کی جاتی ہے۔ اکثر جنگلات میں لوگ مختلف اقسام کے سانپ پکڑ کر ان کا زہر نکال کر ویکسین بنانے والی لیبارٹریز کو فروخت کرتے ہیں جیسا کہ آپ اکثر نیشنل جیوگرافک اور اینیمل پلینٹ وغیرہ میں دیکھتے رہتے ہیں۔ اور یہ ایک خاصا منافع بخش لیکن خطرناک کام ہے۔

https://www.facebook.com/sana.u.khan.733

ذوق آگہی

عثمان عبداللہ

دوستی کی ڈش

دوستی کی مزیدار ڈش بنانے کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں۔ تعارفی مصالحہ، خلوص، برداشت، محبت اور سب سے بڑھ کر پرخلوص انسان۔

سب سے پہلے پرخلوص انسان تلاش کر کے ان پر تعارفی مصالحہ چھڑکیں۔ جب مصالحہ جذب ہو جائے تو حسب ضرورت ملنساری، محبت خلوص کے ساتھ مکس کر کے ہنسی خوشی سے پیار کے پیالے میں رکھ دیں اب اسے نکالیں اور برداشت کا مصالحہ چھڑک دیں۔ اب زبردست دوستانہ ڈش تیار ہے۔ حسد کی آگ سے دور رکھی اور ہر موسم میں لطف اٹھائیں۔

پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر

اقوال زریں

❁ ہر کسی سے محبت اور پیار کے ساتھ بات کرو کیونکہ محبت ہی نفرت کی بیخ کنی کرتی ہے۔

❁ ہر مشکل میں خدا کی رحمت سے امید رکھو۔

❁ علم وہ ہی مفید ہے جس کی تحصیل کے بعد خود اس پر عمل کیا جائے اور پھر دوسروں تک اس کے پہنچانے کی از حد کوشش کی جائے۔

❁ روزی ضرور حاصل کرو مگر جائز اور حلال کیونکہ حرام میں برکت نہیں ہے۔

❁ سوال کرنے سے اور مخلوق کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچو۔

❁ ہر نیکی کو کرنے کی کوشش کرو کیونکہ قطرہ قطرہ ہی جمع ہو کر سمندر کی شکل اختیار کر جائے۔

❁ نیکی کی طرف رہنمائی کرنا بھی نیکی کرنے کی طرح ہے۔

❁ دولت اور لالچ انسان کو حیوان بنا دیتی ہیں۔

❁ جھوٹ میں شرمندگی جبکہ سچ میں اطمینان موجود ہے۔

❁ دنیا کی طلب آخرت کی کامیابی کی خواہش پر حاوی نہ ہونے دو۔

محمد اکرام الحق..... ضلع جہلم

دوست

■ دوست وہ ہے جو ڈھال کی مانند ہو، سلامتی میں بے شک پیچھے رہے لیکن مصیبت میں آگے ہو۔

■ محبت کی شناخت یہ ہے کہ ہر اس چیز سے علیحدہ رہو جو دوست سے جدا کرنے والی ہو۔

■ اگر تو ذرا ذرا سی بات پر اپنے دوست سے خفا ہوتا رہے گا تو تجھے ایسا دوست کہاں ملے گا جسے تجھ سے بھی کوئی شکایت نہ ہو۔

■ دوست کی طرف سے جو مصیبت پہنچے وہ عطا ہے اور عطا پر شکوہ خطا ہو۔

■ دوست کی قرابت رشتہ دار کی قرابت سے بڑھ کر ہے۔

■ دوست کا خاموش جائزہ اس سے محبت کی نشانی ہے۔

■ اپنے دوست کے دشمن کو دوست مت بناؤ اس طرح تم اپنے دوست کے دشمن بن جاؤ گے۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال

جالوت

فلسطینیوں کا ایک رگمل ڈیل پہلوان جس نے بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت عبازرت دی اور جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل پر عمالقہ کا غلبہ تھا اور انہوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ بنی اسرائیل پر اس وقت سموئیل نبی حکومت کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا بادشاہ ہونا چاہیے جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں چنانچہ سموئیل نبی نے حکم ربی کے مطابق طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ جب طالوت بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دریا پار کر کے آگے بڑھا تو انہوں نے طالوت سے کہا کہ ہم جالوت کا مقابلہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

قرآن مجید میں جالوت کا ذکر اس طرح سے آیا ہے۔

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک روز اللہ

تعالیٰ سے ملنا ہے۔ انہوں نے کہا بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی۔

اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب فرما آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔

جالوت سے جنگ کا مقام ''غور'' بتایا جاتا ہے جو اردن کی زیریں وادی میں ہے بعض نے جالوت کو امیر العمالقہ اور بقیہ الجبارین کے القاب دیے ہیں۔

جالوت کے بارے میں مختلف قصے اور کہانیاں گھڑی گئی ہیں اور مختلف قصوں میں اسے ملوث کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے جن لوگوں نے بنی اسرائیل پر مظالم کیے تھے ان سب کو جالوت کا نام دے دیا گیا ہے۔

ایم حسن نظامی.....قبولہ شریف

بے جا غصہ

بعض مرتبہ انسان حالتِ غضب میں اپنی دین داری کا خیال بھی بھول جاتا ہے' میں نے غصہ کے مانند کوئی دیو آسمان کے نیچے نہیں دیکھا' جس سے رحمت کے فرشتے اتنے دور دور بھاگتے ہوں۔

عبدالماجد.....کراچی

تواضع کی فضیلت

اپنے کو کم سمجھنا دراصل کمال اور بزرگی کی نشانی اور جنت کی چابی ہے لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔

خدا نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا ہے تو اے بندے! خاک کی طرح عاجزی اختیار کر تو لوگوں کے نزدیک باعزت اسی وقت ہوگا جب تو اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھے گا۔

پسندیدہ عقل مند منکسر مزاج ہوتا ہے میوے سے بھری شاخ زمین پر سر رکھ دیتی ہے۔

مرسلہ: یاسمین وہاب.....چنیوٹ

حلم و بُردباری

بردباری ابتدا میں کڑوی معلوم ہوتی ہے' عادت بن جانے کے بعد شہد سے زیادہ میٹھی لگتی ہے اگر کوئی خطا کار معافی چاہے تو درگزر کرو' بدبہ درحقیقت حلم میں ہے' غرور سے پُر تحمل سے خالی ایسے سرپرسرداری کا تاج حرام ہے۔

عبدالباری.....سکھر

حضرت عمر ابن عبد العزیز کی حکایت

ایک عقل مند نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی انگوٹھی میں ایک بہت قیمتی نگینہ تھا جوہری اس کی قیمت لگانے سے عاجز تھے۔ اتفاقاً ایک ایسا خشک سال آیا کہ لوگوں کے چودھویں رات کے چاند جیسے چہرے کمزور اور زرد ہو کر پہلی تاریخ کے چاند کی طرح ہو گئے۔ جب انہوں نے لوگوں میں آرام اور قوت نہ دیکھی تو خود آرام میں رہنا اچھا نہیں سمجھا' نگینہ بیچنے کا حکم دے دیا اور وہ پیسے درویش' مسکین' مسافر اور یتیموں پر خرچ کر ڈالے' کسی نے ان کو طعنہ دیا کہ ایسا نگینہ اب دوبارہ ہاتھ میں نہیں آئے گا۔

میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے اور آنسوؤں کی بارش ان کے رخسار پر شمع کے موم کی طرح بہہ رہی تھی' بادشاہ کے لیے زینت بُری ہے جب کسی بھی آدمی کا دل کمزوری سے زخمی ہو' میرے لیے بے نگ کی انگوٹھی مناسب لیکن رعایا کے دل غمگین ہوں یہ مناسب نہیں ہے۔

عقل مند حاکم دوسروں کے غم کی حالت میں اپنے عیش و آرام میں رغبت نہیں کرتے' اس آدمی کا دل ٹھنڈا ہے جو لوگوں کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتا ہے' خدا کا شکر ہے کہ یہ عادت اور سیدھا راستہ میرے زمانہ کے بادشاہ اتابک ابوبکر بن سعد کو حاصل تھا۔

فرح ناز.....کوئٹہ

نصائح حکیم بقراط

❁ دوستوں کے ساتھ اس قدر اخلاص رکھنا چاہئے جو تھوڑے سے تغیر سے زوال پذیر نہ ہو۔

❁ دنیاوی عروج و تنزلی کا' مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

❁ جب تمہیں وراثت میں مفلسی' تنگ دستی ملے تو نیکی اور شرافت کو اپنا سرمایہ بنالو۔

❁ انسان کی تمام خوشیوں میں' وہ خوشیاں سب سے بدتر اور نفرت کے قابل ہیں جو اوروں کی پسند پر موقوف

ہوں۔

❁ جو شخص حسد کو دوست رکھتا ہے۔ اس کا نفس قائم و دائم نہیں رہتا اور اس کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔

احمد حسن..... کوئٹہ

دو چیزیں

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش، پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ ایک موت اور دوسری تقدیر۔

فاطمہ..... کراچی

ہمارے وزیر

وزارت ہر حال میں وزارت ہے۔ چار کی ہو، پانچ کی ہو۔ سات کی ہو، پاؤں کی۔ گویا ہماری وزارت ربڑ کی ہے۔ جب چاہا کھینچ کر لمبی کر لی۔ چاہے میں پانی ملایا جائے تو پتلی ہو جائے گی۔ ہو جاتی ہے۔ وزارت کی چاہے میں پانی ملایا جائے تو گاڑھی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ شکار کھیلنے جا رہے تھے۔ ان کے ایک دوست جنہیں شکار سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ساتھ ہو لیے۔ دوستوں نے سمجھا دیا۔ میاں جنگل میں نہ تو بات کی جئو نہ آہٹ ہونے پائے ورنہ شکار ہاتھ نہیں آتا۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ تالاب کے کنارے تیتر نظر آئے۔ نئے شکاری نے انگریزی میں کہا وہ رہے تیتر اور سارے تیتر اڑ گئے۔ دوستوں نے کہا۔ بھئی یہ تم نے کیا کیا۔ کہنے لگے مجھے یہ کب معلوم تھا کہ تیتر بھی انگریزی سمجھنے لگ گئے ہیں۔ ہمارے کچھ سیاست دانوں نے ساری عمر شکار نہیں کیا۔ یونہی وقت گزاری کے لیے سیاست دانوں میں شامل ہو گئے۔ یہ تیتر ذرا نازک مزاج ہیں۔ ادھر آپ نے بات کی اور ادھر وہ پھر سے اڑ گئے۔ کچھ سیاست دان تو تیتر بھی ہیں اور بٹیر بھی۔ وزارت کی بہاریں بھی دیکھی ہیں۔ کبڈی بھی کھیلی ہے۔ اردو بھی جانتے ہیں، انگریزی بھی سمجھتے ہیں۔

ملک شبیر احمد ببر..... راجن پور

قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی شگفتہ مزاجی

1937ء میں چوہدری علی محمد خادم کا ایک مضمون روزنامہ احسان میں قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے بارے میں شائع ہوا۔ اس میں ایک بات لکھی تھی کہ قائد اعظمؒ کبھی لوگوں کو اپنے ہاں سماجی دعوت پر مدعو نہیں کرتے۔ جب اس مضمون کے بارے میں قائد اعظمؒ کو اطلاع ہوئی تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ٹھیک ہے میں عوام تک ان کے معدوں کے حوالے سے نہیں پہنچنا چاہتا۔

حسن اختر..... ناظم آباد

مختصر مگر پُراثر

امام ابن رجب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں، فرماتے ہیں میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہو گئی اور سزا میں تختی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاک گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

اقبال احمد..... قصور

پیر کے دن چھ خصوصیتیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پیر کے دن کو آقائے نامدار تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور خصوصیت ہے، وہ یہ ہیں کہ:۔

☯ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

☯ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔

☯ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔

☯ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن حجر اسود کو اپنی جگہ رکھا۔

☯ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے غارِ ثور سے سفر کی ابتداء فرمائی۔

☯ پیر ہی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

(مسند احمد: ۱/۶۷۷، رقم حدیث ۲۵۰۶)

انتخاب: صائمہ چوہدری..... کراچی

انتظار

ایک پاگل دوسرے سے ''یار اگر کوئی ہاتھی درخت پر چڑھ جائے تو اترے گا کیسے؟''

دوسرا پاگل ''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے' کسی پتے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے گا۔''

عنبرین ملک.....کوٹ ادو

شروعات

ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے کہا کہ ''بھائی صاحب! کل تمام دن آپ کا کتا بھونکتا رہا جس کی وجہ سے میری بیوی گانے کی پریکٹس نہ کرسکی۔ عجیب کتا ہے آپ کا؟''

''دیکھئے بھائی صاحب!'' پڑوسی نے جواب دیا۔ ''شروعات آپ کی بیوی ہی کرتی ہے۔''

منیبہ نواز.....جھنگ

حسن اور دوستی

فن کا منبع' فن کی روح ہے جب روٹی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے' اہرام مصر بناتا ہے' الحمرا کے طلسماتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کالی داس ''شکنتلا'' ملٹن ''گم شدہ جنت'' اور اقبال ''جاوید نامہ'' لکھتا ہے لیکن جب فن سے روٹی بچھڑ جاتی ہے تو شکنتلا مر جاتی ہے اور جاوید نامہ ردّی میں بکنے لگتا ہے پھر حسن مر جاتا ہے' مذہب مر جاتا ہے' بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

کمال بھٹی.....گھوٹکی' سندھ

کیا آپ جانتے ہیں؟

☐ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآنِ مجید لکھتا تھا۔

☐ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا ہے۔

☐ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

☐ حرم شریف کے اندر دنیا کے چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

☐ دنیا کا سب سے بڑا بلب پچاس کلو واٹ ہے اور یہ جاپان نے تیار کیا تھا۔

☐ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکہ میں ہوتی۔

☐ درختوں میں سب سے پہلا کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔

☐ انارکلی کا اصلی نام نادرہ بیگم تھا۔

☐ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔

☐ دنیا کا پہلا پاکٹ ٹیلی فون 28 اگست 1989ء میں بنایا گیا۔

انتخاب: نسیم قریشی.....شاہ پور چاکر

کھڑے ہوکر پانی پینے کے نقصانات

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق پانی پینے کی چھ سنتیں ہیں۔

پانی ہمیشہ بیٹھ کر' بسم اللہ پڑھ کر' سیدھے ہاتھ سے' دیکھ کر' تین سانس میں پینا چاہیے۔ پانی پینے کے بعد الحمدللہ کہنا چاہیے اس لیے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پانی پینا چاہیے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی نہ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں' جو درج ذیل ہیں۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے والا انسان شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے سے پیاس نہیں بجھتی۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے سے انسان کا پیٹ بڑھتا ہے۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے سے مثانہ میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے سے شوگر کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔

☐ کھڑے ہوکر پانی پینے سے انسان کا نظام انہضام خراب ہوجاتا ہے۔

☐ ان تمام بیماریوں سے بچنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی پینا چاہیے۔

محمد حنیف.....منڈی بہاؤالدین

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

نعت رسول ﷺ

اشکوں کو میں پلکوں پر عیاں دیکھ رہا ہوں
دربارِ محمدؐ کا سماں، دیکھ رہا ہوں
ہیں صبحِ مدینہ کے مناظر بڑے دلکش
ہر موج صبا عطر فشاں، دیکھ رہا ہوں
روشن ہیں مدینے کے در و بام انہی سے
رحمت ہے محمدؐ کی جہاں دیکھ رہا ہوں
اترائی ہیں آنکھیں بھی مقدر پہ مری آج
میں روضہ جان دو جہاں دیکھ رہا ہوں
اعجاز ہے آقا کی ثناء کا ہی یقیناً
آج اپنا لب و لہجہ جواں دیکھ رہا ہوں
فائق! ہے تبسم میں نہاں ہجر مدینہ
ہر زخم محبت کو عیاں دیکھ رہا ہوں

عمران فائق.....اٹک

اردو

کتنی پیاری ہے مری اردو زباں
اس زباں کا کوئی ثانی ہے کہاں
ہیں کروڑوں لوگ اردو بولتے
جانتا ہے اس کو سارا ہی جہاں
عربی و ہندی و ترکی، فارسی
ایک اردو میں ہے ان سب کا نشاں
ہے یہ گہوارہ اگر تہذیب کا
علم و حکمت کا ہے یہ اک کہکشاں
دیکھئے اردو کا یہ اعجاز ہے
ہو رہی ہے دن بہ دن یہ نوجواں
کون سا فن ہے وہ کیسا ہے ہنر
نا کیا ہو جس کو اردو نے عیاں
ارسلاں! کیوں نہ کریں اردو سے پیار
یہ ہے پاکستان کی قومی زباں

شاعر: ارسلان اللہ خان.....حیدرآباد، سندھ

غزل

بے حالتی سی ہے کوئی حالت کے ساتھ ساتھ
نفرت بھی چل رہی ہے محبت کے ساتھ ساتھ
بھولے ہوئے کو یاد کیا اور اس طرح
مصروفیت بھی تھی کوئی فرصت کے ساتھ ساتھ
کل چاہیے تھا جو وہ نہیں چاہیے ہے آج
رد و بدل ہوا ہے ضرورت کے ساتھ ساتھ
کس کس کے آڑے آئیے کس کس کو روکیے
فتنے کچھ اور بھی ہیں قیامت کے ساتھ ساتھ
بازار آرزو میں وہ تیزی تھی اس دفعہ
ہم رائیگاں بھی ہو گئے قیمت کے ساتھ ساتھ
تنہا نہیں تھے کوچۂ رسوائی میں ظفر
ایسے ہی تھے کچھ اور بھی حضرت کے ساتھ ساتھ

کلام: ظفر اقبال
انتخاب: محمد اکرام الحق.....جہلم

غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں ابر بھی
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
فریب دیتا ان کا ہے معیار زندگی
حسن والوں نے ہم پہ ستم کئی ڈھائے ہیں
بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی
یاروں کی باتوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
دامن پہ لگے داغ دیکھنا نہیں کوئی
شرارے بھی پھول بن کے پھر جگمگائے ہیں

محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد

غزل

جی اٹھے ہیں دیوانے جیسے ہاتھ جام آیا
لے کے پیار و الفت کا سال نو پیام آیا
دستکیں بھی دینے کی زحمت کب گوارا کی
ساتھ میں لیے خوشیاں کرنے کو قیام آیا
مسکرا اٹھیں آنکھیں کھل اٹھے سبھی چہرے
خوشبوؤں کے ہونٹوں پر سال نو کا نام آیا

دور افق سے آیا ہے آج جو نیا سورج
لطف و شادمانی کا کرنے انتظام آیا
جشن سال نو گزرا صبح سال نو آئی
نہ کوئی پیام آیا نہ وہ خوش کلام آیا
مسکراتے لمحوں نے جب دعائیں دیں مجھ کو
دل سے ایک ہوک اٹھی لب پہ تیرا نام آیا
زندگی یونہی نیرؔ بس گزرتی جاتی ہے
لے کے ہر نیا سورج آرزو کی شام آیا
نیرؔ رضوی.....لیاقت آباد، کراچی

غزل

وہ تن کا تماشائی رہا من نہیں دیکھا
دہلیز تک آیا بھی تو آنگن نہیں دیکھا
چہرے پہ کھلی دھوپ میں اس درجہ مگن تھا
آنکھوں سے برستا ہوا ساون نہیں دیکھا
اس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے ادھر سے
رکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا
دروازے پر آ کر جو کسی نے بھی صدا دی
دل کھول دیا دوست کہ دشمن نہیں دیکھا
کیوں میری تمنا کی طرف دیکھ رہے ہو
کیا تم نے کبھی آگ پہ خرمن نہیں دیکھا
اس نے بھی تبسم کا ہنر دیکھ کے نیرؔ
آلام چھپانے کا میرا من نہیں دیکھا
شاعر: شہزاد نیرؔ
انتخاب: پرنس افضل شاہین.....بہاولنگر

غزل

جو ہمارے مرید ہو جائیں
پیر خواجہ فرید ہو جائیں
ان دنوں سب کو ہم میسر ہیں
آئیں اور مستفید ہو جائیں
مسلمانوں کو سہولت ہے
کچھ بھی کر کے شہید ہو جائیں
ماتھا سجدوں سے داغدار کیا
تا کہ دھبے رسید ہو جائیں
یہی انسانوں کی طہارت ہے
خواب دیکھیں ، پلید ہو جائیں
مومنو! کوفیوں سے بہتر ہے
کھلے لفظوں یزید ہو جائیں
ہنس لے ، تھوڑا مزید ہنس لے یار!
تا کہ دکھ بھی مزید ہو جائیں
افکار علوی.....

غزل

غرور نار میرے پاؤں میں پڑا ہوا تھا
میں خاک تھا، سو میرا مرتبہ بڑا ہوا تھا
میرے خلاف تیرے کان کیوں نہ بھرتے یہ لوگ
تیری جبیں پہ میرا نام جو لکھا ہوا تھا
میں چاہتا تو زبانیں، خاموش کر دیتا
مگر میں چپ تھا، تیرے حکم پہ رُکا ہوا تھا
میں چاہتا تھا بتا دوں کہ دیوتا نہیں مَیں
مگر وہ حسن مرے نور سے ڈرا ہوا تھا
رحیم دن تھے، شفق دھوپ تھی، سجل شامیں
ابھی دنوں میں مرا تجھ سے رابطہ ہوا تھا
سو مَیں نے بات بدل دی گلے لگا کے اُسے
درست شخص غلط بات پر اڑا ہوا تھا
سو ماں کی قبر پہ پہنچا لپٹ کے رونے لگا
دلیر بیٹا کسی بات پر دکھا ہوا تھا
ہم ایک ساتھ تھے اور اپنی اپنی نیند میں تھے
وہ سو رہی تھی علی اور میں مرا ہوا تھا
علی زریون.....

غزل

مکاں نہیں تو درختوں میں بیٹھ جاتے ہیں
فقیر قدرتی خیموں میں بیٹھ جاتے ہیں
ہم ایسے لوگ محبت وصول کرنے کو
کبھی کبھار پرندوں میں بیٹھ جاتے ہیں
سہولیات میں آنکھوں کو اعتدال میں رکھ
زیادہ خواب بھی جوڑوں میں بیٹھ جاتے ہیں
مسافروں کو ضرورت عزیز ہوتی ہے
بڑے تپاک سے پیروں میں بیٹھ جاتے ہیں
ترے خیال کا سورج غروب ہونے پر
ترے مزاج کے لوگوں میں بیٹھ جاتے ہیں
لطیف لوگ تو ہوتے ہیں بھولنے کے لیے

مگر جو آپ کے ذہنوں میں بیٹھ جاتے ہیں

لطیف ساجد.....

غزل

سمندر بھی اکیلا ہو گیا ہے
سو بوجھ آنکھوں کا تنہا ڈھو گیا ہے
حرام اس نے مری نیندیں بھی کی ہیں
جو لمبی تان کے اب سو گیا ہے
وہ جس کی حکمرانی صحرا پر تھی
خرابے میں وہ دریا کھو گیا ہے
مجھے اب کوئی دنیا کا نہیں غم
مری آنکھوں میں ساون رو گیا ہے
نہیں ممکن کہ مٹ جائے یہ تحریر
کہ چند اک نقش دل پر دھو گیا ہے

احسان فارس.....

غزل

تمہارا ذکر کہیں جب بھی آنے لگتا ہے
نیا خیال کوئی سر اٹھانے لگتا ہے
میں پچھلی بات کو دہرانے بیٹھ جاتی ہوں
نئی وہ بات کوئی جب بتانے لگتا ہے
تمام رات مرا دل لبھاتا رہتا ہے
جو خواب دن چڑھے مجھ کو ڈرانے لگتا ہے
گزر چکا ہوا ہوتا ہے وہ بہت پہلے
نیا وہ واقعہ جب بھی سنانے لگتا ہے
میں آئینے میں جھلک اس کی ڈھونڈتی ہوں مگر
خیال اس کا تو آنکھیں دکھانے لگتا ہے
میں اپنی نقل مکانی کو یاد کرتی ہوں
کوئی بھی چھوڑ کے جب شہر جانے لگتا ہے
میں روشنی کے جزیرے پہ رہ کے آئی ہوں
بجھا دیا بھی مرا دل جلانے لگتا ہے
وہ میری سمت لپکتا ہوا ہولا کوئی
تمہاری یاد کا منظر چرانے لگتا ہے
بدن میں درد کو دیکھو کبھی بلکتا ہوا
یہ کاٹ کاٹ کے جب ماس کھانے لگتا ہے
تمام رنگ مرے ساتھ رقص کرتے ہیں
مری غزل کو وہ جب گنگنانے لگتا ہے
کبھی کبھی تو سحر لفظ روٹھ جاتے ہیں
قلم لکیریں عجب سی بنانے لگتا ہے

یاسمین سحر.....

غزل

دائمی ہجرتوں کے بیٹے ہیں
راستے جو گھروں سے نکلے ہیں
یہ زمیں مر رہی ہے اندر سے
تتلیاں پھول پیڑ روتے ہیں
بیٹھ کر سوچتے ہیں ذلت میں
ہم وہی آسمان والے ہیں؟
موج در موج خون اُچھلے گا
ان ہی دریاؤں سے جو اُجلے ہیں
بٹ رہے ہیں طعام ہر جانب
پھر بھی ہم لوگ کتنے بھوکے ہیں
تم کو معلوم ہی نہیں ہم پر
روز و شب جو عذاب اُترے ہیں
ہر زمانے میں میرے جیسے فگار
صرف دو چار لوگ ہوتے ہیں

سلیم فگار.....

غزل

دلکش دلکش بہاروں کا ساتھ
تیری کے مہکتے اشاروں کا ساتھ
میرا دل ہے اب تک اسی سوچ میں
بھلا کون دے گا غم کے ماروں کا ساتھ
بہت ہم نے چاہا مگر دوستو
ملا نہ ہمیں اپنے پیاروں کا ساتھ
کناروں نے کسی کا دیا ساتھ کب
نہیں چاہیے ہمیں کناروں کا ساتھ
بناتے رہے ہم جہاں آشیاں
رہا رانا ہر دم شراروں کا ساتھ

قدیر رانا.....راولپنڈی

غزل

کچا سا کوئی گھر ہو جو بنیاد کے بغیر
میں جی رہا ہوں آج بھی اولاد کے بغیر
اب دیکھ میری جان تجھ کو بھول بھی گیا

سب دن گزر رہے ہیں تیری یاد کے بغیر
جب محفلوں میں چار سو خموشیاں سی ہوں
ہم شعر کیا سنائیں کسی داد کے بغیر
اس دل کی داستاں بھی بھلا کس طرح لکھیں
اس داستاں کا کیا مزہ روداد کے بغیر
اب آئینے میں دیکھ میرا عکس بھی نہیں
اب مر گیا ہمزاد بھی دلشاد کے بغیر
کچھ اس طرح سے دوستو میں سرخرو ہوا
میں خود صلیب پر گیا جلاد کے بغیر
راشد ترین......مظفر گڑھ

لمحہ رخصت

ملنے کا آسرا پھر کیا ہوگا
سب کچھ تو بدل گیا ہوگا
آج تو زندگی اپنی ہے
کل جانے کون کس کا ہوگا
ہوسکتا ہے کبھی رستے میں ملیں
اور سمجھیں کہ نظر کا دھوکہ ہوگا
برسوں بعد کی ملاقات میں
کون کس کو پہچانتا ہوگا
کس کو تم سے اتنی محبت ہوگی
کون تمہیں اتنا جانتا ہوگا
یادوں کی نرم ریت پر
تمہارا نام مِٹا مِٹا ہوگا
سب باتیں بھول گئی ہوں گی
ہر منظر دھول سے اٹا ہوگا
تیری عمر ڈھل گئی ہوگی
میرا چہرہ بدل گیا ہوگا
بھول جانا آساں تو نہیں عمیس
مگر وقت کا تقاضا ہوگا
عمیس احمد......جھنگ صدر

محبت جرم مسلسل

میری نیندیں اب بھی روتی ہیں
انہیں تم سے محبت کی
عجب سی عادت ہے اب بھی
میرے سونے اور جاگنے کے اوقات
اب بھی معین ہیں لیکن
میری آنکھیں
سونے کو ترستی ہیں
عرصہ ہوا کسی نے
گلابی لبوں کا لمس میرے ہاتھوں پہ چھوڑا تھا
میرا ہاتھ آج بھی اس لمس کی گرمی سے دہکتا ہے
میں اب بھی اس پرتمکنت چہرے کو تصور میں جو لاتا
ہوں
وہ پری پیکر، حسیں، نازک اندام لڑکی
میرے دل کے تاروں کو بجاتی گنگناتی ہے
وہ پل جب ہم اک دوسرے کے سنگ
پہروں باتیں کرتے تھے
دن و رات کا فرق کیا معنی؟
یہ ماہ و سال چہ معنی دارد؟
اس کو پہروں سوچنے کی میری یہ عادت اب بھی ہے
دل بھی بے چین ہے
میں ادھورا بھی ہوں
اسے ہر چہرے میں ڈھونڈنے کی عادت اب بھی ہے
دیا آفرین......شاہدرہ

غزل

زندگی کٹتی نہیں اور بے بسی ہٹتی نہیں
ہمارے بیچ حائل جدائی سمٹتی ہی نہیں
بھولنا چاہوں بھی گر تو بھول تجھ کو سکتی نہیں
تیری یادیں میرے ذہن و دل سے نکلتی ہی نہیں
پاس آنے سے میرے شب بھی گریزاں ہے صنم
میری زندگی پہ چھائی تاریکیاں چھٹتی ہی نہیں
میری چاہت کی شمع فروزاں ہوگی ایک دن
امید اس دل کی کبھی بھٹکتی ہی نہیں
تلخیاں رشتوں میں جھیلنی تو پڑتی ہیں
مگر تلخی ایام شب کسی طور کٹتی ہی نہیں
حمیرا نوشین......منڈی بہاؤالدین

دوسرا، آخری حصہ

ناسور زدہ

ابن طالب

یہ وطن پڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے مگر ہم نے اس کی قدر نہیں کی اور اس ملک میں اپنے ذاتی مفادات کا خیال رکھا کبھی ملک کے بارے میں نہیں سوچا' مگر ایسے سب لوگ نہیں ہیں کچھ ایسے سر پھرے بھی ہیں جنہیں اپنی جانوں سے زیادہ یہ ملک عزیز ہے اور اس کی عزت وناموس کے لیے اپنی جانوں کی بھی پروا نہیں کرتے ان کی نظر میں ملک کی قدر و قیمت کیا ہے وہ اس کا عملی مظاہرہ کرکے دیکھاتے ہیں۔ خالی جمع خرچ سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

کچھ ایسے ہی سرفروشوں کا احوال جو معاشرے کے ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سربھڑ کی بازی لگانے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔

وطن عزیز پر سر دھڑ کی بازی لگانے والے جاں فروشوں کی داستان جنہیں اپنی زندگی سے زیادہ سرزمین سے پیار تھا

ساحر کی طرف سی دی گئی گائیڈ لائن پر ان دونوں نے تھوڑا سا کام کیا تھا۔ جب انہیں محسوس ہوا کہ اس طرح جاسوسی کر کے اکبر یا راجو کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے تو ان دونوں نے ڈائریکٹ ایکشن کا پلان بنایا اور سیدھے اکبر کے دفتر جا دھمکے۔ حالانکہ انہوں نے خود ہی سوچا تھا کہ کلب میں انہیں ٹریپ کیا جا سکتا ہے پھر بھی نجانے کیوں وہ کلب چلے آئے۔

ان دونوں نے تو پتہ نہیں کیا سوچ کر اغواء ہونے کا رسک لیا تھا مگر یہ رسک ان کے گلے پڑتا نظر آ رہا تھا۔

ساحر' ارشد کے بتائے ہوئے گیم کلب کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ گیم کلب کی عمارت واقعی شاندار تھی اور کلب اونچے درجے کا لگتا تھا۔ سامنے نظر آنے والے چہرے بھی شرافت بھرے ہی تھے۔ وہ پارکنگ میں کچھ دیر بیٹھ کے سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے میک اپ باکس نکالا۔ ماسک اتار کر اس نے تیزی سے میک اپ کرنا شروع کیا۔ میک اپ کرنے کے بعد اس نے چہرے پر دوبارہ ایک ماسک ایڈجسٹ کرنا شروع کر دیا۔ ڈبل میک اپ کر کے اس نے شیشے میں چہرے کا جائزہ لیا اور گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ کلب کے ریسیپشن کاؤنٹر پر پہنچا۔

''مجھے آصف مرزا سے ملنا ہے۔'' ساحر نے کہا۔

''آپ نے باس سے وقت لیا ہوا ہے؟'' ریسپشن گرل نے پوچھا۔

''نہیں۔ اسے کہو گولڈن کلب کے راجو کے حوالے سے بات کرنی ہے۔'' ساحر نے کہا۔ لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور کال ملا دی۔

''باس' ایک صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گولڈن کلب کے راجو کے بارے میں کوئی بات ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''یس باس۔'' لڑکی نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

''اگر آپ کے پاس اسلحہ ہے تو مجھے دے دیں۔'' لڑکی نے کہا اور ساحر نے پسٹل نکال کر اسے دے دیا۔

''لفٹ سے دوسری منزل۔ روم نمبر فور۔ آخری کمرہ ہے۔'' لڑکی نے کہا اور ساحر شکریہ کہتا ہوا لفٹ کی طرف

بڑھا۔ روم نمبر فور پر کوئی نیم پلیٹ وغیرہ نہ تھی۔ ساحر نے دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے بڑی سے میز کے پیچھے کرسی پر ایک سخت چہرے والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ یہ آصف مرزا تھا' اس کلب کا مالک۔

''کیسے ہو پیارے باس؟'' ساحر نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پاس فضول باتوں کا وقت نہیں۔ کیا بات کرنی ہے؟'' آصف مرزا نے ناگواری سے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ مہمان کو بندہ چائے پانی ہی پوچھ لیتا ہے۔ جتنا بڑا کلب اور اُتنی بڑی کنجوسی۔'' ساحر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ آصف مرزا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''کلب کی طرف سے ہی ہال میں جا کر پی لو۔ میں یہاں اس کام کے لیے نہیں بیٹھا ہوا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ اس کا شاید موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔ میں نے سنا ہے تمہارے ہاتھوں کی چائے میں عجیب کشش ہے۔'' ساحر نے لہجے میں عاشقی سموتے ہوئے کہا۔

''گیٹ آؤٹ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اس نے دراز سے پسٹل نکال کر چیختے ہوئے کہا لیکن اگلے لمحے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا جب ساحر کرسی سے اٹھا اور آصف مرزا کے ہاتھ سے پسٹل ایسے نکلا جیسے گیلا صابن ہاتھ سے نکلتا ہے۔

''تو تم اس میں چائے بناتے ہو۔ ویری گڈ۔ یہ مشین تو ہر گھر میں ہونی چاہئے۔'' ساحر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پسٹل کو غور سے دیکھ کر کہا۔

''اوہ۔ منہ بند کر لو۔ چائے کپ میں ہی ملے گی۔ ڈائریکٹ منہ میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ گرم ہوتی ہے۔'' ساحر نے آصف مرزا کے کھلے منہ کو دیکھ کر کہا اور آصف مرزا نے شرمندگی سے منہ بند کر لیا۔ ساحر نے پسٹل دوبارہ آصف مرزا کی طرف بڑھا دیا۔ آصف مرزا کی حیرانگی مزید بڑھ گئی۔

''کون ہو تم؟'' آصف مرزا نے پوچھا۔

''تم گولڈن کلب اور راجو سے بدلا لینا چاہتے ہو؟'' ساحر نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''تم پہلے اپنا نام بتاؤ۔ کون ہو تم؟'' آصف مرزا نے کہا۔

''میرا نام پاشا ہے۔ میرا تعلق شکارگڑھ سے ہے۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے۔ اس لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' ساحر نے کہا۔

''تمہارے انداز سے تو لگتا ہے کہ تم خود یہ کام کر سکتے ہو۔ پھر میرے پاس آنے کا مقصد؟'' آصف مرزا نے پوچھا۔

''کچھ کام میں کر سکتا ہوں' کچھ تم۔ جیسے میں راجو اور اس کے کلب کو تباہ کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے اسلحہ اور درست معلومات ضروری ہیں۔ معلومات تم دے سکتے ہو۔'' ساحر نے کہا۔

''میں تم پر بھروسہ کیسے کروں؟ یہ میرے لیے جال بھی تو ہو سکتا ہے۔'' آصف مرزا نے کہا اور ساحر نے چہرے سے ماسک اتار دیا۔ ماسک اترتے دیکھ کر آصف مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''تت.....تت.....تم کون ہو؟'' آصف مرزا نے حیرانی سے کہا۔

''اب تم میرا اصلی چہرہ دیکھ رہے ہو۔ عملی طور پر میں نے تمہیں پسٹل والا چھوٹا سا کرتب دکھا دیا ہے۔ اگر تمہیں مزید اعتماد کی ضرورت ہے تو شاید تم سٹی ہوٹلز کے مالک جابر کو جانتے ہو گے۔ انڈر ورلڈ میں اس کا خطرناک قاتل کے طور پر بہت چرچا ہے۔ اسے میں نے مارا ہے۔'' ساحر نے کہا۔ ڈبل میک اپ میں ہونے کی وجہ سے ساحر ابھی بھی میک اپ میں ہی تھا۔

''مگر وہ تو لاپتہ ہے۔ مارا ہوتا تو لاش سامنے آتی۔'' آصف مرزا نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میں نے کسی مقصد کے تحت لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' ساحر نے کہا۔

''اوکے۔ تم پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر یہ معلومات دینے سے میرا کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟'' آصف مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔

''مینیجر اکبر اور راجو کی رہائش گاہ کا پتہ اور وہاں کی سکیورٹی کی معلومات۔ ان کی کوئی کمزوری اور کوئی ایسا کلیو کہ بنا نقصان کے میں ان تک پہنچ جاؤں۔'' ساحر نے

سنجیدگی سے کہا۔

آصف مرزا نے تفصیل بتانی شروع کر دی۔ تفصیل بتانے کے دوران وہ حیرانی سے ساحر کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی جبکہ آصف مرزا کا خیال تھا کہ سکیورٹی کے انتظامات بہت سخت تھے اور یہ بہت بڑی پریشانی تھی لیکن ساحر کی آنکھوں میں اطمینان ہی اطمینان جھلک رہا تھا۔

''اگر تم برا نہ مناؤ تو جو تم نے مجھے تفصیل بتائی ہے' اسے کنفرم کروا سکتے ہو؟ یہ نہ ہو کہ تمہاری معلومات پرانی نکلیں اور میں بے موت مارا جاؤں۔ ایک تو یہ بے موت مارے جانے کی سمجھ نہیں آئی۔ موت آئے گی تو بندہ مرے گا۔ پھر بے موت کیسے مارا جا سکتا ہے۔'' اس نے بات تو سنجیدگی سے ہی شروع کی تھی مگر رستے میں ہی زبان ٹریک بدل گئی اور سر کھجاتے ہوئے اس نے سوچ میں ڈوب کر فلسفہ جھاڑ دیا۔

''کیا مطلب؟ یہ باتیں کیسے کنفرم کراؤں؟ اس پر تو میری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔'' آصف مرزا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''گولڈن کلب میں ضرور کوئی نہ کوئی آدمی ہوگا۔ اس سے پوچھ لو۔ پوچھ لینا کہ ابھی اکبر کہاں پر ہے اور پام کالونی والی رہائش گاہ میں کب جاتا ہے؟ اس سے بہت کچھ کنفرم ہو جائے گا۔'' ساحر نے کہا تو آصف مرزا نے سر ہلاتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔ اس نے تیزی سے نمبر ملایا۔

''گولڈن کلب۔'' ساحر کے کانوں میں ہلکی سی نسوانی آواز پہنچی۔

''راحیل سے بات کرواؤ۔ میں اس کا بڑا بھائی وکیل بات کر رہا ہوں۔'' اس نے لہجے بدلنے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''او کے۔ ہولڈ کریں۔'' جواب ملا۔

''راحیل بول رہا ہوں۔'' چند لمحوں بعد ایک باریک سی آواز سنائی دی۔

''راحیل اسٹاک کہاں ہے آج کل؟'' آصف مرزا نے پوچھا۔

''اسٹاک تو اسٹور روم میں ہی ہے۔ آج ایک پارٹی مال دیکھنے بھی آئی ہے۔ اس پارٹی سے بہت خاص ڈیل ہوگی۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''پام کالونی والا اسٹور روم چل رہا ہے ابھی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں' وہ تو بہت اہم اسٹور ہے۔ وہ بند نہیں کریں گے کمپنی والے۔'' جواب ملا۔

''او کے شام کو ملاقات ہوتی ہے۔'' آصف مرزا نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

''اب کنفرم؟'' آصف مرزا نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں۔ پارٹی والی کیا بات، کی راحیل نے؟'' ساحر مسکرایا۔

''اکبر کے بہت سے دشمن ہیں۔ کسی نے اس پر حملہ کیا ہے اور اب وہ اکبر کے شکنجے میں ہے۔ وہ انہیں عبرتناک موت مارے گا۔ اس کا ایک ہی انداز ہے' ابلتے تیل میں انسان کو ڈبونا۔'' آصف نے کہا تو ساحر چونک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کبیر اور جبران بھی اکبر وغیرہ کے پیچھے گئے ہیں۔ کہیں وہی تو نہیں پکڑے گئے؟ اس سوچ سے ساحر ایک لمحے کے لیے پریشان ہوا اور پھر پرسکون ہو گیا۔

''او کے آصف صاحب۔ جلد ہی آپ کو خوشخبری سننے کو ملے گی۔'' ساحر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس بار آصف نے بھی کھڑے ہو کر گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔

''تم سے مل کر بہت اچھا لگا پاشا۔ اسلحہ چاہیے تمہیں؟'' آصف نے پوچھا۔

''نہیں۔ اگر ضرورت ہوگی تو میں رابطہ کروں گا۔'' ساحر نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ریسپشن سے اپنا پسٹل لیتے ہوئے وہ تیز رفتاری سے پارکنگ میں موجود اپنی گاڑی تک پہنچا۔

❖❖❖❖

اگرچہ کبیر پولیس انسپکٹر تھا' اسے ان معاملات کا کچھ تجربہ تھا' مگر جن حالات سے وہ تینوں اس وقت گزر رہے تھے' کبیر بھی ان معاملات میں پوری طرح فٹ نہیں تھا کیونکہ محکمہ پولیس میں اس نے اس طرح کی مشکلات کا سامنا نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف جبران۔ ایک کمپیوٹر ایکسپرٹ تھا اور اس فیلڈ میں نونہال تھا۔ ان باتوں کے باوجود ساحر کو یقین تھا کہ وہ کسی کے ہاتھ آسانی سے نہیں

آئیں گے۔ مگر پھر بھی وہ جلد سے جلد گولڈن کلب پہنچنا چاہتا تھا تاکہ کوئی نقصان نہ ہو۔

وہ دونوں ہوش میں آچکے تھے۔ ان کے سروں کے عین نیچے بڑے بڑے ٹب تھے جن میں تیل ابل رہا تھا۔ الٹے لٹکے ہونے کی وجہ سے دونوں کے چہرے بے انتہا سرخ ہو چکے تھے۔ کمرے میں صرف دو افراد موجود تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مشین گنیں موجود تھیں' اس طرح مشین گنیں رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ان رسیوں کو کنٹرول کرنا ہے جن رسیوں کے ساتھ ان دونوں کو لٹکایا گیا تھا۔ وہ ان رسیوں کے سروں کو دیوار میں موجود کنڈوں میں باندھ کر پاس کھڑے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی' جس میں اچانک ہلچل پیدا ہوئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر سب نے چونک کر دیکھا۔ کھلے دروازے میں اکبر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''کیسے ہو یارو؟'' وہ مسکرایا۔

''بھوک لگی ہے۔'' جبران بھی جواباً مسکرایا۔

''تمہاری دعوت کا ہی تو پروگرام ہے۔ تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''تیسرا ساتھی..... کیا مطلب تمہارا.....؟'' کبیر نے الجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''اگر تم لوگ ہمارے خلاف معلومات حاصل کر سکتے ہو تو ہم وہاں تمہاری وجہ سے ہونے والے اپنے نقصان سے کیسے بے خبر رہ سکتے ہیں؟'' اکبر غرایا۔

اس کی بات سن کر پہلی بار ان دونوں کو احساس ہوا کہ ساحر نے براہِ راست کچھ کر گزرنے کا آئیڈیا کیوں نہیں دیا تھا اور تیز رفتاری سے کام کرنے کی ہدایت کیوں کی تھی۔ ظاہری بات ہے کہ حاکم رانا کے اغواء کی رپورٹ گولڈ مین کو بروقت مل چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ حاکم رانا کے بعد وہ ٹارگٹ ہوگا۔ اس وجہ سے گولڈ مین ان کے استقبال کے لیے تیار تھا' اور وہ بے وقوفوں کی طرح خود اس کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔

''ہم کسی حاکم رانا کو نہیں جانتے۔ ہم تو بس دو ہی ہیں۔'' کبیر نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''اپنا لہجہ درست کرو۔ تمہارے سر کے نیچے پانی ابل رہا ہے۔ مجھے اپنی مرضی کا جواب نہ ملا تو اس میں غوطے کھاؤ گے۔ تمہاری کھال تک جھلس جائے گی۔ اکبر نے غرا کر کہا۔

''تم یہ دھمکی کسی اور کو دو۔'' کبیر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اس کو ٹب میں غوطہ لگواؤ۔'' اکبر نے چیختے ہوئے اپنے ملازم سے کہا' اس نے تیزی سے کبیر کی رسی ڈھیلی کی اور کبیر کا جسم ٹب کی طرف بڑھنے لگا۔

''وہ ہمارا دوست نہیں افسر ہے۔ وہ رہائش گاہ پر آرام کر رہا ہے۔'' جبران نے یہ صورت حال دیکھی تو فوری جواب دیا۔

''رہائش گاہ کا پتہ بتاؤ۔'' اکبر نے اشارہ کر کے کبیر کو تلنے کا پروگرام روکتے ہوئے پوچھا تو جبران نے تیزی سے ایک غلط پتہ بتا دیا۔ وہ شکل سے اس وقت بہت نروس لگ رہا تھا۔

''گڈ اب اسے غوطہ لگواؤ۔'' اکبر نے مطلب کی بات پتہ چل جانے کے بعد کمینگی سے دانت نکالتے ہوئے کہا تو کبیر کا جسم دوبارہ ابلتے تیل کی طرف بڑھنے لگا۔ جبران نے پریشانی سے کبیر کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں غصے سے جیسے دہک رہی تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

''رکو..... یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' جبران چیخا۔

''جو میں چاہتا تھا وہ معلوم ہو چکا ہے' اب تفریح کا پروگرام ہے۔'' اکبر نے کہا' اسی وقت کبیر کا جسم تڑپا۔ اس کا جسم پنڈولم کی طرح ٹب سے آگے کی طرف نکلا' اس کے جھٹکے کی وجہ سے رسی ڈھیلی کرنے والا شخص اچھل کر گرا۔ بدقسمتی سے کبیر کی رسی چھت میں موجود کنڈے میں اٹکی اور وہ جتنی تیزی سے اس ٹب سے دور ہٹا تھا' اس سے بھی زیادہ تیزی سے ایک دھماکے سے ٹب کے ساتھ ٹکرایا اور بے اختیار اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی' چیخ سن کر جبران سناٹے میں آگیا۔ کبیر ٹب سے ٹکرا کر زمین پر گرا تو ٹب اس کے اوپر الٹ گیا۔ کھولتا ہوا تیل اس کی کمر پر گرا تو تڑپ کر دو جا گرا۔ چند لمحوں تک وہ حرکت کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ابلتے تیل نے یقیناً اس کی کمر کو جھلس دیا تھا۔

یہ دیکھ کر جبران کا رنگ فق ہو گیا مگر وہ کچھ کر سکنے کی

پوزیشن میں نہیں تھا' اگر وہ کوئی حرکت کرتا تو شاید وہ بھی کبیر جیسی حالت میں زمین پر پڑا ہوتا۔

''حقیر کیڑا۔'' اکبر نے قہقہہ لگایا۔

کبیر واقعی زمین پر رینگ رہا تھا۔ گرم تیل نے اس کے اوسان خطا کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر اسے دردناک عذاب سے دوچار کردیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخی کے باعث سیاہ سا محسوس ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پانی کی یلغار۔ مگر پہلی غیر ارادی چیخ کے بعد سے اس کے ہونٹ' دانتوں کے قبضے میں تھے اور کمرے میں صرف اکبر کے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ تیزی سے کبیر کے سر پر پہنچا اور کبیر کے سر پر پاؤں رکھا۔

''یہ ہے تمہاری اوقات۔ چلے تھے ہمیں مٹانے۔''

اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور اس کے سر پر ضرب لگانے کے لیے پاؤں اٹھایا۔ اس کی ٹانگ ابھی ہوا میں تھی جب کبیر کا رینگتا ہوا جسم تیزی سے اکٹھا ہوا اور اس نے جسم کی طاقت کو یکجا کر کے ٹانگ اکبر کی دونوں ٹانگوں کے درمیان دے ماری۔ اکبر چیخ مار کر درد کے مارے جھکتا گیا۔ جیسے ہی وہ جھکا۔ کبیر نے اپنا اوپری دھڑ اٹھایا اور سر کی زوردار ٹکر اکبر کی ناک پر پڑی۔ پچک کی آواز کے ساتھ اکبر کی ناک بیٹھتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کبیر لہرا کر زمین پر گرا اور ساکت ہوگیا۔ دوسری طرف اکبر ناک پر ہاتھ رکھے چیخ رہا تھا۔ کبیر نے بے انتہا طاقت استعمال کرتے ہوئے جیسے اس کی ناک کا نام ونشان ہی مٹا دیا ہو۔ اکبر کے چہرے پر صرف اور صرف ناک کی باقیات تھیں۔ ناک نظر نہیں آرہی تھی۔

''گولی مارو ان دونوں حرامزادوں کو' اڑا دو ان کو۔''

اکبر چلایا۔ ملازم تیزی سے کمرے کے کونے کی طرف بڑھے جہاں انہوں نے مشین گنیں رکھی تھیں۔

گولیوں کا آرڈر سنتے ہی کبیر کا جسم پل بھر میں حرکت میں آیا۔ وہ جھٹکا کھا کر اٹھا اور اکبر کو ساتھ لیے دوبارہ زمین پر آرہا۔ اکبر نے نیچے گرتے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا' جیسے ہی اس کا ہاتھ جیب سے باہر نکلا' ٹھائیں کی آواز آئی' کبیر تیزی سے ایک طرف ہو کر گولی سے بچا اور جبران کی اوہ کی آواز سنائی دی۔

جبران کی آواز سن کر کبیر لاشعوری طور پر فوری مڑا اور دوڑا' ساتھ ہی اس نے لانگ جمپ مارا اور بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک رسی کو تھام لیا۔

اکبر کے پسٹل سے نکلنے والی گولی اس کنڈے پر لگی تھی جس میں جبران کو لٹکائے جانے والی رسی باندھی گئی تھی۔ گولی سیدھی رسی کے اوپر لگی اور رسی یکلخت ٹوٹی۔ جس وجہ سے جبران کے منہ سے اوہ کا لفظ نکلا اور کبیر نے لانگ جمپ کی بدولت اس کا سر اتھاما۔

اکبر اب کھڑا ہو چکا تھا' اس کے ملازمین مشین گنیں سنبھال کر کبیر اور جبران پر نشانہ سادھ چکے تھے جبکہ کبیر کسی شرابی کی طرح جھولتے ہوئے کسی نہ کسی طرح وہ رسی تھامے کھڑا تھا جس سے جبران کی سلامتی لٹکی ہوئی تھی۔

''بہت عرصے بعد تم جیسے جانبازوں سے واسطہ پڑا ہے۔ مزہ آگیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہیں چھوڑ انہیں جا سکتا۔'' اکبر نے تحسین بھری نظروں سے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرہ پر سرد مہری چھا گئی۔ اس نے پسٹل سیدھا کیا اور ایک بار پھر ٹھائیں کی آواز سنائی دی۔ گولی سیدھی کبیر کے کندھے پر لگی مگر اس نے رسی نہ چھوڑی۔ جبران کی دھڑکنیں ترتیب بھول چکی تھیں۔

''تم ڈھیٹ بھی ہو۔'' اکبر نے کہا اور گولی چلا دی۔ اس بار گولی جبران کے پاؤں کے قریب موجود رسی پر لگی۔ رسی ٹوٹتے ہی جبران کا جسم تیزی سے کھولتے ہوئے تیل سے بھرے ٹب کی طرف بڑھا' اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ٹب اور جبران کے درمیان اتنا فاصلہ ہی نہیں بچا تھا کہ وہ اپنے جسم کو کسی طرف موڑتا۔ اسی وقت کبیر نے سر کو جھٹکا اور چھلانگ لگادی۔

''اوہ.....'' اکبر کے منہ سے نکلا۔

اکبر اور اس کے آدمیوں کے منہ مارے حیرت کے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

کبیر اڑتا ہوا اس تپتے ٹب سے ٹکرایا اور ٹب الٹ گیا۔ کبیر اس بار پھر کھولتے ہوئے تیل پر گرا۔ ٹب الٹنے کی وجہ سے چولہے کی آگ نے یکدم زور پکڑا' جبران سر کے بل پہلے چولہے پر اور پھر کبیر پر جا گرا۔ کبیر سے لڑھکتے ہی وہ فرش پر پھیلے تیل پر گرا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

❖❖❖❖

گولڈن کلب میں داخل ہوتے ہی ساحر نے پارکنگ میں کبیر اور جبران کی کار پہچان لی۔ اس نے کار پارک کی' جیب سے موبائل نکال کر کبیر کو اور پھر جبران کو کال کی۔ دونوں کے فونز پر کال تو کنکٹ ہوئی مگر ریسیو نہ ہو سکی۔ ساحر تیزی سے گاڑی سے نکلا' گاڑی کی ڈگی کھولی اور ضروری اسلحہ جیبوں میں ٹھونسا' پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے تیزی رفتاری سے کلب میں داخل ہوا۔ کلب میں داخل ہوتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہینڈ گرنیڈ نکال کر اس کی پن کھینچتے ہوئے' اپنے عقب میں کلب کے مرکزی دروازے کے نزدیک اس طرح سے پھینکا کہ کوئی بھی اسے بم پھینکتے ہوئے دیکھ نہ سکے۔ ہر طرف سے بند ہال میں کان پھاڑ دھماکا ہوا اور ساتھ ہی چیخ و پکار کا بٹن دب گیا۔ ہر کوئی اپنی جان بچا کر' کھڑکیوں کے بند شیشے توڑتا ہوا کلب کی عمارت سے باہر ایسے گرا جیسے وائپر سے پانی کو گرایا جاتا ہے۔ ہال میں ہلچل مچ گئی ساحر ریسپشن پر موجود پریشان شکل والے پہلوان کے پاس پہنچا اور جمپ لے کر کاؤنٹر پھلانگا۔

''یہ..... یہ کیا.....؟'' پہلوان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ..... یہ..... وہ ہے۔'' ساحر نے ہکلاتے ہوئے کہا اور ایک زور دار گھونسا پہلوان کی ناک پر دے مارا۔ پہلوان نے چیختے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ساحر نے اچھل کر سر کی زوردار ٹکر اس کے پیٹ میں دے ماری۔ پہلوان پیٹ پکڑ کر جھکا۔ اس بار ساحر نے اس کی جھکی ہوئی گردن پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلا تو پہلوان صاحب تشریف کے بل کاؤنٹر سے ٹکرائے اور پھر جھٹکے سے سامنے موجود ساحر کے قدموں میں گرا۔ ساحر اس کے سینے پر سوار ہوا اور تابڑ توڑ مکوں کی بارش کر دی۔

''اکبر کہاں ہے؟'' اس نے مکے برساتے ہوئے پوچھا۔

''بب..... بب..... باس تہ خانے۔'' پہلوان نے لاشعوری طور پر جواب دیا تو ساحر کا ہاتھ رکا۔

''تہ خانے کا رستہ بتاؤ جلدی۔'' وہ غرایا اور پہلوان نے نیم غشی کی حالت میں تہ خانے کا رستہ بتایا۔ ساحر کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور پہلوان کنپٹی پر لگنے والی ضرب سے تڑپتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔ ساحر احتیاط سے کاؤنٹر سے باہر نکلا مگر خالی ہال دیکھ کر وہ سیدھا ہوا اور تیزی سے تہ خانے کی طرف دوڑا۔ دوڑتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پسٹل نکال لیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی مسکرایا بھی ہوگا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ پنجوں کے بل چلنا شروع ہو گیا تھا۔ تاکہ کوئی اس کی آمد کو نہ بھانپ سکے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ایک بند دروازے کے پاس پہنچا۔ دروازے کی ساخت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے' اس کا مطلب تھا کہ کلب میں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ تہ خانے والے نہیں جانتا تھے' چہ جائیکہ انہیں کسی نے کال نہ کر دی ہو۔ ساحر نے سر جھٹکا اور دروازے پر موجود بیل کا بٹن دبایا۔

''کون ہے؟'' چند لمحوں بعد ڈور فون سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''بب..... باس کلب پر حملہ ہو گیا ہے۔'' ساحر نے ہکلاتے ہوئے آواز بدل کر کہا۔

''کلب پر حملہ! کیا بکواس ہے۔ ان کا تیسرا ساتھی تو نہیں آ گیا۔'' بڑبڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ تیسرے ساتھی۔ کی بات سن کر ساحر کے کان کھڑے ہو گئے' اس کا مطلب تھا کہ اندر کبیر اور جبران ہی ہیں۔ ساحر الرٹ ہو گیا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا ساحر کی لات حرکت میں آئی اور دروازہ کھولنے والا اڑتا ہوا کمرے کے وسط میں جا گرا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پسٹل کے دہانے نے مچلتی ہوئی گولیوں کو آزاد کیا تو سامنے موجود دو افراد۔ جو ایک اجنبی کو دیکھ کر کنفیوز ہو گئے تھے' وہ چیختے ہوئے زمین پر آ گرے۔ دروازہ کھولنے والا ابھی تک فرش سے اٹھا نہیں تھا۔

سامنے دو ٹب الٹے ہوئے تھے اور کبیر اور جبران دونوں اوندھے پڑے ہوئے تھے' ان کے کپڑے تر تھے۔ ساتھ ہی آگ بجھانے والا ایک سلنڈر پڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی ساحر کو ساری صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا اور پھر اس کی نظریں تیسرے شخص پر جم گئیں جو اب فرش سے اٹھ چکا تھا۔ وہ لباس اور رکھ رکھاؤ سے اہم رتبے کا مالک

لگ رہا تھا۔ ساحر نے کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پسٹل کو بلند کیا۔

''مجھے مت مارو..... میں خود قیدی ہوں۔'' اس نے چیخ کر کہا مگر ساحر کے پسٹل سے گولی چلی اور اس شخص کی ران میں پیوست ہوگئی' وہ چیخ مار کر زمین پر آ گرا۔ اسے گولی مارتے ہی ساحر تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور اس کی کنپٹی پر ایڑی ماری۔ وہ چیخ کر ساکت ہوا۔

ساحر دوڑتا ہوا کبیر اور جبران کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے۔ ساحر نے ان کی شرٹیں اوپر کر کے دیکھا تو شاک کی وجہ سے شرٹیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور وہ جھٹکے سے پیچھے گرا۔ ان دونوں کے جسموں پر چھالے بن چکے تھے' جلد بری طرح جھلس چکی تھی۔ جبران کے سر پر گومڑ بنا ہوا تھا مگر وہ کبیر سے کم زخمی تھا۔ ساحر کا ذہن کچھ دیر کے لئے ماؤف ہوگیا۔ مگر اچانک وہ چونکا اور اس نے دونوں کے زخموں کا بغور معائنہ کیا اور پھر اس بے ہوش شخص کے پاس پہنچا' اس نے رسی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ پھر اس نے جیب سے فون نکالا اور نمبر پریس کیا۔

''یس..... پانڈے اسپیکنگ۔'' دوسری طرف سے بھاری آواز سنائی دی۔

''مسٹر پانڈے..... کیا گولڈن کلب کے کسی خفیہ رستے کو جانتے ہو؟'' اس نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''یس باس..... کلب کے عقب کی طرف ایک رستہ کھلتا ہے۔'' جواب ملا۔

''اوکے ایمبولینس لے کر گولڈن کلب کے عقب میں پہنچو۔ میرے دو ساتھی بہت نازک حالت میں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یس باس' دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔'' پانڈے نے کہا اور ساحر نے کال بند کر کے سیل جیب میں رکھا۔ اس نے تیسرے شخص کو' جو کہ اکبر تھا' دروازہ کی اوٹ میں لٹایا اور خود آگے بڑھ کر کبیر کو کندھے پر لاد کر باہر نکلا۔ وہ تیز رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تہ خانے سے نکل کر راہداری میں پہنچا اور ایک خالی کمرہ دیکھ کر کبیر کو اس میں لٹایا۔ اس کے بعد جبران اور پھر اکبر کو بھی وہ اس کمرے میں لے آیا۔

کبیر اور جبران کے جسم جلے ہوئے تھے مگر وہ تھے خطرے سے باہر' اس وجہ سے ساحر ظاہری طور پر نارمل ہی تھا مگر وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اسے پانڈے کا انتظار تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کا سیل فون وائبریٹ ہوا۔

''یس.....''

''باس! آپ کہاں ہیں؟'' پانڈے کی آواز آئی۔

''دوسری منزل۔''

''اوکے باس۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔'' پانڈے نے کہا تو ساحر نے کال بند کر دی۔

❖❖❖❖

اس کی خاموشی اور آنکھوں کی چمک ظاہر کر رہی تھی کہ اکبر کا حال بہت برا ہونے والا ہے۔

گولڈن کلب کے مینیجر اکبر کی آنکھیں کھلیں تو چند لمحوں کے لئے تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا ہوا اور وہ کہاں ہے۔ مگر جلد ہی اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ گولڈ مین کی طرف سے اسے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ تین لوگ گولڈ مین کے خلاف کام کر رہے ہیں' اگر وہ گولڈ مین کی تلاش میں آئیں تو انہیں فوری گولی مار کر قصہ تمام کر دیا جائے۔

اکبر نے اپنے کمرے میں موجود سکرین پر جب کلب کے ہال میں ہونے والا جھگڑا دیکھا تو وہ کھٹک گیا۔ اس نے جان بوجھ کر ان دونوں کو اپنے آفس بلوا لیا اور جب انہوں نے آتے ہی گولڈ مین کا پوچھا تو اکبر کنفرم ہوگیا کہ یہی اس کا شکار ہے مگر وہ دو تھے' تیسرے کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے اس نے انہیں تہ خانے میں پہنچایا اور اپنے من پسند تشدد کو بروئے کار لاتے ہوئے تفتیش شروع کی مگر ان میں سے ایک نوجوان جب ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر حرکت میں آیا اور جس طرح سے اس نے زخمی ہونے کے باجود اکبر پر ہلا بولا تھا' اکبر سچ مچ اندر سے ہل گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے اور جب اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو بچانے کے لیے دوسرے ٹب پر چھلانگ لگائی' اکبر عش عش کر اٹھا۔ اسے لمحہ بھر کے لیے افسوس ہوا کہ ایسے دلیر لوگوں کو مارنے جا

رہا ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی اوقات میں واپس آیا اور انہیں گولی مارنے کے لیے تیار ہوا۔ ان کی بے جگری دیکھتے ہوئے اس نے فوری گولی مارنے کا سوچا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی مارتا۔ دروازے کی بیل بجی۔ اس نے مائیک کے ذریعے پوچھا تو یہ سن کر اسے جھٹکا لگا کہ کلب پر حملہ ہو گیا' اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ ان دونوں کا تیسرا ساتھی پہنچ گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اکیلا انسان کلب پر حملہ نہیں کر سکتا مگر کمرے میں موجود بندھے ہوئے اور زخمی نوجوان کی کارکردگی دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ ان میں سے ایک بھی کلب اڑانے کے لئے کافی ہے۔ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سینے پر لات لگی۔ وہ اڑتا ہوا دور جا گرا۔ ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی اور اس کے لوگ چیختے ہوئے گرے۔ وہ اٹھا تو سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا' جس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھا اور پھر اس کی نظریں اکبر پر جم گئیں۔ نوجوان نے کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پسٹل کو بلند کیا۔

''مجھے مت مارو' میں خود قیدی ہوں۔'' اکبر نے ڈاج دینے کے لیے چیخ کر کہا مگر اس نوجوان کے پسٹل سے گولی چلی اور اکبر کی ران میں پیوست ہوئی' وہ چیخ مار کر زمین پر گرا۔ اسے گولی مارتے ہی نوجوان تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور اس کی کنپٹی پر ایڑی ماری۔ اکبر کو یوں لگا جیسے اس کی کنپٹی پر بم پھٹا ہو اور وہ چیخ اٹھا۔ اس کے بعد وہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا اور اب ہوش آیا تھا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا' اسے کمرہ الٹا نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر نیچے پڑی تو وہ گھبرا گیا۔ اس کے سر کے عین نیچے ایک بڑا سا ٹب تھا جس میں تیل بھرا ہوا تھا اور اب اس میں سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اکبر کا گلا خشک ہو گیا۔ اس نے زبان ہونٹوں پر پھیری اور جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ وہ آج تک بہت سے لوگوں کو اس عذاب میں سے گزار چکا تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اسی کو تیل کے ٹب پر الٹا لٹکا رکھا تھا۔ اس کے جسم پر ایک انڈرویئر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو وہ سوچوں کی وادی سے نکلا' سامنے وہی نوجوان کھڑا تھا جس نے اس کی ران میں گولی ماری تھی۔ وہ پرسکون چال چلتے ہوئے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا اور پھر وہ اٹھا' وہ تیزی سے اکبر کے پاس پہنچا اور اس کے دونوں بازوؤں کے نیچے سے رسی گزار کر اکبر کو گس کے باندھا اور پھر رسی چھت میں موجود ہک میں ڈال کر کھینچنا شروع کی۔ تھوڑی ہی دیر میں اکبر کا جسم سیدھا ہو گیا۔ نوجوان نے اکبر کے پاؤں سے بندھی رسی' جس کی مدد سے وہ چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا' وہ ڈھیلی کر کے اس کے پاؤں نیچے کئے اور پھر دوبارہ اکبر کو مزید اوپر کھینچا۔ اب اکبر کا جسم سیدھا لٹکا ہوا تھا۔ سر کی بجائے' پاؤں گرم تیل کے ٹب کے اوپر تھے۔

نوجوان نے دھیرے سے اس کی رسی ڈھیلی کرنی شروع کی' اکبر کے پاؤں تیل والے ٹب کی طرف بڑھنے لگے۔

''کک..... کک..... کیا کر رہے ہو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

مگر نوجوان نے جواب نہ دیا اور پھر اکبر کی چیخ و پکار کے باوجود اس نے رسی ڈھیلی کرنا نہ روکا۔ اس کے پاؤں کھولتے ہوئے تیل میں ڈوبتے گئے اور اکبر کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی' اور پھر تو جیسے کمرے میں چیخوں کا سیلاب آ گیا ہو۔ نوجوان نے رسی کو اسی پوزیشن میں لاک کیا اور خود موبائل نکال کر اس میں گم ہو گیا۔ اکبر مسلسل چیخے جا رہا تھا۔

''مم..... مم..... میرے پاؤں باہر نکالو..... پلیز..... جو تم کہو گے میں کروں گا۔ پلیز رحم کرو مجھ پر۔'' اس نے منتیں کرتیں ہوئے کہا۔

مگر وہ نوجوان تو جیسے بہرہ تھا۔ وہ موبائل میں ہی کھویا رہا۔ اکبر کی چیخیں تو جاری رہیں۔ مگر منتوں کی جگہ کبھی گالیاں لے لیتیں تو کبھی گالیوں کی کیسٹ روک کر اکبر منتوں والی کیسٹ چلا دیتا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کبھی وہ کیسٹ کی ایک سائیڈ چلاتا تھا جس میں صرف گالیاں تھیں' کبھی دوسری۔ جس میں صرف منتیں ریکارڈ کی گئی تھی۔

اچانک نوجوان نے منہ بسورتے ہوئے موبائل جیب میں ڈالا اور سر اٹھایا۔ سامنے لٹکے ہوئے اکبر کو دیکھ کر اس کو جیسے حیرت بھرا جھٹکا لگا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھ جیسے وہ اکبر کی موجودگی سے لاعلم تھا۔ اس نے تیزی سے اکبر کو اوپر کھینچا۔ رسی کو ہک کر کے وہ اکبر کے قریب آیا اور اس کے جلے ہوئے پاؤں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ ہاتھوں سے اس کے جلے ہوئے پاؤں کو ہوا دینے لگا۔ کبھی وہ پاؤں پر پھونکیں مارتا تو کبھی ہاتھوں سے ہوا دیتا۔

''بند کرو یہ پاگل پن' کیا چاہتے ہو تم؟'' اکبر نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نفسیاتی طور پر پاگل انسان کے ہاتھ چڑھ گیا ہے' اس وجہ سے اکبر انجانے خوف کے دائرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اذیت ناک موت رقص میں مصروف تھی۔ وہ خود ہی اگلے لمحوں میں درپیش عملِ جلاؤ کا ذہنی طور پر خاکہ بنا چکا تھا جس کی وجہ سے اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا' وہ ہر قیمت پر جلد سے جلد اس پاگل سے جان خلاصی چاہتا تھا۔

''گولڈ مین۔'' نوجوان نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ وہ ساحر تھا۔

''میرا یقین کرو میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔'' اکبر نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

''مجھے تم پر یقین ہے۔'' ساحر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ادب سے جھک کر کہا اور آگے بڑھ کر اکبر کی رسی ڈھیلی کی' اس کا جسم نہایت سرعت کے ساتھ ٹب کی طرف بڑھا اور کمرے میں چیخوں کی دوبارہ ریل پیل ہوگئی۔ اس بار اکبر گھٹنوں تک ٹب میں پہنچ چکا تھا اور اس کے پاؤں' گرم ٹب کے پیندے پر رکے۔ اب وہ دوہرے عذاب میں تھا' کھولتا ہوا تیل اسے الگ جلا رہا تھا اور تپتا ہوا پیندہ الگ۔ اس نے ٹانگوں کو حرکت دے کر ٹب کو گرانے کی کوشش کی مگر تکلیف کے باعث اس سے یہ کام درست طریقے سے نہیں ہو پا رہا تھا۔

''رر.....راجو ہے گولڈ مین.....راجو ہے.....'' اس نے چیختے ہوئے کہا تو ساحر چونک گیا۔

''راجو! تمہارا اسسٹنٹ.....میں کوئی فضول بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ وہ دو ٹکے کا شخص کیسے گولڈ مین ہو سکتا ہے۔'' ساحر نے غراتے ہوئے کہا۔

راجو' گولڈن کلب کا اسسٹنٹ مینیجر تھا۔ ساحر نے اس کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ حیران ہوا کہ جو معلومات اسے ملی تھیں اس کے مطابق راجو تو ایک تھرڈ کلاس غنڈہ تھا۔ جبکہ گولڈ مین جیسی حیثیت پر ہونے کے لیے اونچے درجے کا ذہن اور صلاحیتیں درکار تھیں۔

''میرا یقین کرو۔ راجو ہی گولڈ مین ہے۔ پلیز مجھے نکالو۔ میں سب بتاتا ہوں۔'' اکبر نے درد سے بلبلاتے ہوئے کہا۔

ساحر نے رسی کھینچ کر اسے ٹب میں سے نکالا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اکبر کی جلد گھٹنوں تک جھلس چکی تھی' کھال کے نیچے موجود گلابی جلد اور گوشت صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹب سے نکلتے ہی اکبر بے ہوش ہو گیا۔ تکلیف اس کی برداشت سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ساحر نے الماری میں سے اسپرے کی ایک بوتل نکالی اور اکبر کے گھٹنوں تک اسپرے کرتا گیا۔ اسپرے کرنے کے بعد اس نے کرسی کھینچ کر اکبر کے لٹکے ہوئے جسم کے نزدیک کی اور اس پر کھڑے ہو کر اکبر کا ناک اور منہ دونوں ہاتھوں سے بند کیا' چند لمحوں کے بعد اکبر کے جسم نے جھٹکا کھایا تو ساحر اسے چھوڑ کر کرسی سے اترا اور کرسی کو گھسیٹ کر پہلے والی جگہ پر لے گیا اور اس پر بیٹھ کر اکبر کی طرف دیکھنے لگا۔

''آج تک پتہ نہیں کتنے انسانوں کو کھولتے تیل میں تلا ہو گا۔ خود دو جھٹکوں میں ہی بے ہوش ہو گیا۔'' ساحر بڑبڑایا۔

اکبر پہلے تو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور جیسے ہی اس کی آنکھوں میں شعور بھری چمک ابھری' وہ اچانک چیخنے لگا۔

''اسپرے کر دیا ہے' فی الوقت تمہیں درد نہیں محسوس ہو رہا ہو گا۔'' ساحر نے کہا تو اکبر کی چیخوں کو بریک لگی اور اس نے چونک کر ٹانگوں کی طرف دیکھا۔

ہوش میں آتے ہی اسے لاشعوری طور پر کچھ دیر پہلے ہونے والے درد کا احساس یاد آیا تو چیخنا شروع ہو گیا۔ مگر

ساحر کی بات سچ تھی' جب اس نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگیں سن ہو چکی ہیں اور درد محسوس نہیں ہو رہا۔

''اگر ٹانگوں کا دیدار جی بھر کے کر لیا ہو تو کام کی بات کریں۔'' ساحر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''راجو ہی گولڈ مین ہے۔ وہ ڈاج دینے کے لئے کلب میں اسسٹنٹ بنا ہوا ہے ورنہ اصل میں گولڈن کلب کا وہی مالک ہے' میں تو سب کے سامنے ڈرامے کے طور پر موجود رہتا ہوں۔ کلب میں وہی ہوتا ہے جو راجو چاہتا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی بتاتے ہوئے کہا' جیسے اسے خطرہ ہو کہ ساحر دوبارہ اسے تلنے کے لئے نہ چھوڑ دے۔

''اس کا فون نمبر' حلیہ بتاؤ۔'' ساحر نے پوچھا تو اکبر نے تیزی سے سب بتا دیا۔

''راجو کی گرل فرینڈ یا بیوی ہے؟'' ساحر نے پوچھا تو اکبر نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر بیوی یا گرل فرینڈ ہو بھی تو اس کا اِس سب سے کیا تعلق۔

''لگتا ہے ٹانگوں کے درد کے غائب ہونے کی وجہ سے تمہارے ٹخنوں میں موجود دماغ چلنا شروع ہو گیا۔ کچھ کرنا پڑے گا۔'' ساحر غرایا۔

''سس..... سوری..... ایک گرل فرینڈ ہے اس کی۔'' اکبر نے کہا اور پھر خود ہی اس کے بارے تفصیل بتا دی۔ یہ ساری وہی تفصیل تھی جو ساحر کو آصف مرزا نے پہلے ہی بتا دی تھی۔ ساحر بھی بس یہ سب کنفرم کر رہا تھا۔

''راجو کے قریبی دوستوں میں کوئی ڈاکٹر بھی ہے؟'' ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ دو ڈاکٹر ہیں۔'' اکبر نے کہا اور ساتھ ہی تفصیل بتانی شروع کی۔

ساحر نے اس سے براہِ راست پوچھ گچھ کرنے کے بجائے دوسرا ہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ پہلے پوچھ گچھ کرتا اور پھر تشدد' اس نے پہلے تشدد کیا اور اکبر کے سارے کس بل نکال کر اسی کی فرمائش پر پوچھ گچھ شروع کی۔ اس طریقے کا بہت فائدہ ہوا تھا' اکبر خود بخود ہر قسم کی معلومات اگلتا جا رہا تھا۔

''تم نے بہت ساتھ دیا۔ تم دل کے تو بہت اچھے ہو۔ ایویں ہی لوگ تمہارے خلاف ہیں۔'' ساری معلومات ملنے کے بعد اس نے چہک کر اکبر سے کہا تو اکبر مسکرایا اور ساتھ ہی دل میں ساحر کو ایک عدد گالی دی۔

''مجھے معلوم ہے تم مجھے کوس رہے ہو۔'' ساحر نے مسکرا کر کہا تو اکبر نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا جیسے بچے کی چوری پکڑی جائے تو وہ فوری نہ میں سر ہلاتا ہے۔ اسی وقت ساحر کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے موبائل جیب سے نکالا اور پھر اسکرین پر موجود نام دیکھ کر وہ چونک گیا۔

''یس پانڈے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''باس! آپ کا پارسل تو اسٹور سے غائب ہے۔'' دوسری طرف سے پانڈے کی وحشت بھری آواز سنائی دی تو ساحر کے چہرے پر بھی پریشانی ابھری۔

اس نے کلب سے ہی کبیر اور جبران' پانڈے کے حوالے کر دیئے تھے کہ اسپتال لے جائے' اب پانڈے بتا رہا تھا کہ وہ اسپتال سے غائب ہو گئے تھے۔

''اسٹور چوک میں ہے؟'' اس نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ ایک دوست کا ذاتی اسٹور ہے۔ بہت ہی محفوظ تھا۔ پتہ نہیں کیسے پارسل غائب ہو گئے۔'' پانڈے نے شرمندگی بھرے لہجے میں کہا۔

''کوئی کلیو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ سب کچھ نارمل ہے۔'' پانڈے نے کہا۔

''پارسل کس پیکنگ میں تھے؟'' ساحر نے پوچھا۔

''بنیادی پیکنگ ہو چکی تھی' پارسل شیشے کے تھے' صرف غیر ضروری حرکت سے ہی نقصان ہو سکتا ہے۔'' پانڈے نے جواب دیا۔

''تو پارسل خود ہی ضروری حرکت کے لئے نکل گئے ہیں۔'' ساحر نے نارمل ہوتے ہوئے کہا۔

''خود۔ ایسا ممکن نہیں۔'' پانڈے نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے لیے ممکن نہیں' میں دیکھ لیتا ہوں۔'' ساحر نے کہا اور کال بند کر دی۔ کال بند کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔ اکبر پیچھے چیختا ہی رہ گیا۔

''لگتا ہے بچے بات دل پر لے گئے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

❖❖❖❖

شہر کی سب سے اہم سڑک پر بہت زیادہ رش تھا۔ رش کے باوجود موٹر سائیکل سوار اور سب ڈرائیور حضرات اپنے باشعور شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ہر قانون کو بالائے طاق رکھ کر جدھر سے جگہ ملتی تھی ادھر سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔

ان کی رفتار اور ہمت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کے وہ ستاروں سے آگے والے جہاں کی تلاش میں ہیں۔ سب کی دیوانگی دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک دن وہ اُس جہاں کو پا کر ہی دم لیں گے۔

اسی بے ہنگم رش میں ایک کار تیزی سے، مگر شفاف ڈرائیونگ کے تحت سڑک پر دوڑتی جارہی تھی۔ اس کار کا ڈرائیور شاید کسی اور سیارے کا باشندہ تھا۔ وہ بہت ہی احتیاط اور قوانین کی پاسداری کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا جس کے نتیجے میں ہر دوسری گاڑی کا ڈرائیور اپنے ماورائی کرتب سے اس کی برداشت کا امتحان لے کر آگے گزر جاتا۔

گاڑی ٹریفک سگنل پر پہنچ کر رک گئی۔ سگنل سرخ ہونے کے باوجود کچھ جانباز ڈرائیور ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ گئے۔ سڑک کنارے کھڑا بوڑھا قانون سیٹیاں مارتا ہی رہ گیا۔ قانون کی سیٹی سے زیادہ اونچی سیٹیاں سگنل توڑنے والوں کی تھیں۔ جیسے ہی سگنل کی بتی سبز ہوئی کار آگے بڑھی۔ ابھی وہ چوک میں ہی پہنچی تھی کہ دوسری طرف سے ایک بڑی بس سگنل کو توڑتے ہوئے پوری اسپیڈ سے اس کار سے ٹکرائی اور اسے لئے ہوئے آگے دوڑتی گئی۔ ٹریفک پولیس کے دو اہلکار اور چند لوگ کار کی طرف دوڑے، تب تک بس کا ڈرائیور بھاگ چکا تھا۔ پولیس والے نے ایمبولینس کے لئے کال کی۔ کار کی حالت دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ڈرائیور کے زندہ ہونے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایمبولینس پہنچ گئی۔ تب تک گاڑی کی باڈی کاٹنے کے لئے بھی کچھ لوگ پہنچ چکے تھے۔ کار کی باڈی کاٹ کر جب زخمیوں کا نکالا گیا تو کار میں سے تین افراد نکلے۔ تینوں کی حالت بہت نازک تھی۔ پھر دو اور ایمبولینس کا انتظام کیا گیا اور وہ زخمیوں کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف دوڑ پڑیں۔ تینوں زخمیوں کو ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹرز بہت تندہی سے ان کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔

دوسری طرف جب زخمیوں کو ایمبولینس میں ڈالا جارہا تھا تب ایک شخص ان زخمیوں کی ویڈیو بنا رہا تھا۔ پھر اس نے وہ ویڈیو کسی کو بھیجی اور دوسری طرف سے جواب ملنے پر وہ ہجوم سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی اس نے فون نکالا اور کال ملائی۔

''آپ کا کام ہوگیا۔'' اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں یقین ہے کہ کام پورا ہوگیا؟'' ایک کرخت آواز سنائی دی۔

''یس، لیکن اگر ابھی نہ بھی ہوا ہو تو ان کی حالت سے ظاہر ہے کہ وہ اسپتال میں ایک دن بھی نہیں نکالیں گے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے پکی رپورٹ چاہیے۔ اسپتال جاؤ اور معلوم کرو کے ان کی کیا حالت ہے۔'' دوسری طرف سے سخت انداز میں کہا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں خود جاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کال بند ہوگئی۔ اس نے کار کا رُخ اسپتال کی طرف موڑا۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہونا منع تھا۔ اس نے کھڑکی سے ہی دیکھا تو اسے اُن زخمیوں میں سے ایک ہی نظر آیا۔ دوسرے شاید ایسی جگہ تھے جو کھڑکی سے نظر نہ آتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔

''ڈاکٹر صاحب! جو مریض ابھی کار کے حادثے میں لائے گئے ہیں ان کے کیا حالات ہیں؟'' اس نے لہجے کو باوقار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کون ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اُن میں سے ایک میرے کارخانے کا منیجر ہے۔'' اس نے کہا۔

''سر، تینوں کی حالت نازک ہے۔ کل تک ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان میں سے ایک کی تو بہت ہی خطرناک حالت ہے۔'' ڈاکٹر نے افسوس سے کہا۔

''آپ خرچے کی پریشانی مت کیجئے گا۔ بس ان کو بچا لیں۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ سرکاری اسپتال ہے۔ خرچہ ویسے بھی نہیں ہوگا۔ آپ بس دعا کریں۔'' ڈاکٹر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص

مڑا اور پارکنگ کی طرف چل دیا۔ اپنی گاڑی نکال کر اس نے دوبارہ کال کی۔

''آپ کے مریض ابھی تک تو وہ زندہ ہیں لیکن کل تک زندہ رہنے کی امید نہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر سے مل کر آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اوکے۔ کسی کو نگرانی پر بھیج دو۔ ہوسکتا ہے ان کا کوئی ساتھی بھی ہو۔'' جواب ملا۔

''آپ کہیں تو..... اسپتال میں ہی نہ ان کا خاتمہ کر دیں؟'' اس نے کہا۔

''فضول میں گلے مصیبت ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ حادثے کو قتل بنانے کی غلطی مت کرو۔ ویسے بھی اب وہ کافی عرصہ ملنے جلنے کے قابل نہیں۔ اگر زندہ بچ بھی گئے تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ مگر نگرانی میں کوتاہی مت کرنا۔'' آخری جملہ غرا کر کہا گیا تھا۔

''جی میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور ساتھ ہی کال بند ہوگئی۔ اس نے گاڑی اپنی رہائش گاہ کی طرف موڑ دی۔ اب وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔

لوگ اسے مختلف کاموں کے لئے ہائر کرتے تھے۔ اس کام کے لیے بھی اسے بہت بڑی رقم کے عوض اسے ہائر کیا گیا تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اب وہ سکون میں تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر اس نے مخصوص انداز میں ہارن دیا اور گاڑی کو گیٹ کھلنے پر اندر لے گیا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں اس نے موبائل وغیرہ ایک میز پر رکھا اور نہانے چلا گیا۔ جیسے ہی وہ واش روم میں داخل ہوا، اس کے سر پر ایک دھماکا ہوا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سر جھٹکا لیکن اسی وقت اس کا سر کسی نے دیوار کے ساتھ دے مارا اور اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

یکدم اسے لگا جیسے وہ مرنے والا ہو۔ اس کی سانس رک رہی تھی مگر اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اسی وقت اس کی ناک منہ پر پڑا بوجھ ہٹ گیا اور اس کا دماغ جاگنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولیں لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے ماحول سمجھ آنا شروع ہوا۔ یہ اسی کی رہائش گاہ کا کمرہ تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکا۔ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی کرسی لکڑی کے بیڈ سے گدے ہٹا کر اس پر رکھی گئی تھی۔ سائیڈ والی کرسی پر ایک نقاب پوش بیٹھا ہوا تھا۔ نقاب پوش کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اس بندھے ہوئے شخص پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''کون ہو تم؟'' اس شخص نے نقاب پوش کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ نقاب پوش نے جواب نہیں دیا اور بجلی کے بورڈ کی طرف بڑھا۔ بورڈ میں ایک تار کا پلگ لگا ہوا تھا۔ پلگ جدید قسم کا تھا۔ اس پر کچھ ریڈنگز آ رہی تھیں۔ نقاب پوش نے ریڈنگ کو دیکھ کر سر ہلایا اور وائر پکڑ کر بندھے ہوئے شخص کے پاس آیا۔ اس شخص نے وائر کی طرف الجھے ہوئے انداز میں دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہوش اڑ گئے۔ وائر کا جو سرا نقاب پوش اس کی طرف بڑھا رہا تھا وہ ننگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نقاب پوش اسے کرنٹ لگانے والا ہے۔

''کک..... کک..... کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا لیکن نقاب پوش نہیں بولا۔ اس نے وہ ننگی تار بندھے ہوئے شخص کے ہاتھ پر رکھ دی اور اس شخص کی زوردار چیخ نکلی۔ اسے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ نقاب پوش نے تار تیزی سے واپس کھینچ لی۔

''پلیز کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے رونے والے انداز میں کہا اور نقاب پوش نے پھر تار اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اسے دوبارہ جھٹکے لگنا شروع ہوگئے۔ نقاب پوش نے تار دوبار پیچھے کر لی۔

''نام.....؟'' نقاب پوش نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''فضل۔'' اس نے فوری جواب دیا۔

''راجو بھی نام ہے؟'' نقاب پوش نے کہا۔

''میرا ہی نام ہے۔ میں کئی نام استعمال کرتا ہوں۔'' فضل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' جیسے پوچھ رہا ہو کہ تمہیں کیسے پتہ چلا۔

''میں تمہیں راجو کے روپ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم گولڈن کلب کے اسسٹنٹ منیجر ہو۔ جبکہ فضل

والے زوپ میں تم ابھی میرے سامنے موجود ہو۔'' نقاب پوش نے اس کی حیرت دیکھ کر جواب دیا۔

''کس کے لئے کام کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جو بھی مجھے ہائر کر لے۔ تم مجھ تک کیسے پہنچے؟'' فضل نے کہا۔

''جب تم اسپتال مریضوں کی عیادت کر رہے تھے تب سے میں تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔'' نقاب پوش نے طنزیہ انداز میں لفظ عیادت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کام کس نے تمہارے ذمہ لگایا تھا؟'' نقاب پوش نے پوچھا۔

''وہ.....'' فضل اٹک گیا اور نقاب پوش نے تیزی سے تار اس کے ہاتھ پر رکھی اور فضل چیخنا شروع ہو گیا۔ اس نے تار ہٹالی۔

''ایوب..... ایوب بختاور۔'' فضل نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''کون ایوب بختاور؟'' نقاب پوش نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ کسی ایوب بختاور کو جانتا ہی نہ ہو۔

''وہ اس علاقے کی ایک بااثر سیاسی شخصیت ہے۔ سب جانتے ہیں اُسے۔'' فضل نے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' نقاب پوش نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''قسم سے سچ بول رہا ہوں۔ تم میرے فون سے اس کا نمبر لے کر کنفرم کر سکتے ہو۔'' فضل نے منت بھرے انداز میں کہا۔ اسے بجلی کے جھٹکوں کا خیال ہی سیدھا کرنے کے لئے کافی تھا۔

''ایوب بختاور کا ایڈریس بتاؤ۔'' نقاب پوش نے پوچھا۔ فضل نے جلدی سے پتہ بتا دیا۔

''تم کبھی وہاں گئے ہو؟'' نقاب پوش نے پوچھا۔

''ہاں ایک بار گیا تھا۔'' فضل نے جواب دیا۔

''تو وہاں کا پورا نقشہ سمجھاؤ جتنا بھی تمہیں یاد ہے اور سکیورٹی کے انتظامات بھی۔'' نقاب پوش نے کہا اور فضل نے جلدی جلدی سب بتانا شروع کر دیا۔

''تمہارا تیسرا نام گولڈ مین ہے؟'' نقاب پوش نے کہا تو فضل کو یوں جھٹکا لگا جیسے اس نے بجلی کی ننگی تار پکڑ لی ہو۔

''تمہیں یہ کس نے بتایا.....؟'' اس کے منہ سے نکلا تو نقاب پوش تار پکڑ کر آگے بڑھا۔

''سس..... سوری..... میں گولڈ مین نہیں ہوں' بس گولڈ مین کے طور پر سامنے رہتا ہوں۔'' فضل نے جواب دیا۔

''اصل گولڈ مین کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔ مجھے فون پر احکامات اور بڑی بڑی رقمیں مل جاتی ہیں اور کرنا بھی کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں نے کبھی تلاش بھی نہیں کیا۔'' فضل نے کہا۔

''ایوب بختاور کا کوئی گروپ۔ یا کسی خاص گروپ سے تعلق ہے؟'' نقاب پوش نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

''اس کا مجھے علم نہیں۔ اس کا رکا کلیو مجھے ایوب نے ہی دیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کار میں کون تھے۔'' فضل نے کہا۔

''کار میں اس ملک کے تحفظ کی خاطر جان قربان کرنے والے سوار تھے جنہیں تم نے چند سکوں کے لیے اس حال میں پہنچا دیا۔ تمہاری سزا موت ہے۔'' نقاب پوش نے کہا اور اس سے پہلے کہ فضل کچھ کہتا' نقاب پوش نے سائلنسر لگا پسٹل نکالا اور گولی سیدھی فضل کی پیشانی میں لگی۔ اسے چیخنے کا موقع بھی نہ ملا۔ نقاب پوش نے اسے کھولا اور فضل کی باڈی سمیت ہر چیز کو ترتیب سے رکھا۔ فضل کے موبائل سے چند ایک لوگوں کے نمبرز کاپی کیے اور اس کا سیل آف کر دیا۔ دوسرے فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر اس نے سائیڈ پر رکھا۔ فضل کے جسم پر چادر ڈالی دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ بجلی کا وائر اور پلگ اتار کر بیڈ کے نیچے پھینک دیا اور کمرے کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔

❖❖❖❖

گولڈن کلب کا منیجر اکبر' آسمان سے لٹکے ایسے تارے کی مانند تھا جو اگر گرتا تو نیچے موجود ابلے ہوئے کھجوری تیل میں ہی گرتا۔ اسے اس حالت میں لٹکے ہوئے چار سے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ جب وہ نوجوان (ساحر) اس سے معلومات لے رہا تھا تو اسے کسی کی کال آئی' کال پر وہ کسی پانڈے سے بات کر کے وہاں سے نکل گیا اور اکبر اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ نوجوان کے

سر میں شاید جوئیں بھی نہیں تھیں ورنہ اکبر کی چیخ و پکار سے اس کے کان پر جوں تو ضرور رینگنی چاہئے تھی۔ پانڈے نام سے اکبر یہ تو جانتا تھا کہ وہ کسی کا نام بگاڑ کر پکار رہا تھا مگر کسے؟ وہ ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا تھا جس کا نام پانڈے سے ملتا جلتا ہو۔

اس نے نوجوان کو واقعی سچ بتایا تھا کہ راجو ہی گولڈ مین ہے کیونکہ وہ درحقیقت راجو کے ہی ماتحت کام کرتا تھا۔ اس عجیب سے سیٹ اپ کی وجہ سے وہ شروع شروع میں خود الجھن کا شکار رہا تھا کہ راجو کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ بظاہر اکبر کا اسسٹنٹ بن کر کام کرے' لیکن جب اکبر کو مراعات اور بڑی بڑی رقمیں ملیں تو اس نے ایسی الجھنوں کو کفرانِ نعمت مانتے ہوئے جھٹک دیا اور اپنی ڈیوٹی کو ایمانداری سے نبھانے لگا۔ مگر جب سے وہ ان تین لوگوں سے ٹکرایا تھا' اس کے ذہن میں دوبارہ انہی الجھنوں نے سر اٹھایا تھا کہ آخر راجو ایسا کون سا کام کرتا ہے جس کے لئے وہ گولڈ مین بنا پھرتا ہے اور اکبر اس سے لاعلم ہے۔ اکبر ان تینوں نوجوانوں کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ راجو اور اکبر کے بس سے باہر ہیں اور ضرور کسی حکومتی ادارے سے منسلک ہیں۔ مگر یہ بھی تو محض قیاس آرائی ہی تھی' اکبر کے پاس اس کا کوئی ثبوت تو نہ تھا۔

چھت سے لٹکے ہوئے وہ انہی سوچوں میں گم تھا کیونکہ اور کچھ تو وہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اب اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے اس کے بازو اس کے جسم سے الگ ہو جائیں گے اور وہ نیچے گر پڑے گا۔ جس قسم کی لٹکی ہوئی تکلیف سے وہ جڑا ہوا تھا' شاید وہ خود دل میں یہی دعا کر رہا تھا کہ اس کے بازو کٹیں اور وہ اس عذاب سے تو نکلے۔

دروازے کے اس پار قدموں کی آہٹ پا کر اس کی آنکھوں میں چمک ابھری کہ چلو کوئی تو آیا اور پھر دروازے سے ظاہر ہونے والے شخص کو دیکھ کر وہ الجھ سا گیا۔ دروازے سے ایک نقاب پوش اندر داخل ہوا' اس کا لباس اور نقاب سیاہ تھے اور ہاتھوں پر سیاہ دستانے موجود تھے۔ اس نے دروازے میں رک کر ایک نظر اکبر پر ڈالی اور پھر پرسکون چال چلتے ہوئے خالی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''مجھے اس عذاب میں کیوں لٹکا رکھا ہے۔ یا گولی مار دو یا جانے دو۔'' اکبر نے سخت لہجے میں کہا جیسے سامنے موجود نقاب پوش اس کا ملازم ہو۔

''گولی بھی مار دوں گا۔ راجو کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' نقاب پوش نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کسی مکھی کو مار کر آیا ہو' اس کی بات سن کر اکبر کو جھٹکا لگا اور آنکھیں پھیلنے لگیں۔

''ابھی تو میں نے تمہیں بتایا ہے اس کے بارے میں۔ تم اتنی جلدی اس تک کیسے پہنچ گئے؟'' اکبر نے اٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے.....؟ میری تو تم سے پہلی ملاقات ہے۔'' نقاب پوش نے حیرت بھرے لہجے میں کہا تو اکبر نے پہلی بار اس کے لہجے پر غور کیا۔ یہ واقعی اور آواز تھی۔

''تم نے کسی اور کو بتایا ہوگا۔'' وہ دوبارہ بولا۔

''کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟'' اکبر نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

''ایوب بختاور۔ تمہارا چچازاد بھائی۔ اس کے بارے میں مکمل معلومات۔ اس کے دوست' دشمن' کاروباری حصہ داران وغیرہ وغیرہ۔'' نقاب پوش نے کہا تو اکبر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو؟'' اکبر نے پوچھا۔

''ایک انکم سپورٹ پروگرام میں اس کے نام کی بہت بڑی رقم اور ساتھ ہی کئی تولے سونا نکلا ہے۔ وہ پہنچانا ہے۔'' نقاب پوش نے جواب دیا۔

''یہ تم الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ۔'' اکبر نے کہا اور نقاب پوش کا ہاتھ جیب میں گیا' جب ہاتھ برآمد ہوا تو اس کے ساتھ ایک ریوالور چپکا ہوا تھا' اسے سے پہلے کہ اکبر کو سمجھ آتی۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اکبر کے منہ سے چیخ اچھل کر نکلی۔ گولی اس کی ران میں گھسی تھی۔ نقاب پوش نے پسٹل دوبارہ بلند کیا۔

''رر.....رکو۔ بتاتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے اُس کے لیے معذور ہونے کی۔'' اکبر نے چیختے ہوئے کہا تو نقاب پوش نے پسٹل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

''پپ.....پانی۔'' اکبر نے خشک ہونٹوں پر زبان

اہم اطلاع

نئے اُفق گروپ آف پبلیکیشنز سے شائع ہونے والے ڈائجسٹ

آنچل نئے اُفق حجاب

کا ویب ایڈریس اور تمام کالموں کے ای میل تبدیل ہوگئے ہیں۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔
پرانے ویب اور ای میل ایڈریس پر مسلسل صارفین کی شکایات موصول ہوتی رہیں۔ جس کی بنا پر ادارے نے اپنے ای میل ایڈریس تبدیل کرلیے ہیں۔ تمام سلسلوں کے الگ الگ ایڈریس اس پوسٹ میں لگائے جارہے ہیں۔ براہ کرم اسے اپنے پاس محفوظ کرلیجیے اور اپنے دوست احباب کو بھی اطلاع کردیں۔

نیا ویب ایڈریس یہ ہے

www.naeyufaq.com

نئے افق، آنچل اور حجاب سے متعلق معلومات کے لئے یہ ای میل ہے	info@naeyufaq.com
نئے افق کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے	editorufaq@naeyufaq.com
آنچل کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے	editor_aa@naeyufaq.com
حجاب کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے	editorhijab@naeyufaq.com
بیاض دل اور نیرنگ خیال	biazdill@naeyufaq.com
دوست کے پیغام	dkp@naeyufaq.com
یادگار لمحے	yaadgar@naeyufaq.com
آئینہ کے لئے تبصرہ	aayna@naeyufaq.com
بزم سخن (شاعری)	bazsuk@naeyufaq.com
عالم میں انتخاب شاعری منتخب شعرا کا کلام	alam@naeyufaq.com
شوخئ تحریر (اقتباسات)	shukhi@naeyufaq.com
حجاب میں تبصرے کے لئے حسن خیال	husan@naeyufaq.com

اپنی کہانیاں یونی کوڈ، ورڈز اور ان پیج پر ٹائپ کرکے ای میل کردیں۔ اردو رسم الخط میں موصول ہونے والی کہانیاں قابل قبول ہوں گی۔
نئے افق، آنچل اور حجاب کے کالم میں شریک ہونے کے لئے درست ای میل کا انتخاب کیجیے۔ بصورت دیگر ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
تمام احباب سے گزارش ہے کہ ای میل ایڈریس محفوظ کرلیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کو کسی قسم کی دشواری نہ اٹھانا پڑے۔

پھیرتے ہوئے کہا۔
''تمہیں میرے ساتھ پانی کی کوئی ٹینکی لٹکی ہوئی نظر آرہی ہے؟'' نقاب پوش نے غرا کر پسٹل بلند کرتے ہوئے کہا اور اکبر کی زبان فل اسپیڈ پر ایوب بختاور کی فائل پڑھنا شروع ہوگئی۔
''اس کے کون کون سے کاروبار ہیں؟'' نقاب پوش نے پوچھا۔
''فلور ملز' امپورٹ ایکسپورٹ اور تعلیمی ادارے۔ اس کے علاوہ ویلفیئر فاؤنڈیشنز بھی ہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔
''اس کی رہائش گاہ کے بارے میں بتاؤ۔ مطلب سکیورٹی وغیرہ۔'' نقاب پوش نے کہا تو اکبر نے رہائش گاہ کے بارے میں ایسے تفصیلی نقشہ کھینچا جیسے اس نے خود عمارت بنائی ہو۔
''اس کے زیادہ قریبی کون سے دوست' پارٹنرز ہیں؟''
''اس شہر میں تو تین چار ہیں۔ دوسرے شہروں کے لوگ بھی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''ان میں سے اس شہر میں رہنے والوں میں کوئی پولیس افسر یا بڑا ڈاکٹر ہے؟''
''ہاں ایک پولیس افسر ہے۔ سپرینٹنڈنٹ ہے۔ گلریز نام ہے اس کا۔ وہ اس کے بہت قریب ہے۔ ایک ڈاکٹر بھی ہے' اس کا نام برکت منیر ہے۔''
''گلریز صاحب کہاں پائے جاتے ہیں؟''
''اس کے عام تین ہی ٹھکانے ہیں۔ گھر' تھانہ اور سٹی ہوٹل کا بار روم۔''
''او کے۔'' نقاب پوش نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اکبر کا چہرہ پھر سے بجھ گیا کہ اب پھر لٹکے رہنا پڑے گا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہ نقاب پوش لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ اس نے کرسی آگے کھینچ کر اکبر کے قریب کی اور اس پر کھڑے ہو کر بوتل اکبر کے منہ سے لگائی۔ اکبر غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ جلد ہی بوتل خالی ہوئی وہ نقاب پوش کرسی سے اترا۔
''تم نے جو حال ان دو لوگوں کو کیا تھا جلا کر' میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہیں اس ٹب میں ہی ڈال دوں۔ مگر میں اس درجے پر جانا فی الوقت پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا تمہیں آسان موت مبارک ہو۔'' نقاب پوش نے کہا اور اکبر کے بولنے سے پہلے ہی جیب سے پسٹل نکالا اور ساتھ ہی گولی چلادی۔ گولی اکبر کی پیشانی میں گھسی اور اکبر کو چیخنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔
''سوری۔ مگر تمہیں چھوڑنے کا مطلب سب کچھ خطرے میں ڈالنا تھا۔'' اس نے اکبر کے مردہ جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔
''اب مریضوں کو بھی شفٹ کرنا پڑے گا۔ پھر گلریز کا کام بھی تمام کرنا ہے۔'' اس نے کمرے سے نکل کر ہنکارہ بھرا۔

❖❖❖❖

شام ہونے کے باوجود سٹی پولیس اسٹیشن کی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ مسائل میں گھرے لوگ اس طرح سے وہاں طواف کر رہے تھے جیسے چیلیں زمین پر موجود اپنے کھانے کے گرد آسمان پر منڈلاتی ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مردار بھی وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا اور چیلوں کی تعداد۔ مگر یہاں نہ تو مسائل کا مردار ختم ہوتا تھا اور نہ ہی انصاف فراہم کرنے والی چیلیں۔ اکثر چیلیں اسی آس پر اونگھ رہی تھیں کہ مردار ان کی میز پر چپکے سے پہنچ جائے۔ جن مدعیوں یا مجرموں کے پاس یہ سہولت وافر تھی وہ مردار کو پیکٹ میں سجا کر' چھپا کر لاتے اور روشن چہروں کے ساتھ حاضری دیتے۔ کبھی کبھی حلال کو بھی مجبوراً' اس مردار کے نعم البدل کے طور پر پیش کیا جاتا جبکہ اکثر لوگ تو بس چکر ہی کاٹتے رہ جاتے۔
آفس طرز کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخص کسی فائل پر جھکا تھا۔ وہ شکل سے تو کاروباری قسم کا نظر آتا تھا مگر تھا وہ پولیس میں۔ توند کا سائز فون کی ماحولیاتی آلودگی کی طرح بڑھ رہا تھا۔
گھنٹی سن کر اس نے چونک کر ایک طرف موجود فون کی طرف دیکھا۔ سرخ رنگ کے سیٹ کا ریسیور اٹھایا اور چند لمحے چپ ہی رہا۔
''یس۔ سپرینٹنڈنٹ گلریز۔'' اس نے جیسے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''سر گولڈن کلب کے راجو کو ختم کر دیا گیا ہے۔''

دوسری طرف سے مودبانہ آواز میں اطلاع دی گئی اور گلریز کے پاؤں میں جیسے کسی نے بم چلا دیا ہو۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' وہ حلق کے بل چیخا۔

''سر وہ فضل کے نام سے ایک قاتل کے روپ میں اپنی خفیہ رہائش گاہ پر موجود تھا' وہیں اسے مارا گیا ہے۔ ابتدائی رپورٹ کے مطابق اسے بجلی کے جھٹکے بھی دیئے گئے ہیں۔'' جواب ملا۔

''اوکے۔ مجھے صورت حال سے آگاہ رکھنا۔'' اس نے کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔

وہ بے چینی سے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ریوالونگ چیئر پر جھول رہا تھا۔ کافی دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد اس نے سیاہ رنگ کے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملایا۔

''یس۔'' دوسری طرف سے سرد آواز سنائی دی۔

''راجو کے بارے میں خبر ملی؟'' گلریز نے پوچھا۔

''ہاں۔ اکبر بھی غائب ہے' خدشہ تو یہی ہے کہ وہ بھی راجو کے ساتھ ہی کام آ گیا ہوگا۔'' دوسری طرف سے اس بار قدرے پریشان سی آواز میں جواب ملا۔

''یہ وہی سلسلہ تو نہیں؟'' گلریز نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہی سلسلہ ہے۔'' جواب ملا۔

''وہ دونوں جی ایم کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟'' گلریز نے پوچھا۔

''نہیں۔ یہ بات میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں۔'' غصیلی آواز میں جواب ملا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' گلریز نے جیسے سوچ میں ڈوب کر کہا۔

''تھوڑی دیر تک رابطہ کرتا ہوں ایک کلائنٹ کی کال آ رہی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور کال بند ہو گئی۔

اس نے ریسیور رکھا اور دوبارہ کرسی پر جھولنے لگا۔ اس نے فائل بند کر کے ایک طرف کھسکا دی تھی' شاید اس کا دھیان کہیں اور اٹک چکا تھا۔ اسی طرح بیس منٹ گزرنے کے بعد سیاہ فون کی گھنٹی بجی' اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

''یس.....''

''میرے پاس ایک سراغ ہے۔ اسپتال میں تین لوگ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ایڈمٹ ہیں۔ ان میں سے دو کے جسم جھلسے ہوئے ہیں۔ وہ اس کیس میں ملوث ہیں۔'' دوسری طرف سے تیز لہجے میں جواب ملا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' گلریز نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے دوپہر کا پتہ ہے۔ راجو کو میں نے ہی انہیں مارنے کا کام سونپا تھا مگر وہ خود۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو پھر..... کسی کو ہائر کروں؟'' گلریز نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس چکر کو روکنے کے لیے ہمیں خود فیلڈ میں آنا پڑے گا۔ تم پولیس میں ہونے کا فائدہ اٹھاؤ۔ خود ہی آگے آ جاؤ۔ انہیں مجرم پوز کر کے جیل میں ڈالو۔ وہیں ان کا خاتمہ کر دیں گے۔'' جواب ملا۔

''گڈ۔ بہت اچھا آئیڈیا ہے لیکن ان کی حالت کے پیش نظر انہیں گرفتار کیسے کیا جائے؟'' گلریز نے پوچھا۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ مزاحمت نہیں ہو گی۔ ایمبولینس اور ڈاکٹرز کے ساتھ جاؤ۔ کسی بھی قانونی شق کو ہتھیار بنا کر اٹھا لاؤ۔ بعد میں کہہ دیں گے کہ اپنی حالت کی وجہ سے وہ خود ہی مر گئے۔ اگر انکوائری ہوئی بھی تو سنبھال لیں گے۔'' جواب ملا تو گلریز کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اوکے اس لحاظ سے تو رسک سارا میرا ہی ہے تو میرا حصہ بھی بڑھنا چاہئے۔'' گلریز نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ بعد میں ڈسکس کر لیں گے۔ تم پہلے یہ کام کرو۔''

''بعد میں تو تم جی ایم بن کر بات کرتے ہو' ابھی فائنل کرو۔'' گلریز نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اوکے بیس کی بجائے پچیس فیصد تمہارا حصہ۔'' جی ایم نے فوری ہامی بھری۔

''گڈ۔ یہ ہوئی نہ بات۔ اب میں دیکھوں گا کہ وہ کیسے بچتے ہیں۔'' گلریز نے چہک کر کہا۔

''انہیں ہلکا مت لینا۔ وہ اب تک اپنے رستے میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔'' جی ایم نے اس بار غرا کر کہا اور کال بند ہو گئی۔

''اب تک ان کا سامنا مجھ سے جو نہیں ہوا۔'' وہ

بڑبڑایا اور انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

''یس سر۔'' دوسری طرف سے مودبانہ آواز آئی۔

''سکندرے کو کہو کہ ریڈ پارٹی۔ تین ایمبولینس سمیت تین ڈاکٹرز کو ساتھ لے لے آج پولیس اسپتال سے مجرم پکڑے گی۔'' اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر اسٹینڈ سے اپنی کیپ اٹھا کر سر پر رکھی اور ہاتھ میں محکمانہ ڈنڈا پکڑے وہ باہر نکلا۔

❖❖❖❖

انڈے کے چھلکے جیسے چمکدار سر والا لمبا تڑنگا' سانولی رنگت والا ادھیڑ عمر شخص منہ میں ماچس کی تیلی گھماتے ہوئے سڑک پار اسپتال پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں زمین پر جیسے وائبریٹ کر رہا تھا جو اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ شدت سے کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا' ایک کلائی میں بھاری کڑا تھا۔ انگلیاں رنگ برنگی انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے منہ سے تیلی تھوک کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پڑیا نکال کر اس پر سے ریپر اتار کر چھوٹا سا پیکٹ سیدھا کیا۔ پھر انگلیوں کی مدد سے چٹکی بنا کر پیکٹ کو احترام سے بند کر کے جیب میں رکھا۔ ایک ہاتھ سے اپنا منہ اس طرح کھولا جیسے بھکاری اپنی جھولی پھیلاتا ہے اور اس چٹکی کو بڑی نفاست سے دانتوں کی دیوار کے ساتھ سیٹ کر کے ہاتھ جھاڑے۔ اب اس کی پاؤں کی وائبریشن میں کمی آگئی تھی جیسے بے چینی کو ذرا سکون میسر ہوا ہو۔ اسی وقت تین بڑی وینیں اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ گاڑیوں کو اندر گھستے دیکھ کر وہ بھی تیزی سے سڑک کراس کرتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں داخل ہوا۔ گاڑیاں ایک طرف رکیں اور ان میں سے کچھ نرسیں اور ڈاکٹر نکلے۔ گاڑیوں سے نکلتے ہی وہ اسپتال کی عمارت میں داخل ہوئے۔ وہ شخص بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی تھا' ان سب کا رخ اسپتال کے ایمرجنسی کے کمرے کی طرف تھا۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر سب رک گئے۔ ایک ڈاکٹر جو شاید ان کا لیڈر تھا' وہ اندر داخل ہوا۔ کافی دیر بعد وہ کمرے سے نکلا تو اس کے چہرے پر اطمینان پھیلا ہوا تھا' اس نے گنجے شخص کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر مخصوص اشارہ کیا تو گنجا مسکراتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

جلد ہی وہ سڑک پار کر کے ایک طرف کھڑی کار میں بیٹھا۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے جیب سے فون نکالا اور نمبر ملا کر نظریں دوبارہ اسپتال پر جما دیں۔

''یس پانڈے.....؟''

''باس..... کام ہو گیا۔ تینوں زخمیوں کو نقلی ٹرانسفر آرڈرز دکھا کر ڈسچارج کروا لیا گیا ہے۔'' اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''یس باس۔ کوئی مسئلہ نہیں بنا۔ میں نے ڈاکٹرز کی پوری ٹیم بھیجی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی کو بھی شک نہیں پڑے گا۔ یہاں سے ہم سیدھے پوائنٹ ون پر جائیں گے۔ جہاں پر ڈاکٹرز کی ٹیم اور گاڑیاں بدل دی جائیں گی۔ اس طرح کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ زخمی دراصل گئے کدھر۔ پھر جو آپ حکم کریں۔'' اس نے دوسری طرف سے جواب سن کر تفصیل بتائی۔

''یس باس۔ میں اور میرے لوگ پھیل کر گاڑیوں کو اپنی نگرانی میں لے کے جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''او کے باس۔ بائی۔'' اس نے دوسری طرف سے بات سننے کے بعد کہا اور فون سائیڈ سیٹ پر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گاڑی اسٹیرنگ پر طبلہ بجانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہی تینوں گاڑیاں جب اسپتال سے نکلیں تو اس نے بھی گاڑی اسٹارٹ کی اور دھیمی رفتار سے ایک طرف کو چل پڑا۔

وہ جانتا تھا کہ سامنے جانے والی تینوں گاڑیاں' بہت سی دوسری گاڑیوں کے حصار میں جا رہی تھیں۔ وہ اس کام میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ناکامی کی صورت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا تھا۔

❖❖❖❖

اندھیرے کی چادر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی اور سیاہی گہری بھی ہو رہی تھی۔ عمارت انرجی سیورز کی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ لوگوں کی گہما گہمی جیسے چھٹ رہی تھی۔ عمارت کے برآمدے اور لان میں پڑے بنچ حسرت سے آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ عمارت کے احاطے سے باہر کا شور شرابا جوں کا توں تھا جیسے دن کا اجالا ہی ہو۔

پولیس اسٹیشن کے احاطے میں ایک ٹیکسی ڈرائیور بے

چینی سے گھوم رہا تھا۔ چہرے سے وہ کوئی شریف انسان ہی نظر آتا تھا جس کے جسم پر خاکی رنگ کی ڈرائیوروں والی وردی تھی۔ وردی پر چار سے چھ جیبیں تھیں جن میں کرنسی وغیرہ بھری ہوئی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی وردی اور بھاری جیبیں مضحکہ خیز منظر پیش کر رہی تھیں' اس کے باوجود اسے دیکھ کر ہنسی نہیں آتی تھی کیونکہ پریشانی کے پنجے جیسے اس کے چہرے میں گڑنے کے لئے ہی بنائے گئے تھے۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچتا اور سامنے تھوڑے سے فاصلے پر موجود دفتر کو دیکھتا۔

اس نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اس کی ملاقات کسی بڑے افسر سے کرادی جائے مگر ظاہری بات تھی کہ اس کی اوقات ہی اس بات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کسی افسر سے مل سکتا۔ وہ بھی کسی حسین لڑکی کی طرح یہ نخرہ پالے بیٹھا تھا کہ وہ اپنا مسئلہ اگر کسی کو بتائے گا تو وہ بڑے افسر کو ہی۔ اس کے علاوہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ نتیجے کے طور پر ہر سپاہی' جس کے کندھے پر چار سے ستارے نہیں لٹکائے گئے تھے' وہ تھا تو افسر ہی' انہوں نے بھی ساس کی طرح منہ پھیر لیا۔

کچھ دیر کے بعد دفتر سے جب صاحب اپنی درمیانے سائز کی توند پر پینٹ کو کھینچ کر اوپر ہی روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نمودار ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی طرف دوڑ لگائی۔ اسے دوڑتا دیکھ کر پیچھے موجود سپاہیوں نے اوئے۔ اوئے۔ اوئے رک' کی آوازیں نکالیں' صاحب نے آوازوں کی طرف دھیان دیا تو سامنے ایک شخص دوڑتا نظر آیا۔ صاحب کی پہلی نظر ہی اس کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ پر پڑی جو کرسی کے نوٹوں اور سکوں کے وزن سے جھول رہی تھی۔ صاحب کے چہرے کی تو رنگت ہی بدل۔ صاحب نے پینٹ کو چھوڑا۔ یوٹرن مارا اور تیزی سے واپس دوڑ لگائی۔ یکدم پوری قوت سے دوڑنے کی وجہ سے افسر صاحب کی جوتی پھسلی' ایک ٹانگ پیچھے کو نکلی۔ ایسے نظر آیا جیسے اس کی پچھلی ٹانگ ضرورت سے زیادہ ہی لمبی ہو گئی ہو۔ پل بھر کے لئے وہ ایسا ڈولا جیسے کسی بھاری بھرکم ٹرک کا اگلا ٹائر پنکچر ہو گیا ہو اور ڈرائیور کا اس پر کنٹرول ختم ہو گیا ہو۔ صاحب لہرا کر منہ کے بل زمین پر گرا۔ اس کے سر پر موجود کیپ اڑتی ہوئی برآمدہ سے باہر کچی جگہ پر جا گری۔

کسی ناخلف نے شاید فرش کو زیادہ ہی ایمانداری سے رگڑ کر صاف کر دیا تھا جس وجہ سے یہ منظر تھانے کی تاریخ کے پنوں کی زینت بننے والا تھا۔

''صاحب..... صاحب۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے سر پر پہنچتے ہوئے افسر کے بازو تھام کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''دور ہٹو۔ اوئے پکڑو اس دہشت گرد کو۔'' افسر چیخا۔ وہ کھڑا ہو چکا تھا۔ غنیمت تھا کہ گرتے ہوئے اس نے ہاتھ سامنے کر لیے جس سے اس کی دندان مبارک فرش چومنے سے بچ گئے۔ اتنی دیر میں دو تین سپاہی بھی وہاں پہنچ چکے تھے جبکہ ایک جوان دوڑ کر اس کی کیپ اٹھا لایا تھا۔

دوسری طرف' دہشت گرد کا لفظ سن کر ٹیکسی ڈرائیور جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا' چند لمحوں کے لیے تو جیسے وہ سن ہو گیا۔ دہشت گردی کا لیبل اس ملک میں قتل سے بھی بڑا جرم تھا جس میں سے نکل پانا ناممکن تھا۔

''سرکار..... مم۔ میں تو ڈرائیور ہوں۔ آپ کو ایک خبر دینی تھی۔ مجھے آپ سے ملنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔'' اس نے سہمے ہوئے اور ہلکے سے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔

''الو..... بلکہ الو کے پٹھے۔ اس طرح بھاگتے ہیں..... کونسی قیامت آ گئی تھی؟'' افسر صاحب اس کا جواب سن کر اسی پر چڑھ دوڑے۔

''صاحب۔ میری کیا مجال۔ آپ تو مائی باپ ہیں۔'' ڈرائیور نے غیر محسوس انداز میں صاحب کی گالی اسے ہی لوٹا دی۔

''اوئے سکندرے۔ اندر ڈال اسے الو کی دم کو اور آج یہ فرش کس نے چمکا کر دیا ہے؟'' وہ سکندرے پر بھڑکا۔

''صاحب میں آج ہی فیضو کو منع کرتا ہوں کہ فرش کو اتنا مت رگڑا کر۔ معاف کر دیجئے اس نکمے کو۔'' سکندرے نے مسکین صورت بناتے ہوئے خوشامدی زبان استعمال کی۔

''بالکل۔ اگر فرش ایسا ہوا تو اس کی تنخواہ کاٹ لینا اور

یہ کیا؟ ابھی تک یہ الو کا چرغا یہیں کھڑا ہے۔ اندر ڈالو اسے۔'' افسر نے سر ہلا کر کہا اور پھر وہ ڈرائیور کو دیکھ کر چونک گیا۔

''صاحب۔ غریب آدمی ہوں۔ مجھے تو لگا کہ آپ کے کام کی خبر ہے۔ بہت بڑی خبر ہے۔'' ڈرائیور جیسے رو دیا۔

''کیا خبر ہے؟'' افسر کو شاید اس کی شکل پر ترس آ گیا۔

''آپ کا نام گلریز ہی ہے نا؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''تم میرا نام پوچھنے آئے ہو؟'' افسر کا پارہ پھر سے چڑھا۔

''وہ..... وہ میری ٹیکسی میں ایک شخص بیٹھا تھا کچھ دیر پہلے' وہ آپ کو مارنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔'' اس نے فوری جواب دیا۔

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟'' سکندر نے سخت لہجے میں کہا۔

جبکہ افسر' جو کہ گلریز تھا چونک اٹھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ صاحب کے خلاف بھی بات کر رہا تھا اور کسی جی ایف۔ یا پتہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بارے میں بھی۔''

''وہ اتنا بچہ تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی باتیں سن رہے ہو۔ وہ یہ سب پلان بناتا رہا۔'' گلریز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''صاحب۔ وہ انگلش میں بات کر رہا تھا۔ میں تھوڑی بہت انگلش جانتا ہوں۔ وہ اسی لیے کھل کر بات کر رہا تھا۔ اسے لگا ہو گا کہ مجھے انگلش نہیں آتی اور یہ بات ہے بھی سچ۔ ٹیکسی ڈرائیور کے لیے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ انگلش تو یونیورسٹی پاس لوگوں کے حلق سے نہ اترتی ہے نہ نکلتی ہے۔'' ڈرائیور بولنے پر آیا تو نان اسٹاپ بولتا ہی گیا۔ وہ بہت ہی باتونی واقع ہوا تھا۔

''اندر آؤ۔'' گلریز نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ اسے ڈرائیور میں دلچسپی پیدا ہوئی مگر اس بار وہ بہت محتاط انداز سے چل رہا تھا جیسے دوبارہ گرنے کا خدشہ ہو۔

''اب بولو۔ پوری تفصیل بتاؤ۔ اگر میرا وقت برباد کیا تو کھال کھینچ لوں گا۔'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے غرایا۔

''مم۔ میں ساری بات بتاتا ہوں۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا شخص تھا جس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ اسمارٹ سا تھا۔ وہ رائل ٹاؤن سے ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے کسی کو کال کی۔ وہ کسی کیس کے بارے میں بات کر رہا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ کچھ زخمیوں کو خطرہ ہے اس لیے انہیں اسپتال سے ایک رہائش گاہ پر شفٹ کر دیا ہے اور اب وہیں جا رہا ہے۔ وہ جس سے بات کر رہا تھا اسے حکم دے رہا تھا کہ جیسے ہی آپ گھر کے لیے روانہ ہوں وہ اسے خبر دے تاکہ آپ کا کام تمام کر دیا جائے۔ پھر جہاں پر وہ اترا' اس کوٹھی کے سامنے میں نے بڑی بڑی وینیں دیکھیں' جن میں شاید وہ زخمی ہی ہوں گے۔'' ڈرائیور نے تیز لہجے میں رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

رپورٹ سن کر گلریز کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ قدرت اس پر مہربان تھی جو یوں اچانک وہ ڈرائیور امرِ رحمت کی طرح وہاں پہنچا۔ گلریز سمجھ گیا کہ وہ کن زخمیوں کے بارے میں بات کر رہا ہے' وہ یقیناً اس کے شکار کی ہی بات کر رہا تھا جن پر ریڈ کرنے کے لئے وہ نکل رہا تھا۔

''وہ تم کسی جی۔ ایف کی بھی بات کر رہے تھے۔ وہ کیا تھا؟'' گلریز کو اچانک یاد آیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

''اس نے ایسا ہی کوئی انگلش میں کہا تھا کہ اس سے بھی جلد ہی ملاقات کرنی ہے۔ مگر کیونکہ میرے ذہن میں آپ کے قتل کی بات اٹکی ہوئی تھی تو میں نے زیادہ غور نہیں کیا اس بات پر۔'' اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' گلریز نے اچانک پوچھا۔

''آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ تو شہر کی مشہور ہستی ہیں صاحب۔'' اس نے سادگی سے کہا تو گلریز کا سینہ فخر سے چوڑا اور پیٹ کٹورا ہوا۔

''تم نے کب اس شخص کو ڈراپ کیا تھا؟'' گلریز نے پوچھا۔

''اسے حاجی ٹاؤن میں ڈراپ کرتے ہی میں یہاں چلا آیا۔''

''تم میرے ساتھ وہاں تک چلو جہاں اس شخص کو اتارا تھا۔'' گلریز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مم..... مگر..... مم.....'' ڈرائیور کا چہرہ یکدم خوف

سے پیلا ہو گیا۔

''تمہیں کس بات کا ڈر؟ پولیس تمہارے ساتھ ہے۔'' گلریز نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''یہی تو ڈر ہے۔'' ڈرائیور بڑبڑایا۔ گلریز تب تک دروازے تک پہنچ چکا تھا ورنہ اگر وہ یہ جملہ سن لیتا تو ڈرائیور کا جو حال ہوتا وہ ناقابل بیان تھا۔

برآمدے سے نکل کر سپاہی تیزی سے گاڑیوں میں سوار ہوتے گئے۔ سب نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں، سروں پر ہیلمٹ تھے اور ہاتھوں میں لوڈڈ اسلحہ۔ سب کے بیٹھنے کے بعد گلریز نے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا تو وہ اپنی ٹیکسی میں اور گلریز اپنی مخصوص گاڑی میں بیٹھا۔ پھر قافلہ حرکت میں آ گیا۔

ریڈ پارٹی کا ٹارگٹ بدل گیا۔ پہلے تو وہ اسپتال کی طرف جا رہے تھے اب سب اس ٹیکسی کا پیچھا کر رہے تھے۔

جاجی ٹاؤن روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ رنگ برنگے آنچل کھلی سڑکوں کی فٹ پاتھوں پر مٹرگشت میں مصروف تھے جبکہ بڑے بڑے جنرل اسٹورز گاہکوں کو لبھانے کے سازو سامان سے لیس بانہیں پھیلائے سڑکوں کے کناروں پر جمے ہوئے تھے۔ موسم خوشگوار ہونے کے باعث روڈ پر لوگوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی جس سے ٹکری کے مواقع بھی بڑھ گئے تھے۔

ماحول کی خوشگواریت میں اچانک پولیس کی گاڑیاں تیزی سے بڑھتی ہوئی سامنے آئیں تو اڑتے ہوئے آنچل سمٹ کر چہرے پر اور ہونٹوں میں دب گئے۔ اس ٹاؤن میں پولیس کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی مگر آج۔ جس رفتار اور تعداد میں گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس سے ہر کوئی پریشان سا ہو گیا تھا۔

گاڑیاں اڑتی ہوئی ٹاؤن کی کھلی سڑکوں سے گزرتی ہوئیں ایک چوک میں رکیں۔ گاڑیوں کے آگے ایک ٹیکسی تھی جس کے رکنے پر سب گاڑیاں رکی تھیں۔ ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور باہر نکل کر اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کی طرف دوڑا۔

''وہ سامنے والی کوٹھی ہے۔'' اس نے تھوڑے فاصلے پر موجود اندھیرے میں نہائی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ تو خالی لگتی ہے۔'' گلریز نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''ہو سکتا ہے مجرم بتیاں بند کر کے ڈاج دے رہے ہوں۔'' گلریز کے ڈرائیور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا تو ٹیکسی ڈرائیور نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا جیسے اپنی جان کی خلاصی پر اس کا شکر گزار ہو۔

''اوکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ سکندرے کو کہو کہ خاموشی سے اس کوٹھی کو گھیرے میں لے لے اور چاروں اطراف سے فورس اندر داخل ہو۔ کوئی شور شرابہ نہیں۔ اندر جو کوئی بھی ہو اسے چپکے سے چھاپ لو۔'' گلریز نے کہا تو اس کا ڈرائیور اتر کر پچھلی گاڑی کی طرف چل دیا۔

''صاحب۔ برا نہ منائیں تو آپ باہر ہی رک جائیں۔ بڑے افسروں کا چھوٹے سپاہیوں کے ساتھ یوں جانا آپ کو نہیں جچتا۔'' ڈرائیور نے خوشامدی لہجے میں کہا اس سے پہلے کہ گلریز کوئی جواب دیتا۔ اس کا ڈرائیور واپس آ گیا۔

''آپ بھی ساتھ چلیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں گیٹ کے سامنے موجود رہوں گا۔ اندر سے اگر کوئی بھاگے یا کوئی گڑبڑ ہوئی تو سنبھال لوں گا۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

ٹیکسی اس دفعہ بھی آگے آگے ہی تھی۔ اس بار تمام گاڑیوں کی رفتار بہت دھیمی اور تمام روشنیاں بند تھیں۔ مطلوبہ رہائش گاہ کے گیٹ کے سامنے گلریز کی گاڑی رکی۔ باقی گاڑیاں ادھر ادھر روک کر تمام اہلکار کوٹھی کے گرد پھیل گئے۔ ٹیکسی کا ڈرائیور گلریز کی گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''کک..... کیا میں اندر بیٹھ جاؤں۔ مم۔ مجھے باہر ڈر لگ رہا ہے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو گلریز کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔ مجرموں کا پیچھا کریں گے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا

''مم..... مجرم..... پپ۔ پیچھا۔'' ڈرائیور مارے خوف کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''مذاق کر رہا تھا۔ آجاؤ اندر۔'' گلریز نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو ڈرائیور کے بھاری سانس کی آواز ابھری۔ وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا جیسے اس کے پیچھے خطرناک مجرم ہوں۔

''تمہاری وجہ سے آج شہر کے سب سے خطرناک مجرم پکڑے جائیں گے۔ تمہیں اس کا خصوصی انعام ملے گا۔'' گلریز نے کہا۔

''شش..... شکریہ صاحب۔ یہ تو میرا فرض تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

یہ تھی بھی حقیقت۔ اگر وہ ڈرائیور گلریز سے نہ ٹکراتا تو وہ تو اسپتال ریڈ مارتا اور مجرم وہاں سے نکل چکے ہوتے۔ پھر ان مجرموں کو ڈھونڈنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ڈرائیور اس تک پہنچ گیا۔ اس آسان شکار کے بدلے وہ پہلے ہی گولڈ مین سے مستقل اضافی حصہ منوا چکا تھا' وہ تصور میں اس اضافی حصے کی رقم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

موبائل فون کی وائبریشن سن کر وہ چونک گیا۔ ڈیش بورڈ پر پڑا فون اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

''شکار پورا ہوا۔'' وہ بڑبڑایا اور کال اٹینڈ کی۔

''ہاں سکندرے۔''

''صاحب۔ یہ عمارت تو خالی ہے۔ لگتا ہے صدیوں سے یہاں کوئی نہیں آیا۔'' سکندرے کی مایوسی بھری آواز سنائی دی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ خالی کیسے ہو سکتی ہے؟ تم نے ٹھیک سے چیک کیا؟'' وہ حلق کے بل چیخا' اس کی آواز سن کر ساتھ بیٹھا ڈرائیور سہم اور سمٹ گیا۔

''جی صاحب۔ سب چیک کیا ہے۔'' سکندرے کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''صاحب۔ آج کل بڑی کوٹھیوں کے نیچے تہ خانے بھی ہوتے ہیں۔'' ساتھ بیٹھے ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے لقمہ دیا۔

''تہ خانے چیک کیے؟'' گلریز نے فوری پوچھا۔

''تہ خانے۔ نہیں باس۔ اس پوائنٹ پر تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔'' سکندرے کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

''گھامڑ کہیں کے۔ پہلے تہ خانے تلاش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تہ خانے میں ہوں۔'' اس نے غرا کر کہا اور کال بند کر دی۔

''جاہل ہیں سب کے سب۔ نکمے۔ خون جلا دیا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''تم بہت ذہین ہو۔'' اس نے یکلخت ساتھ بیٹھے ڈرائیور سے کہا۔

''ہونا پڑتا ہے۔ جب ملک کو جراثیموں سے پاک کرنا ہو تو صرف صابن سے کام نہیں چلتا۔'' ڈرائیور کی بدلی ہوئی آواز سنائی دی تو گلریز چونک کر اس کی طرف مڑا۔

''کیا کہا تم نے؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' وہ غرایا۔ اس کی غراہٹ سن کر گلریز جیسے برف کی طرف جم سا گیا۔ اچانک اس کا سر کسی نے تھاما اور پوری قوت سے سامنے ڈیش بورڈ پر دے مارا۔ اس کے منہ سے چیخ ابھری۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا سر پھٹ گیا ہو۔ پھر دوبارہ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

ڈرائیور گاڑی سے اترا اور سرعت کے ساتھ تمام گاڑیوں کے ایک ایک ٹائر کی ہوا نکال کر وہ واپس گلریز والی گاڑی میں پہنچا۔

''آج کے دن ہم پولیس والے۔'' اس کی مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر دھیمی رفتار سے آگے بڑھ گئی۔

❖❖❖❖

شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس کی چار دیواری حاشیے کی طرح نظر آ رہی تھی کیونکہ گہرے اندھیرے میں عمارت کے خدوخال واضح نہ تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا' اس ماحول میں کبھی کبھار مینڈک کے ٹرانے کی آواز سنائی دیتی اور کبھی کبھی کسی کتے کی زبان پھسل جاتی اور ماحول میں اس کی آواز دور تک گونجتی جاتی۔ کتے کو جب کہیں سے بھی بیک کال نہ ملتی تو مارے شرمندگی کے زبان دانتوں میں دبائے اور کان لپیٹے منہ کو پنجوں کے حصار میں قید کر کے پھر سے آنکھیں موند لیتا۔ اچانک کتا دوبارہ چونکا اور کھڑا ہو کر ایک طرف کو دیکھنے لگا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور دم پنڈولم بن گئی۔ اچانک ہی اس نے گلا پھاڑنا شروع کر

دیا۔ اسے گیت گاتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اندھیرے کا حصہ بنے ایک ہیولہ ہچکولے کھاتا آگے بڑھتا آرہا تھا۔ کتا لگاتار اس کے استقبال میں ہانپتا رہا اور گاڑی بھی آگے بڑھتی رہی۔ کتے نے گاڑی کی آمد کو بہت پہلے ہی بھانپ لیا تھا جس وجہ سے وہ چوکس ہو گیا تھا۔ گاڑی کے انجن کی آواز آنا شروع ہو چکی تھی' اس کی اندرونی و بیرونی روشنیاں بند تھیں۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی فارم ہاؤس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس میں سے ایک سایہ اترا جس نے پچھلی سیٹ سے کسی کو کھینچ کر کندھے پر ڈالا اور بھونکتے ہوئے کتے کو نظر انداز کرتے ہوئے فارم ہاؤس کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کتا اگر بندھا نہ ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے دروازے تک نہ پہنچ پاتا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور فارم ہاؤس کے دروازے میں نصب مخصوص جگہ میں ڈال کر گھمائی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور اندر سے دروازے کو لاک لگا کر وہ عمارت کی طرف بڑھا۔ عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہونے کے باوجود وہ یوں چل رہا تھا جیسے دن کے اجالے میں بندہ پراعتمادی سے چلتا ہے۔ بڑے سے صحن کو عبور کر کے وہ برآمدے میں پہنچا اور ایک بار پھر سے تالا کھولنے کی کارروائی کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سائیڈ دیوار پر ہاتھ مار کر بٹن دبایا اور کمرے میں روشنی پھیلتی گئی۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو گلریز کو اٹھا لایا تھا۔ اس نے گلریز کو زمین پر پٹخا اور دروازے کو باہر سے بند کر کے برآمدے میں ایک طرف بڑھتا گیا۔ ایک اور کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے لاک کھولا اور کمرے میں داخل ہو کر بلب آن کر کے ایک طرف موجود الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کے پٹ کھول کر وہ الماری میں داخل ہوا اور الماری کی پچھلی طرف ایک ہاتھ اور پاؤں لکڑی پر رکھ کر دبانے لگا جیسے کوئی شخص دیوار کو دھکا لگا کر کھسکانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اچانک کھٹک کی آواز سنائی دی اور وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ الماری کا پچھلا حصہ ایک طرف ہٹتا گیا۔ سامنے روشنی میں سیڑھیاں نیچے جاتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ تیزی سے نیچے اترتا گیا۔ نیچے اتر کر وہ تہ خانے میں موجود کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے تین اسٹریچر لگے ہوئے تھے جن پر تین نوجوان جیسے پرسکون نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ دو کے جسم جھلسے ہوئے تھے مگر اس وقت وہ بھی سکون سے لیٹے ہوئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور انہیں دیکھ کر اور سائیڈ ٹیبل پر موجود ان کی حالت سے متعلق چارٹس پڑھ کر مسکراتا ہوا واپس مڑ گیا۔

واپس گلریز والے کمرے میں پہنچ کر اس نے گلریز کو اٹھا کر کرسی پر باندھا اور پھر اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ جلد ہی گلریز جھٹکا کھا کر چیخا تو وہ ڈرائیور واپس مڑ کر خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں گلریز پر ہی جمی ہوئی تھیں جو آنکھیں کھول چکا تھا اور بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس کی آنکھوں میں شعور کی چمک ابھری۔

''تم! دھوکے باز' میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔

ڈرائیور اسے خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا جیسے اس نے گلریز کی آواز سنی ہی نہ ہو۔

''تم کچھ بکتے کیوں نہیں.....؟'' کچھ منٹ کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ چیخا۔ اسے وہ خاموشی کھائے جا رہی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ کس طرح سے تم سے معلومات نکلواؤں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم ہو کون؟'' وہ غرایا۔

''میرا نام فازر ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔'' ڈرائیور نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کون سی معلومات؟'' گلریز نے چونک کر پوچھا۔

''وہی معلومات۔ جن کو بچانے کے لئے تم اسپتال پر ریڈ کرنے والے تھے۔''

''اسپتال پر ریڈ؟ تمہارا دماغ تو نہیں خراب؟ اسپتال پر کون ریڈ کرتا ہے؟'' گلریز نے حیرت سے کہا۔ مگر اس کے دماغ میں چیونٹیاں رینگنا شروع ہو گئی تھیں کہ سامنے موجود شخص کو ریڈ کے بارے میں کیسے پتہ چلا۔ کیا کوئی اندر کا آدمی مجرموں سے ملا ہوا ہے؟ اس کے ذہن میں یہ خیال کھلبلی مچانے لگا۔

''جب میں تھانے پہنچا تو سپاہی اسپتال پر ریڈ والے موضوع پر بات کر رہے تھے' میرے لیے بات کی تہ تک

پہنچنا آسان تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کن کے پیچھے جا رہے ہو۔ میں تمہاری جلد باز طبیعت سے بھی واقف تھا۔ لہٰذا میں نے ایک پلان بنایا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری ایک ہی کمزوری ہے۔ اسپتال میں موجود تینوں زخمی۔ سب سے پہلے میں نے انہیں اٹھوایا۔ انہیں پہلی بار واقعی حاجی ٹاؤن کی اسی کوٹھی میں لے جایا گیا جہاں سے تمہیں بے ہوش کر کے میں لایا ہوں۔ اسی عمارت کے عقبی دروازے سے میرے آدمی زخمیوں کو نئی گاڑیوں اور نئے لوگوں کی نگرانی میں لے کر نکل گئے۔ اب وہ زخمی تمہاری پہنچ سے بہت دور کہیں موجود ہیں۔ انہیں کوٹھی سے شفٹ کرتے ہوئے ہی میرے ذہن میں پلان آیا۔ میں جانتا تھا کہ اکبر اور راجو کے بارے میں تمہیں اطلاع مل جائے گی اور تم ہمیں ڈھونڈنے کے چکر میں ہو گے' سو میں ایک ڈرامہ رچا کر تمہارے پاس پہنچ گیا اور تمہیں جھانسا دے کر ایک ویران جگہ پر فورس سمیت لے گیا۔ وہاں میں نے تمہارے ذہن میں باہر ہی رکنے کا کیڑا ڈال دیا اور فورس کو تم سے الگ کیا۔ پھر تمہیں بے ہوش کیا۔ اس کے بعد تمہاری فورس کی گاڑیوں کی ہوا نکالی اور تمہاری ہوا نکالنے کے لئے شہر سے باہر لے آیا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

گلریز حیرت بھرے انداز میں یہ طلسمی کہانی سن رہا تھا' کہانی سنتے ہوئے اس کا منہ کھلا ہوا تھا جس میں سے زبان ایسے باہر کی طرف لٹکی ہوئی تھی جیسے ٹرک کی باڈی کھول کر اس سے تختہ لگا کر سامان اتارا جا رہا ہو۔ اسے فازر سے انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا جو اسے بہت ہی آسانی سے اغواء کرا لایا تھا۔

''تت..... تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ ہکلایا۔

''گولڈ مین کے اسٹور رومز کے بارے میں معلومات۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو گلریز کے چہرے پر ایک رنگ سے گزر گیا۔

''کک..... کون گولڈ مین.....؟''

''کک..... نہیں..... گولڈ مین..... میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں۔ مجھے بس ان اسٹور رومز کا پتہ چاہیے جہاں وہ اغواء شدہ افراد کو رکھتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے گولڈ مین کا ہی نہیں پتہ تو پھر اسٹورز۔'' گلریز نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا تو فازر یکدم اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی بھری چمک دیکھ کر گلریز کے اوسان خطا ہو گئے۔

''کک..... کیا کرنے لگے ہو؟'' وہ ہکلایا۔

''ایک تو یہ کک..... کک..... تم بہت کرتے ہو۔ تم مرغی کی نسل سے ہو؟'' اس نے کہا' اتنی دیر میں وہ گلریز کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں پتہ۔'' وہ منمنایا۔

''اوکے پچھلا ریکارڈ چیک کرتے ہیں ہارڈ ڈرائیو میں۔'' فازر نے کہا اور اس نے گلریز کی انگلی پکڑ کر تیزی سے الٹی سمت موڑ دی۔ کڑک کی آواز کے ساتھ ہی گلریز کا دہانہ کھلا اور چیخیں سیلاب کی طرح رواں ہوئیں۔

''اِس پاس ورڈ سے ہی تمہارا دماغ اَن لاک ہو گا۔'' فازر نے کہا اور دوسری انگلی بھی موڑ دی۔ وہ بڑے سکون سے ایک انگلی توڑتا اور پھر دوسری انگلی کو یوں ٹٹولتا جیسے کوئی پھل کو خریدنے سے پہلے ٹٹولتا ہے' اور پھر ایک جھٹکے سے وہ انگلی بھی توڑ کر اگلی انگلی۔

''رکو.....'' گلریز تیسری انگلی ٹوٹنے پر چیخا۔

''تم تو پیچھے کی طرف جا رہے ہو۔'' اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا جیسے استاد کو بچے کی نالائقی پر افسوس ہو رہا ہو۔

''اس کے اسٹور چار شہروں میں ہیں۔ اب وہ کسی نئی جگہ بھی اسٹور کھولنا چاہتا ہے۔'' گلریز نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''پوری تفصیل بتاؤ۔'' اس نے کہا اور ساتھ ہی چوتھی انگلی بھی توڑ دی۔

''الو کے پٹھے۔ جب سب کچھ بتا رہا ہوں تو کیوں انگلی توڑ دی۔ بد دماغ سانڈ۔'' وہ درد بھری چیخیں سن کر لمحے بھر کے لئے بھڑکا اور فازر نے دوسری ہاتھ کی پہلی انگلی پکڑ کر موڑی۔

''رکو..... پلیز..... سوری..... میں بتاتا ہوں۔'' اس کی اکڑ یکدم موم ہوئی۔

''شروع ہو جاؤ۔'' فازر نے اس بار غرا کر کہا تو گلریز ہانپتے ہوئے واقعی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

''ملک سے باہر کون کون سے خریدار ہیں تم لوگوں کے رابطے میں؟ کس کس ملک میں تم یہ دھندہ پھیلائے ہوئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

جواب میں گلریز ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''تم اس کام میں کیسے پڑے؟'' فازر نے پوچھا۔

''محکمے کی تنخواہ پر گزارا نہیں ہوتا۔ میری مجبوری تھی' پھر میں اس کام سے نکل ہی نہیں پایا۔'' گلریز نے جواب دیا۔

''اللہ کی طرف سے تمہارے لیے یہ نوکری چنی گئی کہ تم لوگوں کے محافظ بنو' تم تو دلال بن گئے۔ عملی ناشکرے۔ محکمے کی تنخواہ پر گزارا نہیں ہو پا رہا تھا تو محکمے کو بدنام کرنے میں لگ گئے۔ ملک کو الگ بدنام کیا ہوا ہے۔ تمہاری بھی بیٹی' بہن' بیوی ہو گی۔ یہ سب کرتے ہوئے تمہیں خدائی خوف تک محسوس نہیں ہوا؟ پیسے کے لالچ نے تمہارے دل و دماغ کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ آج تمہارا زنگ میں اتار دوں گا۔'' فازر غرایا تو گلریز کا جسم کانپ اٹھا۔ وہ اس کی سرد مہری تو دیکھ ہی چکا تھا۔

''مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔'' وہ منتوں پر اتر آیا۔

''معافی مانگنے کے لیے تمہاری ساری عمر پڑی ہے۔ مانگ لینا سب سے معافی۔'' فازر نے کہا تو گلریز کے چہرے پر رونق ابھری کہ زندگی بچ گئی۔

اسی وقت بجلی کی سی تیزی سے فازر کا ہاتھ گھوما اور گلریز کی فلک شگاف چیخ نے کمرے کو جیسے ہلا دیا ہو۔ ایک انگلی بزے کی طرح اکڑی ہوئی۔ اس کی آنکھ میں گھسی۔ اس سے پہلے کہ اس کی چیخ پایہ تکمیل کو پہنچتی۔ دوسری چیخ بلند وئی اور ساتھ ہی دوسری آنکھ کا ڈھیلا باہر آ گرا۔

❖❖❖❖

شہر کے وسط میں ایک بہت بڑی کوٹھی کے انتہائی بصورت اور امپورٹڈ سامان سے مزین ڈرائنگ روم ے صوفہ پر ایک ادھیڑ عمر سنجیدہ انسان بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا جس پر کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔ وہ شکل سے بہت مجرب لگتا تھا' اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ یہ ب بختاور تھا' شہر کی ایک اہم سیاسی شخصیت۔ ایوب اور وراثتی سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ مخیر رات میں سے بھی ایک تھا۔ لوگوں میں اس کا بہت نام اور وہ بھی تن' من' دھن سے علاقے کی خدمت کرتا تھا۔ اس وقت وہ بہت انہماک سے ٹی وی دیکھ رہا تھا جب اس کے سیکرٹری نے کان میں آ کر کچھ کہا تو وہ چونک گیا پھر وہ اٹھا اور ٹی وی بند کر کے گھر کی عمارت سے الگ بنے ڈرائنگ روم میں پہنچا جہاں پر ملاقاتی حضرات سے وہ ان کے مسائل سننے کے لئے ملا کرتا تھا۔

اس وقت ڈرائنگ روم میں شہر کا پولیس انسپکٹر' شہر کے سب سے بڑے پولیس افسر اور ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ موجود تھا ایوب بختاور کے داخل ہوتے ہی پولیس افسران نے اٹھ کر مصافحہ کیا لیکن وہ نوجوان' جو کہ موبائل پر کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ موبائل گیم ہی کھیلتا رہا۔ ایوب نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔

''جی ظفر صاحب فرمائیے؟'' اس نے بڑے افسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''سوری سر۔ آپ کو یوں اچانک تکلیف دی۔'' ظفر معذرت بھرے انداز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہم تو ہیں ہی عوام کی خدمت کے لئے۔'' ایوب نے مسکرایا۔

''ہمیں ایک جانور کی کھال اتروانی ہے۔'' اس نوجوان نے یکدم کہا۔

''کیا..... کیا کہا تم نے.....؟'' ایوب چونکا' جبکہ ظفر اور انسپکٹر بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ابھی بھی گیم ہی کھیل رہا تھا۔

''آپ کا کھالیں اتارنے کا کاروبار ہے۔ تو ہم بھی اسی سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔'' اس نے دھیان موبائل پر ہی رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو۔ ظفر صاحب یہ کسے اٹھا لائے ہیں آپ ساتھ؟'' ایوب نے غصے سے ظفر سے کہا۔

''اٹھا کر وہ نہیں لائے۔ گاڑی میں آئے ہیں ہم' کچھ تو عقل سے کام لیا کریں۔ لگتا ہے کھالوں کی بدبو سر چڑھ گئی ہے۔'' نوجوان نے بے پرواہی سے کہا۔

''میں۔ میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔'' ایوب نے عقل استعمال کرنے کی بات پر بپھرتے ہوئے کہا۔

''واہ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ایک کھال کے کتنے

پیسے وصول کرتے ہیں آپ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ظفر صاحب اسے لے جائیں ورنہ یہ مرے گا میرے ہاتھوں۔ اسے معلوم نہیں یہ کس سے مخاطب ہے۔'' ایوب نے چیختے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ میں لوگوں کی عزتوں اور زندگیوں سے کھیلنے والے کیڑے سے مخاطب ہوں جو ملک اور قوم کی بھلائی کی قسم کھا کر انہی کو نوچتے ہیں۔ مردار خور.....'' نوجوان یکدم غرایا۔

''یہ..... یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ آپ بیٹھے سن رہے ہیں؟'' ایوب نے ظفر سے مخاطب ہوئے کہا۔

''ہمیں آپ کے گھر کی تلاشی لینی ہے۔ آپ جیسے باعزت شخص سے میں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن ہمارے پاس آرڈر ہیں۔'' ظفر نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم میرے گھر کی تلاشی لو گے۔'' ایوب ظفر پر چڑھ دوڑا۔

''آپ جیسے شخص کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے۔ پلیز تعاون کریں۔ آرڈرز بہت سخت اور ہائی کمان سے ہیں۔ انکار کر کے آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔'' ظفر نے کہا۔

''تم جیسے دو ٹکے کے لوگ میرے گھر کی تلاشی لیں گے۔ میں تمہیں اسی گھر میں گاڑ دوں گا۔'' ایوب نے چیخ کر کہا اور ساتھ ہی اس نے اشارہ کیا۔

ظفر کے ساتھ بیٹھا انسپکٹر یکلخت اچھل کر کھڑا ہوا اور ہولسٹر سے پسٹل نکالا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلا پاتا وہ نوجوان جو گیم میں مگن تھا' اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے دونوں پاؤں انسپکٹر کے سینے پر لگے' وہ اچھل کر پیچھے دیوار سے لگا اور پھر نیچے گرا۔ گرتے ہی وہ جھٹکا کھا کر ساکت ہو گیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ یہ سب چند لمحوں میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ ظفر نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا جو اس انہماک سے گیم کھیل رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ظفر نے اٹھ کر انسپکٹر کو چیک کرنا شروع کیا۔

''انسپکٹر مر چکا ہے۔'' نوجوان کی مطمئن آواز سنائی دی۔

ظفر نے چیک کیا تو وہ واقعی مر چکا تھا۔

''انسپکٹر اس کا پارٹنر تھا۔'' اس نوجوان نے ایوب کی طرف اشارہ کر کے کہا جو کہ ہونق بنا کبھی اس نوجوان کو دیکھتا اور کبھی مردہ انسپکٹر کو۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا؟'' ظفر نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اپنا لہجہ سنبھال کر رکھئے۔ پہلے اپنی ڈیوٹی پوری کریں پھر اس پر بات کریں گے۔'' اس نوجوان نے پہلی بار گیم سے نظریں ہٹا کر انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

ظفر تو اس بات پر آنکھیں چرانے لگا جبکہ ایوب سکتے میں آ گیا تھا۔ نوجوان نے جس لہجے میں پولیس افسر کو ڈانٹا تھا اور ظفر نے بھی گردن جھکا لی تھی وہ ایوب کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا۔ اسے اس نوجوان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ نہ تو وہ کوئی افسر لگتا تھا نہ ہی کوئی اہم شخصیت۔ لیکن وہ بار بار مختلف انداز اپنا رہا تھا۔ ایوب پر اس نوجوان کی ہیبت طاری ہو رہی تھی جس نے ایک سرکاری افسر کے سامنے اس کے جوہیر کو چند سیکنڈز میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور افسر کو جھاڑ کر خود گیم میں مگن تھا۔

''اس کھال اتارنے والے سوری ایوب کو ساتھ لیں۔ چلیں تلاشی لیتے ہیں۔ فورس کو اندر بلائیں۔'' اس نوجوان نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور ظفر نے سر ہلاتے ہوئے فون نکالا۔ وہ فورس کو اندر بلا رہا تھا۔

''اور تم..... تم نے کوئی فضول بات یا حرکت کی تو اگلا سانس نہیں لے پاؤ گے۔'' نوجوان نے ایوب کی طرف دیکھ کر غرا کر کہا۔ ایوب کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ظفر ایسے چپ چاپ نوجوان کی کمانڈ پر عمل کر رہا تھا جیسے ظفر ملازم اور وہ نوجوان افسر ہو۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ نوجوان کسی خاص رتبے کا حامل ہے۔

فورس کے اندر آنے پر وہ سب رہائشی عمارت میں پہنچے اور تلاشی لینا شروع ہو گئے۔ کافی دیر تفصیلی تلاشی لینے کے بعد سب نے آل کلیئر کی رپورٹ دی۔ اس رپورٹ پر ایوب کا چہرہ طنزیہ مسکراہٹ سے سجا ہوا تھا۔ ظفر کا چہرہ اتر چکا تھا۔ اسے اپنی نوکری خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ وہ نوجوان کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس

کے انداز میں پریشانی یا بے چینی نہ تھی۔ وہ بڑے سکون سے جیسے نظارے لے رہا تھا۔

''یہاں تو کچھ نہیں ہے۔'' ظفر نے اُس نوجوان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ ڈھونڈ کیا رہے ہو؟'' ایوب نے مسکرا کر پوچھا۔

''ظفر صاحب سب کچھ یہیں ہے۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔'' نوجوان نے ایوب کی بات نظر انداز کی اور مسکرا کر بولا۔ وہ مڑا اور سب آگے پیچھے چلتے پھر سے ملاقاتی عمارت میں پہنچے۔ اُس نوجوان نے وہاں خود تفصیلی جائزہ لیا۔

''یہاں بھی کچھ نہیں۔'' اُس نے مایوسی سے کہا۔

''اب تم لوگ نہیں بچو گے۔ تم لوگوں نے میری بے عزتی کی ہے۔'' ایوب نے غصیلے انداز میں کہا۔ نوجوان کی بات سن کر ایوب کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ سب کچھ یہاں ہی ہے۔'' نوجوان نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی اس نے اہلکاروں کو صوفے ہٹانے کا کہا۔

صوفے ہٹتے ہی وہ فرش کو ٹھوک بجا کر چیک کرنے لگا' تھوڑی ہی دیر میں اسے تہ خانے کا دروازہ مل چکا تھا۔

جب وہ نوجوان رہائشی عمارت کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا تو اتفاقاً اس کی نظر ملاقاتی عمارت پر ٹکی تو وہ شک کی بنا پر وہاں پہنچ گیا۔ ملاقاتی عمارت میں اُس کی نظر تلاشی کے دوران ایوب کے چہرے کے تاثرات کو چیک کرتی رہی تھی۔ ایوب کے تاثرات نے ہی تہ خانے کا بھانڈا پھوڑا تھا۔

دروازہ ملتے ہی ایوب نے وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی تو اس کی کنپٹی پر نوجوان کی ضرب لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس نے اہلکاروں سے اسے باندھنے کا کہا اور خود ظفر کے ساتھ نیچے تہ خانے میں اترنے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے موجود انتہائی جدید انداز کے تہ خانے میں پہنچے۔ تہ خانہ ایک مکمل رہائش گاہ کی طرح تھا۔ اُس نوجوان اور ظفر نے مل کر اس کی تفصیلی تلاشی لی اور وہاں سے ملنے والی مختلف چیزوں میں سے کام کی چیزیں انہوں نے ایک کپڑے میں گٹھڑی کی صورت میں باندھ لیں۔ تلاشی لیتے لیتے وہ نوجوان چونک گیا۔

''کیا ہوا؟'' ظفر نے پوچھا۔

''اس کے نیچے بھی تہ خانہ ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' ظفر نے حیرت سے کہا۔

''ممکن ہے۔ میں نے ایسے پائپ دیکھے ہیں جو زمین کے اندر ہوا لے جانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ویری اسٹرینج۔'' ظفر نے کہا۔

''آپ جتنی ہو سکے لیڈی پولیس آفیسرز کو بلائیں۔ میڈیا کو اس چھاپے کی خبر نہیں ملنی چاہئے۔ ایوب کے گھر والوں کو پیچھے کے کسی کمرے میں بند کر دیں سامنے کوئی شخص نہیں ہونا چاہئے اور مرد اہلکاروں کو کوٹھی کے باہر تعینات کر دیں۔'' نوجوان نے تیزی سے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔ یہ سب کس لئے؟'' ظفر نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ ہدایات پر عمل کریں پلیز۔ آپ کو سب کچھ بعد میں معلوم ہو جائے گا' یہ بہت سے لوگوں کی عزت کا سوال ہے۔'' اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''اوکے' میں انتظامات کرتا ہوں۔'' ظفر کو سمجھ تو نہ آئی لیکن وہ بات مان کر تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔ نوجوان نے تہ خانے کا دروازہ تلاش کرنا شروع کیا اور تھوڑی سی کوشش کی بعد اسے دروازہ مل گیا۔ دروازہ کچن میں موجود فریج کے پیچھے تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی ہدایات کے مطابق سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ لیڈی افسران پہنچ چکی تھیں۔ اُس نے تہ خانے کا دروازہ کھولا۔

وہ خود نجانے کیوں اندر نہیں جانا چاہتا تھا مگر پھر بھی مجبوراً وہ ایک لیڈی کو ساتھ لے کر نیچے اترتا گیا۔ لیڈی افسر ڈرتے ڈرتے اس کے ساتھ اندر گئی۔ اندر پہنچتے ہی نوجوان نے یکدم منہ پیچھے موڑ لیا۔ اس کا چہرہ پھرا گیا تھا۔ ساتھ گئی ہوئی لیڈی کا منہ کھل گیا اور وہ اپنی جگہ پر جم گئی۔

تہ خانہ کھلے دل سے انسانیت کی منافقت پر ہنس رہا تھا۔ وہ تہ خانہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ ابھی تک لڑکیاں زندہ درگور ہوتی ہیں۔ وہ ثابت کرتا تھا کہ نام' وقت اور مذہب

کی تبدیلی کے باوجود انسان کے اندر کا جانور۔ نفسِ انسانی آج بھی پوری قوت سے اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ وہ منظر اس راز کا مظہر تھا کہ بھیڑیئے انسان کی کھال پہن کر جنگلوں سے نکل کر نام نہاد مہذب دنیا کے باسی بن چکے ہیں اور وہ ماضی کے افسانوی کردار۔ ڈریکولا کی نسل میں سے ہیں۔ یہ شاید وہ جرثومے تھے جن کے بارے میں مغربی سائنسدان کہتے ہیں کہ وہ از خود وجود میں آگئے اور پھر خود ہی اپنی نسل بڑھاتے گئے۔ کیونکہ ماں کی کوکھ سے جنم لینے والوں سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر سامنے موجود حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جاسکتا تھا۔ ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے ہی اس درجے تک گر چکے تھے۔

نچلے تہ خانے میں لیڈی افسر کی آنکھوں کے سامنے برائے نام لباس میں قطار در قطار مخلوق دیواروں سے بندھی ہوئی تھی جن کے سامنے جانوروں کی طرح کھانے کے برتن پڑے تھے جو باس مار رہے تھے۔ دو دو دیواروں سے مخالف اصناف کی مخلوق موجود تھی جن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر بھی ان کے سر اٹھے نہیں تھے۔ ان میں سر اٹھانے کی جرات کی کمی تھی یا پھر کسی قسم کی حیاء کی زیادتی۔ جو سر اٹھانے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ یا پھر وہ مر چکے تھے۔

''ان کی تعداد گن کر باہر آجاؤ۔ مگر کسی سے ذکر مت کرنا کہ تم نے کیا منظر دیکھا ہے۔'' نوجوان نے کہا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہاں سے غائب ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لیڈی اوپر واپس آئی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے' وہ شاید بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''کتنی تعداد ہے' اندازے سے بتا دو۔'' اس نوجوان نے لیڈی سے پوچھا۔

''سو سے ڈیڑھ سو۔ مجھ میں ٹھیک طرح سے گننے کی سکت نہیں رہی تھی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے پانی کے جھرنے بہنے لگے۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر ایک طرف موجود صوفے پر جا کر ڈھیر ہوگئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ساتھ ہی اس کی ہچکیوں کی آواز کمرے میں ابھری۔ باقی سب اُن دونوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھے کہ وہ کس بارے میں بات کر رہے تھے۔ اور لیڈی افسر رو کیوں رہی ہے۔

''اس معاملے پر پردہ رکھنا آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ لیکن واپسی پر جب تک میں نہ کہوں آپ میں سے کوئی بھی اس عمارت سے باہر نہیں نکلے گا۔'' اُس نے سب کو اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ سب ایک ایک کر کے اندر اترتی گئیں۔

''تین بڑی بسیں منگوائیں شہر سے جلدی۔'' نوجوان نے ظفر سے کہا اور اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے سیل فون پر کال ملاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ظفر کو اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ فلاں جگہ ریڈ ڈالنی ہے' جب اس نے پوچھا کہ کس چیز کے لئے ریڈ ڈالنی ہے تو افسران اسے ٹال گئے۔ ان سب میں صرف وہ نوجوان ہی جانتا تھا کہ وہ ریڈ کیوں ڈال رہے ہیں۔

❖❖❖❖

اُن تینوں کو گزشتہ رات سے ہی ہوش آچکا تھا۔ جب سے انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ روشن گڑھ کی بجائے کیپٹل سٹی میں ہیں وہ بہت حیران ہوئے تھے۔ اب ان کی حالت کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ تینوں کو ایک ہی روم میں رکھا گیا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔

''لگتا ہے جب تک تم لوگ بیرونِ ملک علاج کا خرچہ نہیں کرواؤ گے' تم لوگ اٹھو گے نہیں۔'' اس نوجوان نے' جو کہ ساحر تھا' مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کدھر غائب تھے؟ کب سے بور ہو رہے تھے ہم لوگ۔'' دوسرے بیڈ پر موجود نوجوان نے' جو کہ جبران تھا' کہا۔

''بور ہو گیا ہے تو نلکا یا موٹر لگوا لو۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔'' جبران نے حیرت سے کہا۔

''جاہل ہی رہنا ساری عمر۔ زمین سے پانی نکالنے کے لیے جو ذریعہ اپناتے ہیں اُسے بور کہتے ہیں۔ بور بھی حسبِ ضرورت ہوتا ہے اور اس کے اوپر حسبِ ضرورت نلکا' پمپ یا زرعی زمینوں کیلئے ٹیوب ویل لگتے ہیں۔''

ساحر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں میک اپ میں تھے۔

''وہ والا بور نہیں۔ ہم دوسرے بور کی بات کر رہے ہیں۔'' کبیر ہنسا۔

''دوسرا بور۔ تو زمین میں پانی واپس ڈالنے کے لیے بھی بور استعمال ہوتا ہے؟'' ساحر نے چونکتے ہوئے پوچھا تو سب کی ہنسی نکل گئی۔

''ان کا تعارف تو کرادو یا دانت ہی دکھانے ہیں مجھے۔'' ساحر نے تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جنید صاحب ہیں۔ انہوں نے ہمارا ساتھ دینے کی کوشش۔ بلکہ جرات کی تھی۔'' کبیر نے جواب دیا۔

''ہاں۔ وہ تو نظر آرہا ہے۔ ساتھ کی برکت کی وجہ سے تو آرام دہ بستر پر موجود ہیں۔'' ساحر نے کہا تو سب مسکرا دیئے۔

''جنید صاحب' یہ پاشا ہے۔ ہمارا دوست بھی ہے اور بلاوجہ ہمارا لیڈر بھی بن جاتا ہے۔'' جبران نے جان بوجھ کر منہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ جنید کی وجہ سے ہی میک اپ میں تھے اور نام بھی ڈمی استعمال کر رہے تھے۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ ان دونوں صاحبان سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ ان کی باتوں سے تو لگا تھا کہ آپ بڑی عمر کے ہیں لیکن آپ تو مجھ سے بھی چھوٹے ہیں۔'' جنید نے کہا۔

''آپ مجھے چھوٹا کہہ کر اپنی عمر کم کرنے کی کوشش نہ کریں۔'' ساحر نے مسکرا کر کہا تو جنید اس کی بات سمجھ کر ہنس پڑا۔ اگر وہ ساحر کو بڑی عمر کا مانتا تو پھر اس کی عمر بھی زیادہ لگتی کیوں کہ وہ اُن تینوں سے عمر میں بڑا تھا۔

''مشن کا کیا بنا؟'' جبران نے پوچھا۔

''وہ بتاتا ہوں۔ ابھی تو تمہاری خیریت پوچھنے مہمان آنے والے ہیں۔'' ساحر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاپا نے آنا ہے؟'' کبیر نے پوچھا۔

''ہاں ان کے بنا یہ مشن پورا تو ہو جاتا لیکن وقت بہت لگتا۔'' ساحر نے کہا اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ بولتا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بارعب شخصیت اندر داخل ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں تیز چمک تھی اور شکل وصورت کیپٹن سے ملتی تھی۔ یہ ریٹائرڈ کرنل وجاہت خان تھے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ساحر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا جیتے رہو۔'' کرنل صاحب نے کہا۔

''کیسے ہو تم لوگ؟'' انہوں نے سب کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

''بالکل ٹھیک ہیں۔'' دونوں نے جواب دیا۔

''تم لوگ اچھا کام کر رہے تھے۔ مجھے بھی شامل کر لینا چاہئے تھا لیکن جو ہوا اچھا ہوا۔ مسٹر جنید۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور یہ جان کر کہ آپ نے لڑکوں کی بہت مدد کی۔'' کرنل صاحب نے پہلے اُن سے اور پھر جنید سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے سر کہ میں ملک کے کام آسکا اور یہ بھی کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔'' جنید نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ لوگوں کی حالت کے پیشِ نظر کیس کی تفصیلات کے لیے میٹنگ ہم نے اس روم میں رکھ لی ہے۔ میں چاہوں گا کہ جو چیزیں مجھے نہیں معلوم وہ آپ لوگ بتائیں۔ کیونکہ اس کیس میں جو لوگ سامنے آئے ہیں ان پر چارج لگانے کے لئے ہر ایک بات کا علم ہونا ضروری ہے ورنہ ساری محنت بیکار جائے گی۔'' کرنل صاحب نے باوقار انداز میں کہا۔

''یس انکل۔ میں روشن گڑھ ایک ذاتی کام سے گیا تھا رستے میں میں نے ایک بزرگ کرم داد کو پیدل چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ تھوڑا چل کر پھر انس لے کر پھر چلنے لگ جاتے تھے۔ میں نے رک کر انہیں گاڑی میں بٹھایا۔ ان کی زبانی ان کی بیٹی عصمت کی گمشدگی کی کہانی پتہ چلنے پر میں انہیں اپنے ساتھ پاشا (ساحر) سے ملانے لے آیا۔ انہوں نے اس کو اپنی آپ بیتی سنائی۔ اس کے بعد میں انہیں واپس چھوڑ آیا۔'' جبران نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''جس تھانے میں انہوں نے عصمت کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی میں نے وہاں سے تفتیش کا آغاز کیا۔ وہاں سے مایوس ہو کر میں واپس جا رہا تھا کہ مجھے ارشد کا خیال آیا۔ ارشد وہ پولیس افسر تھا جو کرم داد کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتا تھا۔ میں اس سے ملا۔ اس سے مجھے

معلوم ہوا کہ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی گمشدگی کے کیس تو گزشتہ کافی عرصے سے چل رہے تھے۔ مزید معلومات کے لئے ارشد سے ہی مجھے جنید کا پتہ چلا۔

جنید سے سب سے پہلے مجھے عصمت کی لوکیشن کا پتہ چلا تو میں نے وہ پاشا کو بتا دی۔ جنید کے بقول اسی شہر کی ہوٹل چین کا مالک' جو کہ ایک ماہر قاتل بھی تھا' اس کام میں ملوث تھا۔ یہ لوگ مختلف جگہوں سے نوجوانوں کو اغوا کرتے تھے۔ پھر لڑکیوں کو یہ بیرونِ ممالک گھٹیا کلبوں میں ویٹرس اور دیگر گھٹیا ترین کاروبار کے لئے بیچتے تھے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو بلیک میل کر کے انہیں گھٹیا فلموں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عام شکل وصورت والی لڑکیاں اور لڑکوں کو چنتے جو صحت کے اعتبار سے بہت فٹ ہوتے تھے۔ ان کو اعضاء بیچنے کے لئے اٹھا لیتے تھے۔ شروع میں انہوں نے اغواء کی وارداتیں کیں تو ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے نیا رستہ نکالا۔

مجرموں کو معلوم تھا کہ اس دور میں ہر کوئی اپنے بچوں کے لئے اچھے رشتے کی تلاش میں ہے۔ ان لوگوں نے کچھ ایسے مجرم ذہنیت لوگوں کو ہائر کیا جو اچھے ہونے کا ڈھونگ کر کے لڑکی یا لڑکے کا رشتہ لیتے۔ جہیز وغیرہ لینے سے انکار کر دیتے۔ جس پر غریب لوگ بہت خوش ہوتے اور بنا کوئی جانچ پڑتال کئے رشتے کے لئے ہاں کر دیتے۔ شادی ہونے کے بعد سسرال سے مختلف مسائل کا شکار ہو کر لڑکیاں اور لڑکے جھگڑا کر کے الگ ہو جاتے۔ اسی جھگڑے کی بنا پر متاثرہ لڑکی یا لڑکے کو اغوا کر لیا جاتا تھا۔ دیکھنے والوں کو یہی لگتا کہ یہ آپسی معاملہ ہے یا متاثرہ لڑکی یا لڑکا کسی اور کے ساتھ گھر سے بھاگ گیا ہے' پولیس بھی اسی رخ پر تفتیش کرتی رہتی اور ایک دن کیس بند ہو جاتا۔ جنید سے یہ سب سن کر میرا دماغ سُن ہو گیا۔ میں پریشان ذہن کے ساتھ گاڑی کی طرف چل پڑا اور اسی حالت کی وجہ سے مجھے گاڑی میں کسی کے ہونے کا شک نہیں پڑا اور میں جنید سے ملنے کے بعد اغواء ہو گیا۔ اغواء کرنے والوں کو ٹھکانے لگا کر میں سٹی ہوٹل کے جابر تک پہنچا'' کبیر نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ اس نے واجد کی قید سے نکلنے والی جدوجہد کا بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں سے نکل کر وہ کیسے جابر تک پہنچا اور جابر نے اسے کیسے ٹریپ کیا۔

''انکل! کرم داد سے تفصیل سننے کے بعد میرے خیال سے یہ اتنا بڑا کیس نہیں تھا کہ آپ کو اس میں شامل کرتے۔ میں نے سوچا کہ فارغ رہنے سے بہتر ہے کسی کے کام آ جائیں۔ اسی خیال سے ہم نے اس کیس پر کام شروع کیا۔ کبیر نے جنید سے جو لوکیشن ہمیں بتائی وہاں ایک عصمت ہی نہیں۔ پچاس اور اغوا شدہ لڑکیاں بازیاب ہوئیں۔ وہ منظر مجھے آج بھی نہیں بھولتا جیسے جانوروں کی طرح سب کو باندھا گیا تھا۔ لڑکیوں کے وجود پر لباس نام کی تو شے تھی کوئی نہیں۔ ان کے سامنے جو کھانا تھا وہ کئی دنوں کا باسی تھا اور ہر طرف بدبو ہی بدبو تھی۔ لڑکیوں کی حالت سے لگتا تھا جیسے کوئی بھکاری نشے میں ہو۔ ہال میں ہر طرف گھٹیا پوسٹرز بھی لگے ہوئے تھے۔ انہیں شاید نفسیاتی طور پر توڑنے کے لئے ایسی حالت میں رکھا گیا تھا۔ فیروز (جبران) اور میں ان کو لے کر شہر پہنچے اور ہم نے آپ سے رابطہ کیا اور ان لڑکیوں کو آپ کی ذمہ داری پر چھوڑ کر عصمت کو اس کے گھر چھوڑا۔ اس کے بعد ہم عصمت کے شوہر الیاس کے گھر گئے' وہاں تلاشی کے دوران مجھے انجکشن کی شیشی کا ایک ٹکڑا ملا۔ اس کا تجزیہ کرانے پر پتہ چلا کے اس میں ایسا زہر ہے جس کا شکار کچھ ہی دیر میں مر جاتا ہے اور مرنے کی وجہ بھی ہارٹ اٹیک ہی سامنے آتی ہے۔ میں الیاس کو کریدنا چاہتا تھا کیونکہ اس معاملے میں مجھے وہ مشکوک لگا' لیکن یہ رستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اسے جابر نے قتل کیا تھا۔ میں الیاس کے کام کرنے کی جگہ بھی گیا لیکن وہاں سے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ فیروز (جبران) اس وقت اکبر (کبیر) کو ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ مسلسل غائب تھا۔ فیروز پہلے ارشد صاحب اور پھر جنید تک پہنچ گیا۔ جنید سے ہمیں پتہ چلا کہ اکبر (کبیر) جابر کے پیچھے گیا ہے۔ اس کلیو پر کام کرتے ہوئے میں جابر کے ہوٹل جا پہنچا۔ اس نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی لیکن میں تیار تھا اس وجہ سے الٹا وہ میرے قابو میں آ گیا۔ اسی کی قید میں مجھے اکبر (کبیر) مل گیا جس کی زبانی مجھے ساری تفصیل معلوم ہوئی اور جابر پر تشدد کر کے ہم نے اس کہانی کا اہم کردار حاکم رانا کو پتہ چلا۔

حاکم رانا عزت نگر کا بہت اہم شخص تھا۔ ہم اسے اس کی رہائش گاہ سے اٹھا کر شکار گڑھ لے آئے اور اس سے مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی ایک مہرہ ہے۔ اصل لوگ تو روشن گڑھ میں ہی ہیں۔ اس کے کمپیوٹر میں موجود اور زبانی معلومات سے ایک نیا کردار گولڈ مین اور اس کے دو پارٹنرز سامنے آئے۔ گولڈ مین کو ڈھونڈنے کا ایک ہی رستہ تھا' گولڈن کلب۔ حاکم رانا کو مارنے کے بعد ہم دوبارہ روشن گڑھ پہنچے اکبر (کبیر) اور فیروز (جبران) گولڈن ہوٹل کے منیجر اکبر اور اس کے اسسٹنٹ راجو کی تلاش میں تھے۔'' ساحر نے تفصیل بتائی۔ اس نے جابر کے فارم ہاؤس پر حملے اور حاکم کو اس کی حویلی سے اٹھانے کی روداد سنائی۔

''شہر میں واپس پہنچنے پر ہم نے کوشش کی کہ منیجر اکبر یا راجو کی رہائش گاہ کو کسی طرح ٹریس کر لیں اور ڈائریکٹ سامنے بھی نہ آئیں لیکن یہ پوائنٹ کام نہیں آیا تو ہم براہِ راست اکبر تک پہنچ گئے۔ جس کی وجہ سے مرتے مرتے بچے۔ اکبر کے تشدد سے ہمارے جسم جھلسے ہوئے تھے اور تکلیف کے مارے چلنا بھی دشوار تھا مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ اکبر یا راجو کو ڈھونڈ کر ہی دم لیں گے اور ساحر سے پہلے یہ نیک کام کریں گے۔ اس وجہ سے ہم ساحر کی ایماء پر ملنے والی میڈیکل سروس سے آنکھیں بچا کر نکل گئے اور سیدھے جنید سے معلومات لینے پہنچے۔ وہاں سے ہمیں منیجر اکبر کی رہائش گاہ کی مکمل تفصیل پتہ چل گئی۔ جنید صاحب تو ہمیں لوکیشن تک لے جانے کے لئے ساتھ بیٹھے تھے۔ لیکن ہم رستے میں ہی حادثے کا شکار ہو گئے۔ اور یہاں آنکھ کھلی۔'' جبران نے کہا۔

''ان لوگوں کے نکلتے ہی میں بھی راجو اور منیجر اکبر کو ڈھونڈنے نکل گیا۔ پہلے میں تھانے میں ارشد سے ٹکرایا جس کے بارے میں اکبر نے بتایا ہے۔ اس سے کچھ معلومات لینے کے بعد میرے ذہن میں پلان آیا کہ میں گولڈن کلب کے کسی دشمن کو ساتھ ملا لوں تو کام آسان ہو جائے گا۔ اس لئے میں آصف مرزا سے ملا۔ وہیں سے مجھے خبر ملی کہ یہ دونوں گولڈن کلب کے اکبر کے ہتھے چڑھ گئے ہیں جو انہیں تلنے کا پلان بنا چکا ہے۔ میں وہاں پہنچا۔ تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ یہ دونوں جسم جھلسائے پڑے تھے۔ قریب تھا کہ اکبر انہیں مار ہی دیتا کہ میں وہاں پہنچا۔ میں نے انہیں ایک قابلِ اعتماد آدمی کے سپرد کیا جہاں سے یہ بعد میں فرار ہو کر ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئے۔ انہیں اٹھانے کے ساتھ ساتھ مجھے اکبر بھی مل گیا۔ اس سے گولڈ مین کے بارے میں یہی معلوم ہوا کہ راجو ہی گولڈ مین ہے۔ مگر یہ بھی ایک جھانسا تھا۔ اکبر سے تفتیش کے دوران مجھے ان دونوں کی زخمی حالت میں بھاگ نکلنے کی اطلاع ملی تو میں انہیں ڈھونڈنے دوڑ پڑا۔ تبھی رستے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جو راجو جیسی شکل کا مالک تھا۔ میں نے اس کا پیچھا کرنے کی بجائے اس کوٹھی کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا جس سے وہ نکل کر گیا تھا۔ اسی کوٹھی میں چیکنگ کرتے ہوئے آپ کی کال آئی کہ اکبر اور فیروز دونوں حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ آپ کے ذہن میں تھا کہ شاید ہم تینوں ہٹ ہو گئے ہیں۔ آپ کی کال کے بعد میں وہیں اس کوٹھی میں چھپا رہا کیونکہ میں نے ان دونوں کا خیال رکھنے کے لئے اپنے آدمی روانہ کر دیئے تھے۔ راجو واپس آیا تو میں نے اس کو چھاپ لیا۔ اسی کے تشدد کے سامان کو استعمال کر کے ایک نیا طریقہ نکالا راجو سے مجھے ڈائریکٹ گولڈ مین کی ٹِپ ملی۔

اصل گولڈ مین تھا اُس شہر کا ایک مایہ ناز سیاستدان ایوب بختاور۔ آپ کی مدد سے ہم نے ایوب کے گھر کا چیکنگ وارنٹ لیا اور اس کے گھر کامیاب چھاپہ مارا اور ایوب بختاور سمیت ہم نے اس سارے گروپ کو پکڑ لیا ہے۔ ایوب بختاور کے گھر کے ڈبل تہ خانے سے تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب لڑکیاں اور لڑکے برآمد ہوئے ہیں۔'' ساحر نے تفصیل بتائی جس طرح اس نے ظفر کے ساتھ مل کر ایوب بختاور کے گھر چھاپہ مارا تھا۔

اس دوران' اس کیس کا ایک اور اہم کردار' پولیس افسر گلریز سامنے آیا۔ اسے میں نے ٹریپ کیا اور اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جا کر اس سے بہت سے قابلِ قدر معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' ساحر نے بات ختم کی۔

''یہ تم لوگوں کا خیال تھا کہ مجھے بتائے بغیر تم لوگ مشن پورا کر لو گے اگر میں سامنے نہ آتا تو تم اسپتال کے کسی عام وارڈ میں پڑے رہتے جو خطرناک ہوتا۔ ایوب بختاور سے ہمیں اس کا مختلف شہروں میں موجود نیٹ ورک پتہ چل چکا

pakistanipoint.com

ہے اور اب تک ہم چھ سو سے زائد لڑکے اور لڑکیاں بازیاب کرا چکے ہیں۔ایوب کا تیسرا پارٹنر بھی گرفتار ہو چکا ہے۔وہ ایک ڈاکٹر تھا۔دونوں کی جان خلاصی ناممکن ہے۔ تمہارے اس کام کو حکومتی سطح پر بہت پسند کیا گیا ہے۔'' کرنل صاحب نے کہا۔

ان کی بات سن کر سب کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔

کرنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ان کے اٹھتے ہی ساحر بھی کھڑا ہو گیا۔وہ سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''وہ پولیس افسر کہاں ہے؟'' جبران نے مسکراتے ہوئے ساحر سے پوچھا۔

''ہوگا کہیں انجوائے کر رہا۔'' ساحر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا سلوک کیا تم نے اس کے ساتھ؟'' کبیر نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔اس کی بات سن کر باقی دونوں حیرت سے ساحر اور کبیر کی طرف دیکھنے لگے۔

''اس کی دونوں آنکھیں نکال کر۔دونوں ٹانگیں توڑ کر سڑک پر پھینک دیا۔اس کا یہی علاج ہے۔کفارہ ادا کرے اب۔'' ساحر نے سرد لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔پیچھے ان تینوں کے رنگ متغیر ہو گئے۔

''اس حرکت کا کیا مطلب ہوا؟'' جبران نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا۔پاشا کی ذہنی رو بدلی ہوئی ہے۔اس کے پاس ضرور ایسی کچھ معلومات ہیں جو وہ چھپا گیا ہے۔'' کبیر نے کہا تو جبران نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا جبکہ جنید بھی الجھا ہوا تھا۔

''ایسے مت دیکھو۔یہ صرف میرا اندازہ ہے۔'' کبیر نے کہا۔تو جبران نے رخ موڑ لیا۔

کمرے سے نکلتے ہی وہ تیزی سے اسپتال کی عمارت سے نکل کر کرنل وجاہت خان اپنی کار تک پہنچ چکے تھے۔وہ تقریباً دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

''انکل۔آپ نے میرا آئیڈیا شیئر کیا کسی افسر سے؟'' ساحر نے کرنل صاحب سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔کرنل بیگ سے میری بات ہوئی ہے۔مگر ابھی ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔اتنی جلدی تو سب کچھ نہیں ہو سکتا۔مگر مجھے یقین ہے کہ ہم ٹیم بنا ہی لیں گے۔'' انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''امید تو یہی ہے۔'' ساحر نے مسکرا کر کہا۔

میرے خیال سے تمہاری چھٹی بھی ختم ہونے والی ہے؟'' کرنل صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یس انکل۔مگر اتنے دن تو ہیں کہ بندہ بیرونِ ملک تفریح کر آئے۔'' ساحر نے جواب دیا۔

''تینوں جاؤ گے؟'' کرنل صاحب نے چونک کر پوچھا۔ان کے چونکنے میں کچھ عجیب بات تھی۔جیسے وہ ساحر کو کرید رہے ہوں۔

''نہیں۔کبیر خان تو اپنی ڈیوٹی پر ہوں گے۔پہلے ہی کافی چھٹیاں کر چکا ہے۔میں اور جبران جائیں گے۔کچھ دن کی سیر اور پھر واپسی۔'' ساحر نے ہنس کر جواب دیا اور کرنل اسے دعا دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔ساحر سلام کر کے پیچھے ہٹ گیا۔

''چلو ڈرائیور۔'' انہوں نے بارعب انداز میں حکم صادر کیا تو گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھی۔گاڑی آہستہ آہستہ ساحر سے دور ہوتی گئی۔

''ٹیم ابھی کچی ہے۔'' ڈرائیور کی نرم آواز سنائی دی۔مگر اس کی آواز میں عجیب سا رعب اور سرد پن تھا۔اس کے انداز سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کرنل وجاہت خان کا ڈرائیور یا ملازم ہے۔

''پھر......'' کرنل صاحب نے چونک کر پوچھا۔ان کے انداز میں سے رکھ رکھاؤ اور رعب ختم ہو چکا تھا۔

''ویل......میں سنبھال لوں گا۔'' ڈرائیور نے سرد لہجے میں کہا اور گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

ختم شد